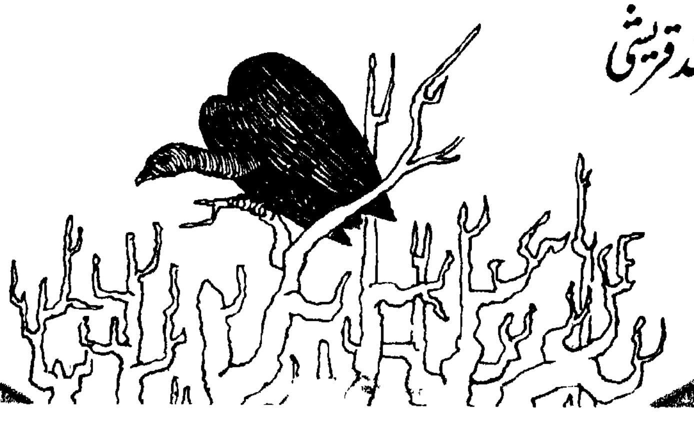
# ادبی دنیا

## اقبال نمبر



پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

مُدیر
**محمد عبداللہ قریشی**



ڈائرکٹر صاحب تعلیمات لاہور ریجن نے بذریعہ سرکلر نمبر ۳۴۵۵۲۵ اور ڈائرکٹر تعلیمات آزاد حکومت جموں و کشمیر مظفرآباد نے بذریعہ
سرکلر نمبر ۱۶/۱۷-۱۳۰۰/۵ مورخہ ۹ مئی ۱۹۶۶ء اپنے اپنے حلقے کے مدارس عالیہ و لائبریریوں کے لیے منظور فرمایا

پوسٹ بکس نمبر ۳۳۱ لاہور — رجسٹرڈ ایل نمبر ۲۴۸۲

## اشاعت خاص

بیادگار ناخدائے اردو مولانا صلاح الدین احمد مرحوم

# ادبی دنیا



| دور ششم | اقبال نمبر | شمارہ ۲۴ |
| --- | --- | --- |

قیمت

فی پرچہ چار روپے

اتحاد پریس مل روڈ لاہور میں باہتمام وحید الدین چھپا اور فصیح الدین احمد پرنٹر و پبلشر نے دفتر ادبی دنیا مال روڈ سے شائع کیا

# ترتیب

# تقریب

۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء کا دن ہمیں اس حادثہ عظیم کی درد آفریں یاد دلاتا ہے جس کے آفتاب کے ساتھ ہی عالم انسانی کا جہاں تاب بھی غروب ہو گیا۔ اقبال ایسے دیدہ ور شاعر، عظیم ترین مفکر اور دانشور فن کار کو اسی تاریخ ہم نے سیکڑوں من مٹی کے نیچے دفن کیا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ اقبال پر اصطلاحی موت طاری ہو چکی ہے کہ قضا و قدر کی گرفت عام سے خدا کے برگزیدہ پیغمبر اور با جبروت شہنشاہ بھی نہ بچ سکے لیکن اس میں بھی جائے کلام نہیں کہ اقبال کی سرمدی تعلیمات کے پیش نظر ان کی حیات جاوداں پر موت کبھی فتح نہ پا سکے گی۔ اقبال ان عناصر مرتبہ کا اصطلاحی نام تھا جو منتشر ہو کر اپنے اپنے مرکز میں جذب ہو گئے لیکن حقیقی اقبال جس کی حیات افروز صدا ہاتف غیب کی ندائے حق سے ہم آہنگ ہو کر ہمیں سنائی دے رہی ہے، مرنے کے لیے پیدا نہیں ہوا تھا۔ وہ آج بھی زندہ ہے اور آج کی طرح ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اس کی زندگی ثوابت و سیار کی طرح ابد قرار ہے۔

اقبال کی قدر و منزلت ان کی زندگی میں بھی کافی ہوئی لیکن ان کی عظمت و رفعت اور جلالت قدر کا حقیقی دور اب شروع ہوا ہے۔ اب دنیا اقبال کو ان کے اصل روپ میں دیکھ رہی ہے اور ان کے حقیقی کام کے تمام جوہر آئینہ ہو رہے ہیں۔ اقبال ہی ایک ایسی شخصیت ہے جس کی آواز کانوں سے دل تک پہنچی اور خون کے اندر جذب ہو کر خیالات و افکار اور مقاصد و عزائم کی دنیاؤں میں نئی بہاروں کا سامان بنی۔ ان کی پکار جس شخص نے بھی سنی وہ بے تاب و مضطرب ہوا اور اس کے دل میں یہ تڑپ ضرور پیدا ہوئی کہ یہ پکار پھر اس تک پہنچے اور یہ صدا پھر اس کے کانوں سے ٹکرائے۔ اس دور میں کون ایسا ہے جس کو محبوبیت کا یہ بلند مقام نصیب ہوا ہو؟

اقبال کی شاعری عظیم بھی ہے اور متحرک بھی۔ بڑھتی، پھیلتی، پھولتی اور پھلتی ہوئی جیسے کوئی شاداب نخل اپنی ابتدائی حالت سے بڑھ کر ایک گل پوش اور ثمر دار درخت بن جاتا ہے۔ یہ زندگی کی تمثیل ہے جاوداں، پیہم رواں، ہر دم جواں۔ لہٰذا انسانی بصیرت جیسے جیسے ارتقا کی سیڑھیوں پر چڑھتی جائے گی۔ اقبال کی شاعری سے زندگی کا درس لیتی رہے گی۔

محمد عبد اللہ قریشی

ایڈیٹر ادبی دنیا۔ لاہور

حضرتِ اقبال میں جو خوبیاں پیدا ہوئیں
قوم کی نظریں جو ان کے طرز کی شیدا ہوئیں
اس کی شاہد ہیں کہ ان کے والدین ابرار تھے
باخدا تھے ، اہلِ دل تھے صاحبِ اسرار تھے

اکبر آلہ آبادی

تجھ پہ اے لاہور! نازل ہوں خدا کی رحمتیں
اے کہ تو اقبال کی دولت سے مالا مال ہے
ہم نے مانا تو نہیں مسحور تہذیب فرنگ
تجھ میں سب کچھ ہے اگر اسلام اور اقبال ہے

علامہ عبداللہ عمادی

محمد عبداللہ قریشی

# مقامِ شاعر

ایک روز خدا نے عرش کی بلندی سے ندا دی :

"اے میرے بندو! میں نے تمہارے واسطے دنیا میں کیا کیا کچھ پیدا کیا۔ تمہارے رہنے سہنے کی خاطر زمین بنائی۔ اس کو سمندروں، پہاڑوں، میدانوں، جنگلوں، صحراؤں، وادیوں، گلزاروں، پھولوں پھلوں، ندی نالوں، جھیلوں، مچھلیوں، پرندوں، جانوروں، حیوانوں سے آراستہ کیا اور قیامت کے دن تک کے لیے تمہیں اس آب و خاک کا وارث کیا۔ اٹھو اور ان نعمتوں کو آپس میں بھائیوں بھائیوں کی طرح بانٹ لو"!!

اس ندا کو سنتے ہی تمام چھوٹے بڑے، جو ہاتھ پاؤں رکھتے تھے، دوڑے اور ہر ایک نے اپنی اپنی پسند اور اپنے اپنے مذاق کے مطابق زمین کا حصّہ منتخب کر لیا۔

دہقان نے کشت زار کے ٹکڑے پر ہاتھ مارا اور آگے کا رُخ کیا۔

امیرزادے نے جنگل کو شکار کے لیے مناسب خیال کیا اور اسے اپنے لیے چن لیا۔

سوداگروں نے سونے چاندی کے انباروں پر نظر جمائی اور بقدرِ ظرف جس قدر دولت سمیٹ سکتے تھے سمیٹ لی۔

زاہد گوشہ نشین نے شرابِ طہور کے مٹکے کندھوں پر اٹھائے اور مستی کا راگ الاپنا شروع کر دیا۔

ماہی گیروں نے ندی نالوں کو غنیمت جانا اور مچھلیاں پکڑنے کا حق لے لیا۔

بادشاہوں نے سڑکوں اور پلوں کو قبضے میں کیا اور اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا :۔

"اے لوگو! ٹھہرو! میں تمہارا حاکم ہوں۔ تمہاری ہر چیز کا مالک و مختار ہوں۔ تم نے جو کچھ لیا ہے وہ سب میرا ہے، میرے سپرد کرو، ورنہ مجھے حق پہنچتا ہے کہ میں طرح طرح کے محصول اور ٹیکس لگا کر تمہاری ہر چیز زبردستی چھین لوں"۔

جب زمین کے اس طرح حصّے بخرے ہو گئے اور ہر چیز کسی نہ کسی کے پاس پہنچ گئی تو شاعرِ شیریں سخن دامن جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے حصّے میں کچھ نہ آیا تھا۔ کوئی چیز بھی تو اس کے پلے نہ پڑی تھی۔ ندا اور زمین سب دوسرے لے جا چکے تھے۔ اس کے لئے اب کوئی شے باقی نہ رہی تھی۔ اس نے حسرت سے آسمان کی طرف منہ اٹھایا اور نہایت دردبھرے لہجے میں فریاد کی :۔

اے میرے خدا! میں تیرا فرماں بردار بندہ ہوں، کیا تو مجھے اس طرح تنہا اور بے خانماں ہی رکھے گا ؎

بے زر و بے پر و بے بال و پریشاں ہوں میں  بے گل و بے ثمر و بے سر و ساماں ہوں میں

یہ کہہ کر وہ عرش کے پایے پہ گر پڑا اور زار زار رونے لگا۔

غیب سے ندا آئی :۔

"اے شاعر! تو تصورات کی دُنیا میں گم رہتا ہے، تو تخیلات کے سمندر میں غوطے لگاتا ہے، تو جذبات کے طوفان میں بہہ جاتا ہے، تو بلند و پست عالم کی سیر کرتا ہے اور پھر کہتا ہے ع

میرے جنوں کو تنگ ہے پہنائے کائنات

تو خاک نشین ہو کر ساکنانِ فلک کی ہمسری کرتا ہے، تو اسرارِ کائنات کے پردے چاک کرتا اور فلسفۂ حیات کی گتھیاں سلجھاتا ہے، تو حُسن و عشق کے رموز آشکارا کرتا، آنکھوں سے دل کا حال معلوم کر لیتا اور جبین دیکھ کر مزاج کی کیفیت سے واقف ہو جاتا ہے، تو حدیثِ دل کی تفسیریں لکھتا اور محبت کی لذیذ حکایتیں مزے لے لے کر بیان کرتا ہے۔ پھر بھی کہتا ہے ع

کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لیے

تو ہجر و وصال کی رنگینیوں میں مست رہتا ہے، تو سارے جہان کا درد اپنے جگر میں لیے لیے پھرتا ہے، تو زمانے بھر کو خودی اور خودداری کا درس دیتا اور تلقین کرتا ہے ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

تو جو بات کرتا ہے انوکھی اور نرالی کرتا ہے، تو دن کو رات اور رات کو دن بتاتا ہے، تو رائی کا پہاڑ بناتا اور رسّی کو سانپ کر دکھاتا ہے، تو آسمان کے تارے توڑ کر لاتا ہے اور باتوں باتوں میں فرشتوں کو لگا لیتا ہے۔ تیرا مجھ سے شکوہ فضول ہے۔ جب زمین بٹ رہی تھی، دولت لٹ رہی تھی، دُنیا کی نعمتیں تقسیم ہو رہی تھیں، تو اس وقت کہاں تھا ؎

نہ تھا اگر تو شریکِ محفل قصور تیرا ہے یا کہ میرا
مرا طریقہ نہیں کہ رکھ لوں کسی کی خاطر مئے شبانہ

اگر تو کوشش کرتا اور ہمت سے کام لیتا، تو اس حال کو کیوں پہنچتا؟ اس طرح مفلس اور تہی دامن کیوں رہتا؟ یہ تیری اپنی غفلت اور اپنا قصور ہے۔

شاعر نے عرض کیا:۔

"پروردگارِ عالم! میں تو تیرے حضور حاضر تھا، تیرے سامنے کھڑا تھا، میری آنکھیں تیری طرف لگی ہوئی تھیں، میرا سینہ تیرے نور سے معمور تھا، میرے کان تیرے فردوسی نغموں میں کھوئے تھے ع

ہر نغمہ تیرا حسنِ تمنائے گوش تھا

تیرے وصل کی شراب مجھے بے خود و سرمست کیے ہوئے تھی، تیرے جلووں نے مجھے گھیر لیا تھا، مجھے کسی بات کا ہوش نہ رہا تھا، اسی وجہ سے زمین کی نعمتیں میرے ہاتھ سے نکل گئیں اور میں ان سے محروم رہ گیا۔ اب میری التجا ہے، میرا عذر قبول کر، میرے آنسوؤں کی لاج رکھ، میرے گناہوں کو بخش اور میرا حصّہ مجھے عطا فرما ؎

دینے والے مجھے دنیا ہی کو اتنا دیدے
کہ مجھے شکوۂ کوتاہیٔ داماں ہو جائے

خدا نے جواب دیا:۔

"اب کیا ہو سکتا ہے؟ زمین دوسرے لے جا چکے، چمن، جنگل، شکار گاہ اور بازار اوروں کے تصرف میں ہیں، میں ان کے معاملات میں کوئی دخل نہیں دینا چاہتا، تجھے خیالات کی دُنیا بسانی اور اقلیمِ سخن کی تاجداری پر قناعت کرنا ہوگی۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ تو آ اور میرے ساتھ زندگی بسر کر۔ میرا دروازہ تیرے لئے ہر وقت کھلا رہے گا۔ تو جب چاہے اور جتنے عرصہ کیلئے چاہے، آ سکتا ہے، تیرے لیے کوئی روک ٹوک نہ ہوگی ؎

دگر از غمِ دنیا دل نگشت ملول
نہ دمی آکہ ترا یارِ وفادار منم

شاعر نے اطمینان کا سانس لیا اور کہا ؎

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر
اُٹھتے نہیں ہیں ہاتھ مرے اس دعا کے بعد

# میلادالنبی

(یہ تقریر علامہ اقبال نے لاہور میں میلادالنبیؐ کے جلسے کی صدارت کرتے ہوئے فرمائی)

زمانہ ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ انسانوں کی طبائع، ان کے افکار اور ان کے نقطہ ہائے نگاہ بھی زمانے کے ساتھ ہی بدلتے رہتے ہیں۔ لہٰذا تیوہار منانے کے طریقے اور مراسم بھی ہمیشہ متغیر ہوتے رہتے ہیں اور ان کے استفادے کے طریق بھی بدلتے رہتے ہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم بھی اپنے مقدس مراسم پر غور کریں اور جو تبدیلیاں افکار کے تغیرات سے ہونی لازم ہیں ان کو مدِّنظر رکھیں۔

منجملہ ان مقدس ایام کے جو مسلمانوں کے لئے مخصوص کئے گئے ہیں ایک میلادالنبیؐ کا مبارک دن بھی ہے۔ میرے نزدیک انسانوں کی دماغی اور قلبی تربیت کے لئے نہایت ضروری ہے کہ ان کے عقیدے کی رو سے زندگی کا جو نمونہ بہترین ہو وہ ہر وقت ان کے سامنے رہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے لئے اسی وجہ سے ضروری ہے کہ وہ اسوۂ رسولؐ کو مدِّنظر رکھیں تاکہ جذبۂ تقلید اور جذبۂ عمل قائم رہے۔ ان جذبات کو قائم رکھنے کے تین طریقے ہیں۔ پہلا طریقہ تو درود و صلوٰۃ ہے جو مسلمانوں کی زندگی کا جزو لاینفک ہو چکا ہے۔ وہ ہر وقت درود پڑھنے کے موقعے نکالتے رہتے ہیں۔ عرب کے متعلق میں نے سنا ہے کہ اگر کہیں بازار میں دو آدمی لڑ پڑتے ہیں اور تیسرا باآواز بلند اللھم صل علیٰ سیدنا محمدؐ و بارک وسلم پڑھ دیتا ہے۔ تو لڑائی فوراً رک جاتی ہے اور متخاصمین ایک دوسرے پر ہاتھ اٹھانے سے فوراً باز آجاتے ہیں۔ یہ درود کا اثر ہے اور لازم ہے کہ جس پر درود پڑھا جائے اس کی یاد قلوب کے اندر اپنا اثر پیدا کرے۔

پہلا طریق انفرادی۔ دوسرا اجتماعی ہے۔ یعنی مسلمان کثیر تعداد میں جمع ہوں اور ایک شخص جو حضور آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح حیات سے پوری طرح باخبر ہو، آپ کے سوانح زندگی بیان کرے تاکہ ان کی تقلید کا ذوق و شوق مسلمانوں کے قلوب میں پیدا ہو۔ اسی طریق پر عمل پیرا ہونے کے لئے ہم سب آج یہاں جمع ہوئے ہیں۔

تیسرا طریقہ اگرچہ مشکل ہے لیکن بہرحال اس کا بیان کرنا نہایت ضروری ہے۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ یادِ رسولؐ اس کثرت اور ایسے انداز میں کی جائے کہ انسان کا قلب نبوت کے مختلف پہلوؤں کا خود مظہر ہو جائے یعنی آج سے تیرہ سو سال پہلے جو کیفیت حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے وجودِ مقدس سے ہویدا تھی، وہ آج ہمارے قلوب کے اندر پیدا ہو جائے۔ حضرت مولانا رومؒ فرماتے ہیں۔

آدمی دید است باقی پوست است ۔۔۔ دید آن است آنکہ دید دوست است

یہ جوہرِ انسانی کا کمال ہے کہ اسے دوست کے سوا اور کسی چیز کی دید سے مطلب نہ رہے۔ یہ طریقہ بہت
مشکل ہے۔ کتابیں پڑھنے یا میری تقریر سننے سے نہیں آئے گا۔ اس کے لئے کچھ مدت نیکوں اور بزرگوں کی صحبت میں
بیٹھ کر روحانی انوار حاصل کرنا ضروری ہے۔ اگر یہ میسر نہ ہو تو ہمارے لئے یہی طریقہ غنیمت ہے جس پہ عمل پیرا ہیں۔
اب سوال یہ ہے کہ اس طریق پہ عمل کرنے کے لئے کیا کیا جائے۔ پچاس سال سے ایک شور برپا ہے کہ مسلمانوں کو ١
تعلیم حاصل کرنی چاہیئے لیکن جہاں تک میں نے غور کیا ہے تعلیم سے زیادہ اس قوم کی تربیت ضروری ہے۔ اور ملی اعتبار
سے یہ تربیت علماء کے ہاتھ میں ہے۔ اسلام ایک خالص تعلیمی تحریک ہے۔ صدر اسلام میں اسکول نہ تھے، کالج نہ تھے
یونیورسٹیاں نہ تھیں۔ لیکن تعلیم و تربیت اس کی ہر چیز میں ہے۔ خطبۂ جمعہ، خطبۂ عید، حج، وعظ غرض تعلیم و تربیت عوام
کے بے شمار مواقع اسلام نے بہم پہنچائے ہیں لیکن افسوس کہ علماء کی تعلیم کا کوئی صحیح نظام قائم نہ تھا۔ اور اگر کوئی رہا بھی تو
اس کا طریق عمل ایسا رہا کہ دین کی حقیقی روح نکل گئی۔ جھگڑے پیدا ہوگئے اور علماء کے درمیان جنہیں پیغمبر علیہ السلام
کی جانشینی کا فرض ادا کرنا تھا، سر پھٹول ہونے لگی۔ مصر، عرب، ایران افغانستان ابھی تہذیب و تمدن میں ہم سے پیچھے
ہیں۔ لیکن وہاں علما ایک دوسرے کا سر نہیں پھوڑتے۔ وجہ یہ ہے کہ اسلامی ممالک نے اخلاق کے اس اعلیٰ معیار کو پالیا
ہے جس کی تکمیل کے لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام مبعوث ہوئے تھے اور ہم ابھی اس معیار سے دور ہیں۔
دنیا میں نبوت کا سب سے بڑا کام تکمیلِ اخلاق ہے چنانچہ حضورؐ نے فرمایا بعثت لاتمم مکارم الاخلاق ٢
یعنی میں نہایت اعلیٰ اخلاق کے اتمام کے لئے بھیجا گیا ہوں، اس لئے علماء کا فرض ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے اخلاق ہمارے سامنے پیش کیا کریں تاکہ ہماری زندگی حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کی تقلید سے خوشگوار ہو جائے اور اتباعِ سنت
زندگی کی چھوٹی چھوٹی چیزوں تک جاری و ساری ہو جائے۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے خربوزہ لایا گیا۔
تو آپ نے کھانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ مجھے معلوم نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کس طرح کھایا، مبادا میں ترکِ سنت
کا مرتکب ہو جاؤں ؎

کامل بسطام در تقلید فرد  اجتناب از خوردن خربوزہ کرد

افسوس کہ ہم میں بعض چھوٹی چھوٹی باتیں بھی نہیں ہیں جن سے ہماری زندگی خوشگوار ہو اور ہم اخلاق کی فضا میں زندگی
بسر کر سکے ایک دوسرے کے لئے باعث رحمت ہو جائیں۔ اگلے زمانے کے مسلمانوں میں اتباعِ سنت سے ایک اخلاقی ذوق اور
ملکہ پیدا ہو جاتا تھا۔ اور وہ ہر چیز کے متعلق خود ہی اندازہ کر لیا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رویہ اس چیز کے متعلق ٣
کیا ہوگا۔ حضرت مولینا روم بازار میں جا رہے تھے۔ آپ کو بچوں سے بہت محبت تھی۔ کچھ بچے کھیل رہے تھے۔ ان سب نے
مولانا کو سلام کیا اور مولینا ایک ایک کا سلام الگ الگ قبول کرنے کے لئے دیر تک کھڑے رہے۔ ایک بچہ کہیں دور کھیل
رہا تھا۔ اس نے وہیں سے پکار کر کہا کہ حضرت ابھی جائیگا نہیں۔ میرا سلام لیتے جائیے۔ تو مولینا نے بچے کی خاطر دیر تک
توقف فرمایا اور اس کا سلام لے کر گئے۔ کسی نے پوچھا۔ حضرت آپ نے بچے کے لیے اس قدر توقف کیا۔ آپ نے فرمایا
کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قسم کا واقعہ پیش آتا تو حضورؐ بھی یونہی کرتے۔

گویا ان بزرگوں میں تقلیدِ رسولؐ اور اتباعِ سنّت سے ایک اخلاقی ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ اس طرح کے بےشمار واقعات ہیں۔ علماء کو چاہیئے کہ ان کو ہمارے سامنے پیش کریں۔ قرآن و حدیث کے غوامض تبانا بھی ضروری ہیں۔ لیکن عوام کے دماغ ابھی ان مطالب عالیہ کے متحمل نہیں۔ انہیں فی الحال اخلاق نبویؐ کی تعلیم دینی چاہیئے۔

(صوفی۔ اکتوبر ۱۹۲۶ء)

# اقبال کا ایک نشریہ

آل انڈیا ریڈیو (لاہور) کی استدعا پر یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو سالِ نو کے موقع پر اقبالؒ نے جو پیغام دیا تھا اس کا ایک ایک لفظ انسانیت دوستی کے جذبات سے بھرا ہوا ہے۔ اس پیغام سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قوّت کے استعمال کو صرف اسی وقت جائز سمجھتے تھے جبکہ یہ اخلاقی مقاصد کے لیے ہو نہ کہ جوع الارض کے لیے۔ اس پیغام کے الفاظ یہ ہیں۔

دورِ حاضر کو علومِ عقلیہ اور سائنس کی عدیم المثال ترقی پر بڑا فخر ہے اور یہ فخر و ناز یقیناً حق بجانب ہے۔ آج زمان و مکان کی پہنائیاں سمٹ رہی ہیں اور انسان نے فطرت کے اسرار کی نقاب کشائی اور تسخیر میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ہے لیکن اس تمام ترقی کے باوجود اس زمانے میں ملوکیت کے جبر و استبداد نے جمہوریت، قومیت، اشتراکیت، فسطائیت اور نہ جانے کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔ ان نقابوں کی آڑ میں دنیا بھر میں قدرِ حرّیت اور شرفِ انسانیّت کی ایسی مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال نہیں پیش کر سکتا۔ جن نام نہاد مدبّروں کو انسانوں کی قیادت اور حکومت سپرد کی گئی ہے وہ خونریزی، سفاکی اور زیر دست آزاری کے دیوتا ثابت ہوئے۔ جن حاکموں کا یہ فرض تھا کہ اخلاقِ انسانی کے نوامیسِ عالیہ کی حفاظت کریں۔ انسان کو انسان پر ظلم کرنے سے روکیں اور انسانیّت کی ذہنی اور عملی سطح کو بلند کریں۔ انہوں نے ملوکیت اور استعمار کے جوش میں لاکھوں کروڑوں مظلوم بندگانِ خدا کو ہلاک و پامال کر ڈالا۔ صرف اس واسطے کہ اِن کے اپنے مخصوص گروہ کی ہوا و ہوس کی تسکین کا سامان بہم پہنچایا جائے۔

انہوں نے کمزور قوموں پر تسلط حاصل کرنے کے بعد ان کے اخلاق، ان کے مذہب، ان کی معاشرتی روایات، ان کے ادب اور ان کے اموال پر دستِ تطاول دراز کیا۔ پھر ان میں تفرقہ ڈال کر ان بدبختوں کو خونریزی اور برادرکشی میں مصروف کر دیا تاکہ وہ غلامی کی افیون سے مدہوش و غافل رہیں اور استعمار کی جونک چپ چاپ ان کا لہو پیتی رہے۔ جو سال گذر چکا ہے اس کو دیکھو اور نو روز کی خوشیوں کے درمیان بھی دنیا کے واقعات پر نظر ڈالو تو معلوم ہو گا کہ اس دنیا کے ہر گوشے میں چاہے وہ فلسطین ہو یا حبش، ہسپانیہ ہو یا چین، ایک قیامت بپا ہے۔ لاکھوں انسان بے دردانہ موت کے گھاٹ اتارے جا رہے ہیں۔ سائنس کے تباہ کن آلات سے تمدنِ انسانی کے عظیم الشان آثار کو معدوم کیا جا رہا ہے اور جو حکومتیں فی الحال

آگ اور خون کے اس تماشے میں عملاً شریک نہیں ہیں۔ وہ اقتصادی میدان میں کمزوروں کے خون کے آخری قطرے تک چوس رہی ہیں۔ تمام دنیا کے ارباب حکم دم بخود سوچ رہے ہیں کہ کیا تہذیب و تمدن کے اس عروج اور انسانی ترقی کے اس کمال کا انجام یہی ہونا تھا کہ انسان ایک دوسرے کی جان و مال کے لاگو ہو کر کرۂ ارض پر زندگی کا قیام ناممکن بنا دیں۔ در اصل انسان کی بقا کا راز انسانیت کے احترام میں ہے، جب تک تمام دنیا کی تعلیمی قوتیں اپنی توجہ کو محض احترام انسانیت کے درس پر مرکوز نہ کر دیں، یہ دنیا بدستور درندوں کی بستی بنی رہے گی۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ ہسپانیہ کے باشندے ایک نسل، ایک زبان، ایک مذہب اور قوم رکھنے کے باوجود محض اقتصادی مسلکوں کے اختلاف پر ایک دوسرے کا گلا گھونٹ رہے ہیں۔ اور اپنے ہاتھوں اپنے تمدن کا نام و نشان مٹا رہے ہیں۔ اس ایک واقعے سے صاف ظاہر ہے کہ قومی وحدت بھی ہرگز قائم و دائم نہیں۔ وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے۔ اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے جو نسل و زبان و رنگ سے بالاتر ہے۔ جب تک اس نام نہاد جمہوریت اس ناپاک قوم پرستی اور اس ذلیل ملوکیت کی لعنتوں کو پاش پاش نہ کر دیا جائے گا۔ جب تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے الخلق عیال اللہ کے اصول کا قائل نہ ہو جائے گا جب تک جغرافیائی وطن پرستی اور رنگ و نسل کے اعتبارات کو نہ مٹایا جائے گا اس وقت تک انسان اس دنیا میں فلاح و سعادت کی زندگی بسر نہ کر سکیں گے اور اخوت، حریت اور مساوات کے شاندار الفاظ شرمندہ معنی نہ ہوں گے۔"

# اقوالِ اقبالؒ

۱۔ اغراض کا شائبہ خلوص کو مسموم کر دیتا ہے آئینۂ دل گرد غرض سے پاک رکھنا چاہیئے۔

۲۔ پیری مریدی بھی ایک فن ہے بعض پیروں کی بے اعتنائی بالعموم مصنوعی ہوتی ہے۔ اور اس میں سینکڑوں اغراض پوشیدہ ہوتی ہیں۔

۳۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کو خرقہ پوش امیروں کی ہم نشینی میسر ہے۔

۴۔ انسانی قلب کے لئے اس سے بڑھ کر زیبائش اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کا خلوص پردۂ اغراض و مقاصد ہو۔

۵۔ امارت، عزت، آبرو، جاہ و حشم عام ہے۔ مگر دلِ ایک ایسی چیز ہے کہ ہر امیر کے پہلو میں نہیں ہوتا۔

۶۔ تصوف کے بعض مسائل سے مجھے اختلاف ہے اور وہ اختلاف ایک عرصہ سے صوفیائے اسلام میں چلا آتا ہے۔

۷۔ امور کے فیصلے آسمان پر ہوتے ہیں زمین پر محض ان کا اشتہار دیا جاتا ہے

۸۔ بطن گیتی میں نہ معلوم کیا کیا حادثات پوشیدہ ہیں۔

۹۔ جو مسائل انسان حل نہ کر سکے قدرت خود انہیں حل کرتی ہے۔

۱۰۔ مکتوب نصف ملاقات ہے تو فوٹو بھی نصف زیارت کہلانے کا حق رکھتا ہے۔

۱۱۔ دنیوی نقطۂ نگاہ سے خطاب بھی ایک عزت ہے مگر ہر عزت فقط اللہ کے لئے ہے۔

۱۲۔ پنجاب میں ہندو مسلمانوں کی رقابت بلکہ عداوت بہت ترقی پر ہے اگر یہی حالت رہی تو آئندہ تیس سالوں میں دونوں قوموں کے لئے زندگی مشکل ہو جائے گی (از خط ۱۹ مارچ ۲۲ء بنام مہاراجہ سرکشن پرشاد)

# مغربی اور مشرقی خواتین کی حیثیت

۱۹۳۱ء میں جب علامہ اقبال راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے انگلستان گئے ہوئے تھے
اخبار لیورپول پوسٹ میں ان کی طرف سے مندرجہ ذیل مضمون شائع ہوا تھا۔

میں اس مضمون پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں کہ مشرق میں عورت کی پوزیشن کیا ہے اور خواتین مغرب کے مقابلے میں ان کی کیا حیثیت ہے؟ لندن کے گلی کوچوں میں مجھے بے شمار ایسی باتیں نظر آ رہی ہیں، جو اہل لندن کی نظروں سے اوجھل ہیں۔ حقائق شناس نگاہیں ان امور و حقائق کو فوراً پہچان لیتی ہیں۔ جن لوگوں کو ایک طویل عرصے کی غیر حاضری کے بعد یہاں آنے کا اتفاق ہوا ہے ان کے نزدیک ان کی حیثیت مقابلتاً تعجب انگیز اور حیرت افزا ہے۔

میں اس بات پر حیران ہوں کہ صنف نازک کو مغرب میں جو خاص امتیاز حاصل تھا وہ بتدریج کم ہو رہا ہے۔ اب مرد اپنی نشستوں کو مستورات کی خاطر خالی نہیں کرتے اور اگر کبھی کرتے بھی ہیں تو بہت کم۔ موٹر کاروں سے اُترتے وقت انہیں اس بات کا خیال نہیں آتا کہ مستورات پہلے اُتریں اور مرد بعد میں۔ مردوں کا یہ طرز عمل میرے نزدیک قابل مذمت نہیں۔ اس لئے کہ یہ عورتوں کا خود پیدا کردہ ہے۔ انہیں کامل آزادی اور مردوں کے ساتھ مساوات کا جنون لاحق ہو گیا تھا۔ اس لیے جو تبدیلی بھی رونما ہوئی ہے وہ حالات گرد و پیش کا لازمی نتیجہ ہے، جس سے مفر کی کوئی صورت قطعاً نظر نہیں آتی۔

اس مقام پر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مشرقی خواتین بالخصوص اسلامی صنف نازک کے اوضاع و اطوار اور ان کے ساتھ مردوں کے سلوک کی بعض غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جائے جس پر وہ ایک زمانے میں بعد جاہ و جلال متمکن تھیں لیکن بمقابلہ اس کے مشرقی یا اسلامی خواتین کو سابقہ اعزاز و احترام بدستور حاصل ہے۔

یورپ آج بھی اس وہم میں مبتلا ہے کہ ترکی خواتین کو ترکی معاشرت میں کوئی امتیاز حاصل نہیں۔ دراصل مصیبت یہ ہے کہ وہ ہماری طرز بود و ماند سے ناآشنا ہیں اور انہوں نے پردہ کی حقیقت کو آج تک نہیں سمجھا۔ پردہ کا سبب یہ نہیں کہ مردوں کے اخلاق خراب ہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ عورت فاطر السماوات والارض کی مقدس ترین مخلوق ہے اور اس کا حقیقی تقدس اس امر کا متقاضی ہے کہ اسے اجنبی نگاہوں سے بہر نوع محفوظ رکھا جائے۔ عربی زبان میں لفظ "حرم" کے معنی ہیں پاک اور مقدس سرزمین کہ جس کو اغیار و اجانب کی مداخلت سے ملوث نہیں کیا جا سکتا۔

پردہ کے اور بھی اسباب موجود ہیں، لیکن ان کا تعلق علم الحیات سے ہے اس لئے اس موقع پر مفصل بحث کی گنجائش نہیں۔ میں صرف یہ بتاؤں گا کہ اس رواج کی حقیقی بنیاد و اساس کیا ہے۔ دنیا میں عورت ایک بہت ہی عظیم ذریعۂ تخلیق ہے اور یہ حقیقت ہے کہ

دُنیا کی تخلیقی قوتیں مستور و محجوب ہیں۔ مشرقی عورت کا اعزاز و احترام ہی پردے میں مضمر ہے۔ صدیوں سے اس دستور میں کوئی تغیر رونما نہیں ہوا۔ بلکہ عورتوں کو آزادانہ اختلاط سے ہمیشہ منع کیا جاتا رہا ہے۔ قرآن پاک میں عورتوں کی علیحدگی کے لئے متعدد اصول بیان کئے گئے ہیں پردہ بھی ان میں سے ایک ہے۔ ایک پابندی یہ بھی ہے کہ جب کبھی مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے کے روبرو ہونے کا اتفاق ہو تو ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے سے قطعی احتراز کریں۔ اگر تمام دنیا اس پر کاربند ہو جائے تو پھر مروجہ حجاب کی ضرورت نہیں۔ ہندوستان اور بعض اسلامی ممالک کی بے شمار عورتیں برقع استعمال نہیں کرتیں۔ دراصل برقع دل کی ایک خاص کیفیت کا نام ہے اور اس کیفیت قلب کو تقویت دینے کے لیے بعض عملی مثالوں کی ضرورت ہے جو ہر ملک اور قوم کے انفرادی حالات پر موقوف ہیں۔

حرم کے خلاف بھی بے شمار اعتراض کئے جاتے ہیں۔ یہ واضح کر دینا نہایت ضروری ہے کہ حرم صرف ملوک و سلاطین کے لئے مخصوص ہے۔ جب میں عورتوں کا ذکر کرتا ہوں تو آپ لوگوں کو تعدد ازدواج کا خیال ضرور آتا ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام نے تعدد ازدواج کو جائز قرار دیا ہے یہ حکم کھُلا زناکاری کے انسداد کا ایک موثر علاج ہے۔ وحدت ازدواج ہمارا اور آپ کا مطمح نظر ہونا چاہیئے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ اس طرح عورتوں کی اکثریت کا کوئی علاج نہیں ہو سکتا۔

قرونِ وسطیٰ میں یورپ نے وافر عورتوں کو جذب کرنے کی بعض خاص خانقاہیں اور عبادت گاہیں کھول دی تھیں لیکن یورپ میں آج اس عمل کا اعادہ بھی ناممکن ہو گیا ہے۔ نام نہاد صنعتی انقلاب نے مردوں اور عورتوں میں تعدد ازدواج کی خلاف ورزی کے جذبات پیدا کر دیئے ہیں لیکن مجھے اس بات کا اندیشہ ہے کہ معاشرتی مصائب بدستور موجود ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ صرف تعدد ازدواج میں ہی جملہ امراضِ عالم کا مداوا ہے بلکہ میں اس خیال سے لرزہ براندام ہو جاتا ہوں کہ عورتیں اپنے قوت لاموت کا خود بند و بست کریں اس طرزِ عمل سے نسائیت کا جوہر تباہ و برباد ہو جائے گا۔

بہر حال اسلام میں تعدد ازدواج کا اصول کوئی استمراری اور دائمی اصول نہیں۔ فقہ اسلام کے بموجب حکومتِ وقت ہی اس قانونی پابندی کو منسوخ کر سکتی ہے جس سے معاشرتی خرابیاں پیدا ہونے کا احتمال ہو۔ فقہ اسلام کی رو سے طلاق کے بعد بھی عورت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے حقوق کی نگہداشت اور دیکھ بھال کرے وہ اپنے نام پر تجارت، اجارہ اور قانونی چارہ جوئی کا ہر کام کر سکتی ہے۔

ابھی فقہائے اسلام کا یہ بھی فیصلہ ہے کہ اسے بحیثیت خلیفۂ اسلام بھی منتخب کیا جا سکتا ہے مقررہ جہیز کے علاوہ خاوند پر نفقے کا مہیا کرنا بھی فرض ہے اور عورت اس حق کے حصول کی خاطر خاوند کی تمام جائیداد پر قابض ہو سکتی ہے۔

اسلام میں طلاق بھی خالی از دلچسپی نہیں۔ مسلمان عورتوں کو طلاق کا حق بھی بعینہٖ اسی طرح حاصل ہے جس طرح خاوند کو ہے۔ اسلامی قانون کے مطابق اس حق کو حاصل کرنے کے لئے عورت بوقتِ نکاح اپنے باپ، بھائی یا کسی غیر شخص کو نامزد کر سکتی ہے۔ مذہبی اصطلاح میں اس کا نام تفویض ہے یعنی انتقال اختیارات۔ آخر اس طرزِ حفاظت میں اس پیچیدگی کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ میں اس کی توجیہہ کو فقہائے یورپ کی فہم و فراست کے لیئے چھوڑتا ہوں۔

# ہسپانیہ میں اقبالؒ کے مشاہدات

دوسری گول میز کانفرنس کے بعد فروری ۱۹۳۳ء میں جب حضرت علامہ اقبال یورپ سے واپس تشریف لائے تو بمبی کے اخبار "خلافت" کے نامہ نگار نے اسپین کے متعلق چند سوالات کئے۔ ان کے جواب میں صاحب موصوف نے ایک مختصر سی تقریر فرمائی جس کا خلاصہ یہ ہے:-

مجھے لندن میں اسپین جاکر لکچر دینے کی دعوت ملی تھی۔ اسلام کے اس مرکز کو دیکھنے کا مجھے پہلے ہی سے شوق تھا اس لئے میں نے دعوت قبول کرلی۔ مجھے وہاں پہنچنے سے پہلے تقریر کے موضوع کا کوئی علم نہ تھا۔ البتہ خواہش یہ تھی کہ ایسا مضمون ملے جس پر تقریر کرتے ہوئے میں اسلامی ثقافت و تمدن اور اسلامی فلسفہ پر کچھ کہہ سکوں۔ وہاں پہنچ پر پروفیسر آسن کو میں نے انتخاب مضمون کا اختیار دے دیا۔ اتفاق سے اُنہوں نے وہی مضمون تجویز کیا جس کا میں خود خواہشمند تھا۔ یعنی "اسپین اور فلسفۂ اسلام" میرا لکچر میڈرڈ کی جدید یونیورسٹی میں ایک گھنٹہ تک جاری رہا جس میں میں نے اسپین کے مسلمانوں کا تمدن، فلسفہ اور ان کی تہذیب و روحانیت کے مختلف پہلوؤں کی تشریح و تفسیر بیان کرتے ہوئے حاضرین سے اپیل کی کہ سنی سنائی باتوں پر یقین نہ کریں۔ نہ عیسائیوں کے غلط پروپاگنڈے سے متاثر ہوں بلکہ عربوں کی تاریخ کا مطالعہ کریں۔

میں نے موقع کو غنیمت سمجھ کر ملک کے متعدد مشہور تاریخی مقامات و آثار کا بہ نظر غائر معائنہ کیا۔ میں اپنے تاثرات کا اظہار الفاظ میں نہیں کرسکتا، بس یوں سمجھئے کہ جس طرح یہودیوں کے لئے "ارض موعودہ" فلسطین ہے، اسی طرح عربوں کے لیے غالباً اسپین کی سرزمین موعودہ تھی۔ اس قدر خوبصورت، اس درجہ پُرفضا اور ایسا آرام دہ ملک ——!

پروفیسر آسن عربی زبان کے پروفیسر اور بہت ہی خوش خلق و ملنسار آدمی ہیں۔ ان کا ایک شاگرد قرطبہ کی قدیم یونیورسٹی کا پرنسپل ہے۔ اس یونیورسٹی میں عربی تعلیم پر بہت زور دیا جارہا ہے۔

**اِسلام سے دلچسپی** ایک سوال کے جواب میں سر اقبال نے فرمایا کہ اس وقت تو وہاں کوئی مسلمان نہیں، لیکن تعلیم یافتہ طبقہ اب عربی الاصل ہونے پر فخر کا اظہار کرنے لگا ہے۔

اور ہر اچھی چیز کو "مورش" کہہ دیتا ہے (یعنی اسلامی) ان میں اسلام کی طرف سے بغض وعناد کم ہوتا جاتا ہے اور وہ اسلامی تہذیب و تمدن اور فلسفۂ مذہب کا مطالعہ بڑے ذوق سے کرتے ہیں۔ اسپین میں اکثریت رومن کیتھولک کی ہے لیکن مذہب روز بروز کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ گرجے آباد تو ہیں مگر ان میں غریب طبقہ جاتا ہے۔ یہ حالت تو تقریباً ہر یورپین ملک کی ہے۔

**معابد و مساجد**

عربوں کے زمانہ کی عمارتوں کے متعلق جب سوال کیا گیا تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ جن مسجدوں کو گرجاؤں میں تبدیل کر دیا گیا تھا وہ اب تک مسجدوں کی شکل میں نہیں آئیں۔ البتہ چند مسجدیں واگذاشت ہو گئی ہیں اور باقی کے متعلق امید ہے کہ تعصب وعناد کی کمی ہونے پر واگذاشت ہو جائیں گی۔

محکمہ آثار قدیمہ نے عربوں کی عمارتیں کئی جگہ کھدوا کر نکالی ہیں۔ کارڈووا میں کھدائی کا کام جاری ہے۔ خلفاء کے زمانہ کی چند عمارتیں نکل آئی ہیں۔ ان کے بعض حصوں میں ٹوٹی پھوٹی تصویریں بھی نظر آتی ہیں۔

**عربوں کا تمدن ہنوز زندہ ہے**

ایک سوال کے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ عربوں کا تمدن اسپین سے بالکل فنا نہیں ہوا ہے۔ چنانچہ شہر طلیطلہ عربی تمدن کی زندہ مثال ہے۔ قدرتی مناظر و حسن کے علاوہ یہاں کی معاشرت بھی آرام دہ اور دلکش ہے۔ وہاں پہنچ کر میں نے محسوس ہی نہیں کیا کہ اجنبی ملک میں ہوں۔ یہاں کے بازار، مکانات بالکل مشرقی نمونہ کے ہیں اور غذا بھی وہی ہے جو ہم لوگوں کو مرغوب ہے۔ چنانچہ پلاؤ کا مجھے وہی مزہ آیا جو لاہور میں آتا ہے۔ لوگ خلیق اور ملنسار ہیں۔ ان کے رہنے سہنے کا طریقہ بھی مشرقی ہے۔

یہاں ایک چھوٹی سی بالکل سادہ وضع کی مسجد ہے جو اپنی ابتدائی حالت میں اب تک قائم ہے۔ غالباً کسی مسلمان سپاہی نے فتح طلیطلہ کے بعد اسے بنوایا تھا۔ موجودہ حکومت نے اسے آثارِ قدیمہ میں لے کر محفوظ کر دیا ہے۔

اسپین کی زبان میں اب تک عربی الفاظ بہت زیادہ استعمال ہوتے ہیں۔ "اَل" تو اکثر الفاظ میں ملا ہوتا ہے۔

**عربوں کے احسانات**

موجودہ حکومت کے متعلق ایک سوال پر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ جمہوریت سے تمام لوگ خوش ہیں۔ معدودے چند ہوں گے جو شہنشاہیت پسند ہیں۔

موجودہ حکومت کوشش کر رہی ہے کہ قدرتی وسائل اور انعام و اکرام سے استفادہ کریں۔ چنانچہ کان کنی اور معدنیات کے متعلق اب تک جو معلومات بہم ہو سکی ہیں وہ سب وہی ہیں جس کی تحقیقات عربوں نے کی تھی ان کا شوق کا نفع موجودہ نسل اٹھانا چاہتی ہے۔

اسکوریل کی لائبریری بڑی عظیم الشان لائبریری ہے۔ افسوس یہ ہے کہ عربوں کے زمانہ کی قلمی تحریروں کا ذخیرہ متعصبین نے پہلے ہی غارت کر دیا تھا۔ اب تھوڑا ذخیرہ رہ گیا ہے جس میں زیادہ تر مولانا جامی اور حضرت حافظ کی قلمی تحریریں ہیں۔

**مشورہ**

ڈاکٹر صاحب نے آخر میں یہ مشورہ دیا کہ ضرورت ہے یہاں سے ہونہار ایسے تعلیم یافتہ طلباء اسپین بھیجے جا

جو فلسفۂ الٰہیات، عربی تمدن، اسلامی تاریخ اور مذہب سے اچھی طرح واقف ہوں تاکہ وہ اسلام کا صحیح نمونہ اہلِ ہسپانیہ میں پیش کر سکیں۔ (خلافت بمبئی)

**لاہور اسٹیشن پر استقبال**

۲۵ فروری ۱۹۳۳ء کو حضرت اقبال فرنٹیئر میل سے لاہور پہنچے۔ اسٹیشن کا پلیٹ فارم ان کی پیشوائی کرنے والوں سے بھرا ہوا تھا جن میں سے مندرجہ ذیل اصحاب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

حاجی میر شمس الدین، شیخ اصغر علی ریٹائرڈ کمشنر، ڈاکٹر سید محمد حسین شاہ ریٹائرڈ اسسٹنٹ کیمیکل ایگزامینر، علامہ عبداللہ یوسف علی، چوہدری ظفر اللہ خان بیرسٹر ایٹ لاء، مولانا غلام محی الدین قصوری ایڈووکیٹ، سید محسن شاہ ایڈووکیٹ، شیخ عظیم اللہ ایڈووکیٹ، خواجہ فیروز الدین بیرسٹر ایٹ لاء، جناب عبدالرحمٰن چغتائی، پروفیسر محمد عبداللہ چغتائی، محمد الرحیم چغتائی، سید عنایت شاہ ایڈیٹر سیاست، سید انعام اللہ شاہ ایڈیٹر دورِ جدید، سید نور احمد آف سول اینڈ ملٹری گزٹ، مولانا غلام رسول مہر ایڈیٹر انقلاب، میاں امیر الدین رئیس و میونسپل کمشنر، چوہدری فتح محمد رئیس میونسپل کمشنر، ملک میراں بخش رئیس لاہور، سید شبیر حسین مجسٹریٹ، چوہدری محمد حسین، میاں ایم اسلم، چوہدری اسد اللہ خان بیرسٹر ایٹ لاء، شیخ غلام مصطفےٰ حیرت ایڈیٹر فردوس، سید سلامت اللہ شاہ مالک یونائیٹڈ آکشن مارٹ، سید نذیر نیازی، قاضی فضل حق پروفیسر گورنمنٹ کالج، شیخ آفتاب اقبال، جاوید اقبال، شیخ اعجاز احمد سب جج، شیخ مختار احمد، حکیم منشی طاہر الدین، خواجہ عبدالوحید سیکرٹری مسلم ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، معزز ارکان جمعیۃ الاسلام لاہور۔

**سپاسنامہ**

پلیٹ فارم ہی پر جمعیۃ الاسلام کی طرف سے خواجہ فیروز الدین بیرسٹر ایٹ لاء نے سپاسنامہ پیش کیا جس کے بعض اقتباسات درج ذیل ہیں:۔

اس وقت مسلمانانِ ہند کی زبوں حالی عیاں راچہ بیان کے مصداق ہے۔ یہ عظیم الشان قوم جس کی قسمت میں کبھی دنیا کی جہانبانی تھی۔ آج تشتت و افتراق کی آماجگاہ بن کر ہندوستان میں اپنی تاریخی وقعت کھو بیٹھی ہے اور حقیقت بین آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ یہ زوال اور پستی ہمارے مذہب حقہ اسلام کے سنہری اصول سے روگردانی کی وجہ سے ہے۔ ؎

ساقی مدام بادہ با ندانہ می دہد
ایں بے خودی گناہ دل زود مست ما

جناب والا کی ہستی دیگر صفات کے علاوہ مسلمانوں کے دلوں میں اس لئے جگہ کئے ہوئے ہے کہ حضور والا نے اپنی ترنم ریز لَے سے مسلمانوں کو وہ بھولے ہوئے اسباق یاد دلائے ہیں جو آج سے تیرہ سو سال پہلے عرب کی تپتی ہوئی ریگ پر کملی والے نے اسلام کی دل نوازانہ اور روح پرور لَے سے اہلِ عرب کو سنائے تھے حضور والا نے

جس بے باکی اور جس عالمانہ قابلیت کے ساتھ مسلمانانِ ہند کے حقوق کی ترجمانی گول میز کانفرنس میں کی اور جس طرح آپ کی مدبرانہ اور محققانہ نوا نے دشمنانِ حقوقِ اسلامی کے ایوانوں میں لرزے ڈالے، وہ آج ہر خاص و عام مسلمانوں کے دل سے اخلاص کی نذر وصول کرنے کے علاوہ آپ کی شخصیت کی مرغوبیت کو چار چاند لگا رہی ہیں لیکن ان جملہ حقائق کے باوجود ہم حضورِ والا سے حضور ہی کے الفاظ میں گذارش کریں گے۔ ؎

دشتِ حجاز منتظر ریگِ عراق تشنہ کام
خونِ حسینؓ باز دہ کوفہ و شام خویش را

مسلمانوں کا سیاسی نظام ابھی تک اس بات کا متقاضی ہے کہ آپ اس کی تکمیل کے لئے قائدانہ امداد فرماتے رہیں۔ گو نوجوانانِ اسلام ابھی کافی آمادۂ عمل نہیں ہوئے۔ اس لئے ع

حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

## حضرت علامہ کی تقریر

حضرت علامہ نے جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ آپ نے اس استقبال اور سپاسنامہ پیش کر کے میری جس قدر عزت افزائی کی ہے، میں اس کے شکریہ سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ میری زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ آپ کی خدمت میں گذرا ہے۔ اور آپ میری سابقہ زندگی سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اول سے لے کر اب تک میری زندگی کا مطمح نظر یہ رہا ہے کہ مسلمان اپنی موجودہ پستی کی حالت سے نکل کر بلندی پر پہنچ جائیں اور ان میں جو کمزوریاں اور اختلافات رونما ہو گئے ہیں وہ دور ہو جائیں۔ جہاں تک مجھ سے ہو سکا میں نے گول میز کانفرنس میں اسلامی حقوق کے تحفظ کی پوری پوری کوشش کی ہے اور کوئی ایسا لفظ نہیں کہا جس سے مسلمانوں کے حقوق کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔ باہمی اختلافات دور کرنے کے لیے یہ ایک نادر موقع ہے۔ وہ اپنی سابقہ روایات کی روشنی میں متحد ہو سکتے ہیں۔ میں نے یورپ میں اس امر کا بخوبی مشاہدہ کیا ہے کہ وہاں کا ہر مرد اور عورت ماہیتِ اسلام سے آگاہ ہونے کے لئے بے تاب ہے اور وہ ایک ایسے مذہب کی تلاش میں ہیں جس سے انسان کی روحانی تشنگی کا ازالہ ہو سکے۔

وقت چونکہ تنگ ہے اس لئے میں اس موضوع پر مفصل تقریر نہیں کر سکتا اور اپنی تقریر کو ختم کرتے ہوئے آپ سے دوبارہ یہی درخواست کروں گا کہ خدا کے لئے آپ اپنے تمام اختلافات کو خواہ سیاسی ہوں یا مذہبی بالکل مٹا دیں اور ایک ہو جائیں۔ اس وقت تمام اسلامی سلطنتوں نے بڑی حد تک ان نقائص کو دور کر دیا ہے۔ آپ کو بھی ان کی تقلید کی کوشش کرنی چاہیئے۔

## قرطبہ کی عدیم المثال مسجد

اسٹیشن سے نکل کر اکثر اصحاب حضرت علامہ کے دولت کدہ تک ساتھ آئے وہاں بھی کئی اکابر ملاقات کے لئے تشریف لائے۔ گفتگو زیادہ تر ہسپانیہ کی

سیاحت کے متعلق ہوتی رہی اور حضرت علامہ قرطبہ کی مسجد کا ذکر فرماتے رہے۔ آپ نے فرمایا۔ میری رائے میں آج تک اس سے زیادہ خوبصورت اور شاندار مسجد روئے زمین پر تعمیر نہیں ہوئی۔ عیسائیوں نے بعد فتح قرطبہ اس مسجد میں جابجا چھوٹے چھوٹے گرجے بنا دئے تھے جنہیں اب صاف کرکے مسجد کو اصل حالت پر لانے کی تجویزیں کی جا رہی ہیں۔ میں نے ناظم آثارِ قدیمہ کی معیت میں جا کر باجازتِ خاص اس مسجد میں نماز ادا کی۔ قرطبہ پر عیسائیوں کے تسلط کے بعد جسے کم وبیش ساڑھے چار سو برس گزر چکے ہیں۔ اس اسلامی عبادت گاہ میں یہ پہلی اسلامی نماز تھی۔

**قصرِ الحمرا**

ایک ملاقات میں پروفیسر حمید احمد خاں کے اس سوال کے جواب میں کہ آپ نے اسپین میں قصر الحمرا دیکھا ہوگا۔ اس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔؟ علامہ نے فرمایا کہ مسلمانوں کی عمارات دو قسم کی ہیں — جلالی اور جمالی — اور یہ دونوں قسم کی عمارات اپنے بنانے والوں کے کردار کا آئینہ ہیں۔ جہانگیر، شاہ جہان، اور عالمگیر میں محبت کا عنصر زیادہ تھا۔ اس لئے تاج محل۔ شاہدرہ، شالامار اور شاہی مسجد لاہور حسن و جمال کا مظہر بن گئیں۔ شیر شاہ سوری پیکرِ جلال تھا، اس لئے اس کے تعمیر کردہ قلعوں سے ہیبت برستی ہے۔ یہی حال فراعنہ مصر کا تھا۔ الحمرا کے بانی بنو نصر تھے جن میں شدت اور سخت گیری زیادہ تھی۔ اس لئے الحمرا کو دیکھ کر خوف سا آنے لگتا ہے۔ میں نے الحمرا میں ہر جگہ "ھو الغالب" لکھا دیکھا اور ایسے حصوں کی تلاش بھی کرتا رہا جن سے انسان کے غالب ہونے کا تصور پیدا ہو، لیکن میری یہ تلاش ناکام رہی۔

## یہ دُعا اقبالؒ نے مسجد قرطبہ میں بیٹھ کر لکھی

ہے یہی میری نماز، ہے یہی میرا وضو
میری نواؤں میں ہے میرے جگر کا لہو

صحبتِ اہلِ صفا، نور و حضور و سرور
سرخوش و پرسوز ہے لالہ لبِ آبجو

راہِ محبت میں ہے کون کسی کا رفیق
ساتھ مرے رہ گئی ایک مری آرزو

میرا نشیمن نہیں درگہِ میر و وزیر
میرا نشیمن بھی تو، شاخِ نشیمن بھی تو

تجھ سے گریباں مرا مطلعِ صبحِ نشور
تجھ سے مرے سینے میں آتشِ اللہ ھو

تجھ سے مری زندگی سوز و تب و درد و داغ
تو ہی مری آرزو، تو ہی مری جستجو

پاس اگر تو نہیں، شہر ہے ویراں تمام
تو ہے تو آباد ہیں اجڑے ہوئے کاخ و کو

پھر وہ شرابِ کہن مجھ کو عطا کر کہ میں
ڈھونڈ رہا ہوں اسے توڑ کے جام و سبو

چشمِ کرم ساقیا دیر سے ہیں منتظر
جلوتیوں کے سبو، خلوتیوں کے کدو

تیری خدائی سے ہے میرے جنوں کو گلہ
اپنے لئے لامکاں، میرے لئے چار سو

فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا
حرفِ تمنا جسے کہہ نہ سکیں رو برو

ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی

# اقبال کے اُستاد
# ڈاکٹر مک ٹیگرٹ

علامہ اقبال ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۷ء تک، دو سال، کیمبرج میں رہے۔ وہ ٹرنٹی کالج میں فلسفے کے طالب علم تھے۔ جن اساتذہ سے اُنہیں وہاں شرفِ تلمذ حاصل ہُوا۔ اُن میں سرِ فہرست ڈاکٹر مک ٹیگرٹ کا نام ہے۔ یہ تعلق ابتدا میں اُستاد اور شاگرد کی حیثیت سے پیدا ہُوا تھا جس نے آگے چل کر، ہم خیالی اور ہم ذوقی کے باعث، دوستی کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ چنانچہ جب تک ڈاکٹر مک ٹیگرٹ زندہ رہے، اُن کے اور اقبال کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

ڈاکٹر مک ٹیگرٹ کا پورا نام جان مک ٹیگرٹ[1] ایلس مک ٹیگرٹ تھا۔ وہ ۳ ستمبر ۱۸۶۶ء کو لندن میں پیدا ہوئے تھے۔ اُن کے والد کا نام فرانسس ایلس تھا۔ لیکن بعد کو اُنھوں نے اپنا خاندانی نام بدل کر ایلس کی بجائے مک ٹیگرٹ رکھ لیا تھا۔ چار سال کی عمر میں مک ٹیگرٹ کے والد کا انتقال ہو گیا اور آئندہ اُن کی تعلیم و تربیت کا سارا بوجھ اُن کی والدہ کے کندھوں پر آ پڑا۔

مک ٹیگرٹ کی ابتدائی تعلیم وے برج کے قصبے میں ہوئی جہاں سے وہ کلفٹن کے پبلک سکول میں چلے گئے۔ اُنیس سال کی عمر میں اُنہیں کیمبرج کے ٹرنٹی کالج میں داخلہ مل گیا اور ۱۸۸۸ء میں اُنھوں نے بڑے اعزاز سے فلسفے میں درجۂ اوّل کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۸۹۰ء میں مک ٹیگرٹ کی والدہ اپنے بچوں کو لے کر نیوزی لینڈ چلی گئیں لیکن مک ٹیگرٹ کو چونکہ کیمبرج کے ٹرنٹی کالج کا فیلو منتخب کر لیا گیا تھا۔ اِس لئے وہ انگلستان ہی میں رہے۔ چند سال بعد اُنہیں ٹرنٹی کالج میں باقاعدہ لیکچرار مقرر کر دیا گیا اور یہ درس و تدریس کا سلسلہ ۱۹۲۵ء تک قائم رہا۔

۱۸۹۸ء میں مک ٹیگرٹ اپنی والدہ سے ملنے نیوزی لینڈ گئے جہاں اُنھوں نے ایک شریف گھرانے میں شادی کر لی۔ مک ٹیگرٹ کی بیوی نہایت مہذب، ہمدرد اور خوش اطوار خاتون تھی جس کی رفاقت مک ٹیگرٹ کے لئے انتہائی راحت اور مسرت کا سرچشمہ ثابت ہوئی۔

ڈاکٹر مک ٹیگرٹ ستائیس سال کیمبرج میں فلسفے کا درس دیتے رہے۔ اُن کی علمی زندگی بڑی خاموش، پُرسکون اور اطمینان بخش تھی جس میں سیاست کے ہنگامے بار نہ پا سکتے تھے۔ لیکن مک ٹیگرٹ اپنی بعض خصوصیتوں کے اعتبار

---

a[1] John Mc Taggart Ellis McTaggart

ے دلچسپ انسان تھے۔ مثلاً وہ ہستیٔ باری تعالےٰ کے منکر تھے لیکن حیاتِ بعد الموت کے قائل تھے۔ انھیں
رسمی مذاہب سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن کلیسائے انگلستان (چرچ آف انگلینڈ) کے بڑے حامی تھے۔ جب
رتبہ ان سے اس تضادِ خیالی کی وجہ دریافت کی گئی تو انھوں نے جواب دیا کہ ہر شخص تو مک ٹیگرٹ نہیں کہ مذہبی
سے بے نیاز ہو کر بھی اخلاق اور معاشرت کے ضابطے کی پابندی کر سکے۔ عوام کو سیدھے راستے پر قائم رکھنے اور
میں یک جہتی پیدا کرنے کے لئے چرچ کی سخت ضرورت ہے۔ حیاتِ بعد الموت کا عقیدہ رکھنے کے باوجود ڈاکٹر
لۂ تناسخ کے بھی قائل تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ انسان کی رُوح کو عرفان حاصل کرنے کے لئے بار بار کئی زندگیوں میں
گذرنا پڑتا ہے۔

جب ۱۹۲۰ء میں کیمبرج کے پروفیسر نکلسن نے اقبال کی مثنوی اسرارِ خودی کا انگریزی میں ترجمہ شائع کیا تو
یگرٹ نے اقبال کو ایک خط میں لکھا:

"مجھے آپ کی مثنوی پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی، لیکن آپ نے اپنے
خیالات میں یہ تبدیلی کیونکر پیدا کر لی۔ جب آپ یہاں تھے اور ہمارے
درمیان فلسفیانہ بحثیں ہوا کرتی تھیں تو آپ وحدت الوجود کے سخت قائل تھے۔
اب اسی نظریے کی آپ مخالفت کرتے ہیں۔

اس خط میں آگے چل کر مک ٹیگرٹ اقبال کو لکھتے ہیں کہ

"سوال غالباً اپنے اپنے ملک کے مقامی اور قومی تقاضوں کا ہے۔ مجھے
آپ سے اتفاق ہے کہ ہندوستان ضرورت سے زیادہ اندرون بینی اور
تفکر میں مبتلا ہے۔ اس کے برعکس انگلستان ہی نہیں پورا یورپ اس
تفکر سے محروم ہے۔ آپ کو ہم سے عمل کا درس لینا چاہیے اور ہمیں آپ
سے غور و فکر کی نعمت حاصل کرنی ضروری ہے۔"

اقبال نے ایک مرتبہ اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ جب وہ کیمبرج میں پڑھتے تھے اور قریباً روزانہ ڈاکٹر مک ٹیگرٹ
ملاقات ہوتی تھی تو گفتگو ہر پھر کر ہستیٔ باری تعالےٰ پر آ کر ٹھہر جاتی تھی۔ مک ٹیگرٹ خدا کے وجود سے انکار کرتے
۔ اور اُن کے زبردست دلائل کے سامنے اگرچہ اقبال کی زبان بند ہو جاتی تھی لیکن وہ اقبال کو اپنا ہم خیال کبھی
بنا سکے۔

اس کے باوجود اقبال کی رائے ہے کہ مک ٹیگرٹ کا فلسفہ ایک خاص قسم کا تصوّف تھا جس نے عقل کی روشنی
اُن کو یزداں شناسی کا راستہ دکھایا۔ وہ مک ٹیگرٹ کو ایک صوفی کا مرتبہ عطا کرتے ہیں اور اس سلسلے میں
ٹیگرٹ کے ساتھ امام غزالی، فلاطینوس اور برگساں کے نام بھی لیتے ہیں۔ اقبال کا خیال ہے کہ صوفیا اپنی
اردات قلب کا اظہار دوسروں سے نہیں کرتے کیونکہ یہ واردات سراسر انفرادی وجدان پر منحصر ہوتی ہیں

جنھیں عام لوگ سمجھنے سے معذور ہیں۔ اسی طرح مک ٹیگرٹ بھی اپنے قلبی واردات دُوسروں سے بیان نہیں کرتے تھے۔

کیمبرج میں مک ٹیگرٹ کا حلقۂ احباب خاصا وسیع تھا۔ روجر فرائی۔ نیتھنیئیل ویڈ اور جی ڈکنسن تو یونیورسٹی میں اُن کے ہم عصر تھے۔ اس کے علاوہ آرتھر بالفور۔ ہالڈین۔ ٹامس ہارڈی اور سر فرانسس ینگ ہزبنڈ اُن سے ملاقات کے لئے اکثر آتے رہتے تھے۔ یُوں بھی مک ٹیگرٹ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اُن میں دوست بنانے کی خاص صلاحیت تھی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ کیمبرج سے لندن آتے تو گاڑی کے مختصر سے سفر میں اپنی خوش گفتاری سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنالیتے تھے۔ حالانکہ پاس بیٹھے ہوئے مسافروں کو معلوم تک نہ ہونے پاتا کہ جس شخص کے ساتھ وہ باتیں کر رہے ہیں وہ انگلستان کا ایک بہت بڑا فلسفی ہے۔

ڈاکٹر مک ٹیگرٹ کے فلسفیانہ افکار کے متعلق کچھ عرض کرنا میرا منصب نہیں کیونکہ میں صرف فلسفے کے مبادی سے واقف ہوں۔ مک ٹیگرٹ، ہیگل کے بڑے مداح تھے۔ اور اُنھوں نے ہیگل کے فلسفے کی شرح تین جلدوں میں لکھی ہے۔ لیکن بعض نقادوں کی رائے ہے کہ مک ٹیگرٹ کی بہترین تصنیف دی نیچر آف اگزسٹنس ......

(The nature of Existence) ہے۔

فلسفے کے علاوہ مک ٹیگرٹ کو شعروادب کا بھی نہایت اچھا مذاق تھا۔ اُن کے مطالعہ کی رفتار اِس قدر تیز تھی کہ ہر روز ایک ناول ختم کرتے تھے۔ ڈکنز کے ناولوں کا ایک ایک لفظ اُنھوں نے پڑھ ڈالا تھا۔ ہارڈی اور میریڈتھ کے اکثر ناول بھی اُن کے مطالعہ سے گذر چکے تھے۔ شعراء میں سے اُنہیں سُوئن برن۔ عمر خیام۔ پوپ اور شیکسپیئر نسبتاً زیادہ محبوب تھے۔ تاریخ کا اُنہیں کچھ خاص ذوق نہیں تھا۔ لیکن مشاہیر کی خود نوشت سوانح عمریاں اور مکاتیب بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ سیاسی عقائد کے اعتبار سے وہ ٹوری تھے۔ لیکن بعض معاملات میں اُن کے خیالات ٹوری پارٹی سے بھی مختلف تھے۔ مثلاً وہ اس بات کے حامی تھے کہ عورتوں کو ووٹ دینے کا حق ضرور ملنا چاہیئے۔ اِس کے علاوہ بین الاقوامی تجارت سے تمام پابندیاں اُٹھا لینے کی بھی وہ حمایت کرتے تھے۔ جب ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم شروع ہوئی تو مک ٹیگرٹ نے پُوری تن دہی سے برطانوی حکومت کی مدد کی۔ اِس لحاظ سے اُن کی حُبّ الوطنی ایمان کے درجے تک پہونچ گئی تھی۔ جب برٹرنڈرسل نے جنگ کی مخالفت میں ایک پمفلٹ شائع کیا تو محض فرض شناسی کے احساس سے مک ٹیگرٹ نے رسل سے تمام تعلقات منقطع کر لئے اور کیمبرج سے برٹرنڈرسل کو نکلوانے میں خود مک ٹیگرٹ کا بہت بڑا حصّہ تھا۔

دسمبر ۱۹۲۴ء کی تعطیل میں مک ٹیگرٹ اور اُن کی اہلیہ لندن آئے۔ اس وقت مک ٹیگرٹ کی صحت بظاہر بہت اچھی تھی۔ اور وہ خوش و خرم دِکھائی دیتے تھے۔ یکایک ایک روز اُن پر قلب کی بیماری کا حملہ ہُوا۔ اُنہیں فوراً ہسپتال پہونچا دیا گیا۔ لیکن تمام کوششیں بے کار ثابت ہوئیں اور ۱۸ر جنوری ۱۹۲۵ء کو اُن کا انتقال ہو گیا۔

وفات سے ایک روز پہلے، جب اُنہیں یقین ہو گیا کہ اب وہ زندہ نہیں رہ سکتے، تو اُنھوں نے اپنی

بیوی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔" جانِ من! تم سے جُدا ہونے کا غم ترضرور ہے۔ لیکن تم جانتی ہو، مَیں موت سے بالکل نہیں ڈرتا"

علامہ اقبال کی رائے ہے کہ موت سے بے خوفی اور بے اعتنائی کا یہ دو ٹوک اظہار وہی شخص کر سکتا ہے جس نے حقیقتِ کبریٰ کا مشاہدہ اپنی آنکھ سے کر لیا ہو۔ عجیب اتفاق ہے کہ خود اقبال کی وفات سے ایک روز پہلے، جب تیمار داروں نے اضطراب اور پریشانی کا اظہار کیا تو علامہ مرحوم نے فرمایا کہ" میں مسلمان ہوں۔ مَیں موت سے نہیں ڈرتا"

قسمت نگر کہ کشتۂ شمشیرِ عشق یافت
مرگے کہ زندگاں بدعا آرزو کنند

---

# ڈاکٹر آرنلڈ

توکہاں ہے اے کلیمِ ذروۂ سینائے علم | تھی تری موجِ نفس بادِ نشاط افزائے علم
اب کہاں وہ شوقِ رہ پیمائی صحرائے علم | ترے دم سے تھا ہمارے سر میں بھی سودائے علم

"شورِ لیلیٰ کو کہ باز آرائشِ سودا کند
خاکِ مجنوں را غبارِ خاطرِ صحرا کند" (اقبالؔ)

# مولوی میر حسن شاہ

وہ شمعِ بارگہِ خاندانِ مرتضوی | رہے گا مثلِ حرم جس کا آستاں مجھکو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی | بنایا جس کی مروّت نے نکتہ داں مجھکو

دعا یہ کر کہ خداوند آسمان و زمیں
کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھکو (اقبالؔ)



# فسادِ خون اور خارش
# جیسی جلدی بیماریوں سے محفوظ رہیے!

خون میں سرائت کئے ہوئے فاسد مادے اکثر پھوڑے پھنسی اور دوسری جلدی بیماریوں کی صورت میں نمودار ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ آجکل بھی ان امراض کی شکایت عام ہے۔ ان عوارضات سے بچنے کیلئے صافی کا استعمال کیجئے۔ یہ خون کی صفائی اور جلدی بیماریوں سے محفوظ رہنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

ہمدرد مرہم: پھوڑے، پھنسیوں کے لئے ہمدرد مرہم کا بیرونی استعمال نہایت مفید ہے۔





محمد عبداللہ قریشی

# من باتوں میں موہ لیتا ہے

علامہ اقبال علیہ الرحمۃ ہم سب کے محبوب شاعر اور دنیائے اسلام کے مایۂ ناز مفکر تھے۔ وہ ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے اور ان کی ہردلعزیزی کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ جب وہ اپنے پُرعظمت وجود کے ساتھ اس دنیا میں موجود تھے، تو ہم ان کی پُرلطف صحبتوں اور علمی محفلوں سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ وہ ان شاعروں میں نہ تھے جو زندگی سے بس لطف اٹھاتے اور اسی کے گیت گاتے ہیں بلکہ وہ ان مسیحا نفسوں میں تھے جن کے دم سے زندگی کی مرجھائی ہوئی کلیاں لہلہانے لگتی ہیں۔ انھوں نے اس شمع فروزاں کے مانند، جو اپنے گرد وپیش کی دنیا میں اُجالا کردیتی ہے، اپنے دل کی روشنی اور بصیرت کے نور سے لوگوں کے دلوں کی تاریک بستیوں کو منور کیا۔ ان کے بعد اب کوئی ایسی جامع الکمالات ہستی نظر نہیں آتی جس کے پاس جاکر کوئی اسلامی معلومات حاصل کرے یا روحانی اُلجھن دُور کرسکے۔

اقبال ایک پسماندہ قوم کے فرد تھے۔ وہ "فقیر راہ نشیں" تھے لیکن "دلِ غنی" رکھتے تھے جس میں انسانی محبت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ انھوں نے اس وقت آنکھ کھولی جب یہ قوم اجتماعی زندگی کے تمام دائروں میں پٹ چکی تھی، اس میں اُبھرنے اور آبرو مندانہ مقام حاصل کرنے کی سکت نہ تھی۔ اس دَور میں کئی بزرگ پیدا ہوئے جنھوں نے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں اپنے اپنے خیال اور مذاق کے مطابق قوم کی خدمت کی۔ کسی نے تعلیم کی اشاعت کو اوڑھنا بچھونا بنایا، کسی نے سیاست کا مورچہ سنبھالا اور کسی نے مذہبی احیاء کو وظیفہ قرار دے لیا۔ یہ سب ہستیاں واجب الاحترام ہیں لیکن علامہ اقبال کی خدمت کا دائرہ بہت زیادہ وسیع اور اہم تھا۔ انھوں نے قومی زندگی کے حقیقی سرچشمہ میں حرکت و حرارت پیدا کی، دلوں کو گرمایا، روح کو تڑپایا، احساس کمتری کو مٹایا اور خودی کے جذبے کو استقلال و استحکام بخشا، دماغوں میں رفعت اور بلندی کی "زندہ تمنا" پیدا کی اور قوم کے مزاج، مذاق اور فطرت کو بدل کر اس مقام پر پہنچا دیا جہاں سے یادگار زندگی کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ ان کا حیات افروز پیغام رہتی دنیا تک باقی رہے گا۔

وہ خود تو گوشہ نشین تھے، بہت کم زاویۂ عزلت سے باہر آتے تھے مگر دنیا کی بڑی بڑی شخصیتیں ان کی صحبت سے فیضیاب ہونا باعث فخر سمجھتی تھیں ؎

تاثیر ہے یہ میرے نفس کی کہ خزاں میں
مرغانِ سحر خواں مری صحبت میں ہیں خورسند

ان کے پاس ہر طرح کے لوگ آتے اور سلام کرکے بیٹھ جاتے تھے۔ علامہ اوّل تو ان کی باتیں سنا کرتے ہوں ہاں کرتے رہتے مگر جب ضرورت محسوس ہوتی، کرسی پر بیٹھے بیٹھے یا چارپائی پر لیٹے لیٹے گھنٹوں بولتے رہتے۔ ان کے خیالات میں جدّت اور اظہارِ خیال میں خاص ندرت ہوتی تھی۔ وہ جس مسئلے کو بیان کرتے اور جس حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھاتے، اس میں عجیب عجیب اور نئے نئے نکتے پیدا کر دیتے تھے۔ مذہبی گفتگو شروع ہے تو کوئی پہلو نہیں جو چھوڑ دیا ہو۔ ملکی بحث ہے تو اس میں بے تکان بولتے چلے جا رہے ہیں۔ سیاسی بات چیت ہے تو اپنے دلائل سے مخاطب کو قائل کیے جا رہے ہیں۔ فلسفہ ہو یا منطق، لطیفہ ہو یا چٹکلہ، اپنے ملک کا معاملہ ہو یا کسی غیر ملک کا، ان میں معلومات کی کمی نہ تھی۔ وہ مشرق و مغرب کے علوم، گوناگوں تجربات اور دنیا بھر کے مشاہدات حاصل کرنے کے باوجود حبِّ اسلام کے جنوں میں گرفتار اور عشقِ رسول ؐ کے جام سے سرشار تھے۔ قرآن و حدیث کو جتنا انھوں نے سمجھا، اپنے کلام کے ذریعے انگریزی خواں نوجوانوں کو بطریقِ احسن سمجھا دیا۔ جب کوئی ان کی صحبت سے اٹھتا تو ایسا محسوس کرتا تھا کہ اس کا ایمان تازہ ہو گیا ہے اور زندگی میں ایک نئی گہرائی اور معنویت پیدا ہو گئی ہے۔ غرض ؎

بہت لگتا تھا جی صحبت میں ان کی
وہ اپنی ذات میں اک انجمن تھے

ان کی قابلِ قدر باتوں سے کئی سینے اب تک آباد ہیں۔ بعض بزرگوں اور دوستوں نے اپنی ملاقاتوں کا حال قلم بند بھی کیا ہے جو بے حد معلومات افزا ہے اور علامہ کے سوانحِ حیات کی کڑیاں ملانے میں بہت مفید کام دے سکتا ہے۔ ان میں یقیناً ان کے دیدۂ تر کی بے خوابیاں بھی ہیں اور دل کی پوشیدہ بےتابیاں بھی، نالۂ نیم شب کا نیاز بھی ہے اور خلوت و انجمن کا گداز بھی، امنگیں بھی ہیں اور آرزوئیں بھی، امیدیں بھی ہیں اور جستجوئیں بھی اور کچھ عجب نہیں کہ اگر یہ سب باتیں ایک جگہ جمع ہو جائیں تو علامہ مرحوم کے قلب و دماغ کی بہت سی پوشیدہ خوبیاں روشنی میں آ جائیں گی اور ان کے پیغام کی روح کو سمجھنے میں آسانی ہوگی ؎

یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر  اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اسے  لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

ذیل میں چند ملاقاتوں کا حال درج کیا جاتا ہے۔ جن کے مطالعہ سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ اقبالؔ کی باتوں میں کتنی موہنی تھی اور کیوں نہ ہو ع

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے

(صغرا ہمایوں بیگم)

**میں موت سے نہیں ڈرتا** | جب میں ۱۹۲۸ء میں کشمیر جا رہی تھی، چند روز لاہور میں ٹھہرنا ہوا۔ ہمارے ہوٹل کے بازو میں سر محمد اقبال صاحب کا مکان تھا۔ بیرسٹر صاحب (سید ہمایوں مرزا) ان سے ملنے گئے۔ اس کے بعد مجھے چائے پر بلایا۔ میں ان کی بیوی سے ملی۔ جاوید صاحب بہت چھوٹے تھے۔ میں

نے ایک نظم نور جہاں پر ریل میں لکھی تھی جس کے چند شعر یہ ہیں :-

اے خوشا وقت کہ ہوں آج میں آئی لاہور / میری دیرینہ تمنا مجھے لائی لاہور
مرقدِ نور جہاں دیکھنے کی خواہش تھی / آرزو ہوگئی پوری مرے خالق دل کی
زندگی میں تھی ترے نور سے دنیا تاباں / بعد مرنے کے ہے لاہور بھی اس سے رخشاں
ترے ہی فیض سے لاہور ہے ممتاز جہاں / ورنہ لاہور کو یہ شہرت و اعزاز کہاں
شہر میں نور نمایاں در و دیوار سے ہے / رونقِ شہر اسی شمع ضیا بار سے ہے
سارے ایرانیوں کو فخر نہ ہو کیوں تجھ سے / خوب دنیا میں کیا نام بڑے کام کیے
کوئی مرقد کی زیارت کو جو آ جاتا ہے / حسب دستورِ جہاں پھول چڑھا جاتا ہے
ریل میں مجھ کو خیال آیا لکھوں کچھ اشعار / اور چڑھاؤں تری تربت پہ یہ اخلاص کے ہار
ہے تری خاک کے ہر ذرہ پہ خورشید نثار / عوض لالہ و گل لائی ہوں میں نظم کے ہار
مجھ کو معلوم ہے جو کچھ ہے حقیقت میری / پر ہے مقصود کہ ظاہر ہو عقیدت میری

بس اسی واسطے اشعار حیا نے لکھے
پھول کے بدلے چڑھائی یہ مری یاد رہے

یہ نظم حضرت کے پاس بھیجی۔ انھوں نے اس پر اصلاح دے کر معہ خط کے ہوٹل میں میرے ہاں بھیجا۔ خط و کتابت مجھ سے اور سر محمد اقبال سے رہا کرتی تھی۔ پردہ کی سختی کی وجہ سے میں ملاقات نہ کر سکی۔ حالاں کہ میرے شوہر مرحوم سید ہمایوں مرزا صاحب میرے ساتھ تھے۔ ایک خط جو میرے نام آیا تھا درج کرتی ہوں :-

مخدومہ صغرا ہمایوں مرزا

تسلیم۔ آپ کا والا نامہ ابھی ملا ہے جس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ میری صحت ایک مدت سے خراب ہے۔ اس واسطے لٹریری مشاغل کی طرف بہت کم توجہ کر سکتا ہوں۔

"پیام مشرق" نام کا ایک مجموعہ نظم جو فارسی میں ہے تیار ہو رہا ہے۔ شاید دو تین ماہ میں شائع ہو جائے گا۔ انشاء اللہ ایک کاپی آپ کی خدمت میں ارسال کروں گا لیکن چونکہ اندیشہ ہے کہ بھول نہ جاؤں، اس واسطے اگر کتاب آپ کو نہ پہنچے تو بلا تکلف یاد دلا دیجیے۔ آپ کے شوہر ہمایوں مرزا صاحب سے مجھے نیاز حاصل نہیں ہے لیکن میں نے آپ کا خط جو ہزار داستان میں شائع ہوا ہے پڑھا ہے۔ اس خط کے پڑھنے سے مجھے خاص مسرت ہوئی۔ زیاد مرحوم کی لٹریری عظمت سے کس کو کلام ہو سکتا ہے جن کے شاگردوں میں

شاد عظیم آبادی ہوں ۔ امید کہ مزاج بخیر ہوگا ۔

مورخہ ۸ ار فروری ۱۹۲۳ء　　　مخلص ۔ محمد اقبال لاہور

جب میں سر محمد اقبال صاحب کے ہاں گئی تھی ، انھوں نے میرے آٹوگراف البم میں انگریزی میں یہ مضمون لکھا :۔

"اسلام کی تعریف میں چند الفاظ ظاہر کرتا ہوں ۔ یعنی ذات باری پہ پورا بھروسہ ہے اور موت سے مطلق نہیں ڈرتا ۔"

اس سے ظاہر ہے کہ ان کے دل میں موت کا ڈر نہیں تھا ۔ ۲۸ء میں جو میرے آٹوگراف میں لکھا تھا وہی آخر وقت میں بھی زبان سے نکلا ۔ (ایک غزل میں جو اقبال کے مجموعوں میں شامل نہیں یہ شعر بھی ملتا ہے ۔

موت یہ میری نہیں میری اجل کی موت ہے
کیوں ڈروں اس سے کہ مر کر پھر نہیں مرنا مجھے ——— قریشی )

## ( قاضی عبدالحمید قریشی )

**داؤد اپسن کا قبول اسلام** ڈاکٹر محمد اقبال ایک پختہ دماغ عارف اور حکیم تھے ، آپ جب بھی کسی مسئلہ پر گفتگو فرماتے تھے ، اُس کے تعلق میں ، کلیات و تخیلات کا اور اُن کے ساتھ ہی مثالوں اور حوالوں کا ایک مواج دریا آپ کے دماغ سے اترتا تھا اور زبان سے بہ جاتا تھا ۔

۲۸ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو راقم الحروف موصوف کی خدمت میں حاضر ہوا ، آپ آرام کرسی پر تشریف فرما تھے ، حقہ سامنے رکھا تھا ، رسمی مزاج پرسی ہوئی اور اس کے بعد تبلیغ اسلام کے عنوان پر گفتگو شروع ہوگئی ۔

"آپ ایک کتاب لکھئے "۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ۔

"کیسی کتاب ؟" میں نے پوچھا ۔

"تحقیقات کرنے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ ہندوستان کے قصبات اور دیہات میں ہزار ہا غیر مسلم حلقۂ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں ۔ اگر کوئی شخص ان از خود مسلمان ہونے والوں سے ملے اور اُن سے قبول اسلام کی وجوہ دریافت کرکے ایک کتاب میں جمع کر دے تو اس سے تبلیغ اسلام کے مقصد کو بے حد تقویت حاصل ہوگی ۔"

"کیا صداقت اسلام کے متعلق پہلے دلائل ناکافی ہیں ؟" میں نے پوچھا ۔

"بہت کافی ہیں ، مگر ایسا کرنے سے کئی ایسے عجیب اور جدید دلائل آپ کو ملیں گے کہ دنیا حیرت زدہ رہ جائے گی ۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ دل اور دماغ کے کام کرنے کے طریقوں میں بہت فرق ہے ۔ دماغ اکثر اوقات ہزار ہا مضبوط سے مضبوط دلائل کو مسترد کر دیتا ہے اور ان کی کچھ بھی پرواہ نہیں کرتا لیکن دل اس کے برخلاف بعض اوقات کمزور سے کمزور چیزوں سے اس قدر متاثر ہو جاتا ہے کہ صرف ایک ہی جھٹکے میں زندگی کا سارا نقشہ بدل جاتا ہے ۔ قبول اسلام کا جس قدر تعلق دل سے ہے ، دماغ سے نہیں ۔ اصل بات جو مبلغ کو معلوم ہونی چاہیے یہ ہے کہ وہ کرن کون سے نشتر

ہیں جن سے دل متاثر ہوا کرتے ہیں؛ کفار اور مشرکین کے انقلابِ حیات کی ہزار ہا مثالیں تاریخِ اسلام میں موجود ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص اپنے حالات کے ماتحت، ایک خیال یا ایک مذہب پر چٹان کی طرح قائم ہوتا ہے۔ ناگہاں غیب سے اس کے دل پر ایک نشتر چلتا ہے اور چشم زدن میں اس کی زندگی کی تمام گذشتہ تاریخ بدل جاتی ہے۔ صداقتِ اسلام کے عقلی دلائل تو آپ کے پاس بہت ہیں، مگر عملی دلائل کم ہیں۔ اگر آپ نومسلموں کے پاس جائیں تو وہ بتائیں گے کہ اسلام کی وہ کونسی بے ساختہ ادا تھی جو ان کے دل کو بھا گئی؛ اگر ان کے بیانات ایک کتاب میں جمع کر دیئے جائیں تو مجھے یقین ہے کہ انقلابِ حیات کی ایک بالکل نئی دنیا، مبلغینِ اسلام کے سامنے آجائے گی اور انہیں اشاعتِ اسلام کے لئے ایسے نئے دلائل یا جدید ہتھیار مل جائیں گے کہ ان سے اسلام کا موجودہ کتب خانہ خالی ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب! آپ کو بھی کوئی واقعہ یاد ہے؟" میں نے پوچھا۔

ڈاکٹر اقبال تھوڑی دیر چپ رہے، اس کے بعد فرمایا "میں آپ کی کتاب کے لیے چار نہایت ہی دلچسپ مثالیں پیش کر سکتا ہوں۔"

"آپ کو تکلیف تو ضرور ہوگی مگر اسلام کی خدمت ہو جائے گی، آپ تکلیف کر کے ضرور ارشاد فرمایئے؛" میں نے التماس کی۔

ڈاکٹر صاحب نے بیان کرنا شروع کیا:۔

"مشہور انگریز نومسلم مسٹر داؤد آپسن مرحوم (ایڈیٹر مسلم آؤٹ لُک لاہور) ایک نہایت زندہ دل آدمی تھے۔ آپ کی عالمانہ زندگی کی عجیب و غریب خصوصیتوں میں سے ایک یہ تھی کہ آپ کو پلاؤ سے نہایت ہی غیر معمولی محبت تھی۔ اگر کوئی شخص آپ کو پلاؤ بھیجتا تھا تو آپ برابر کئی کئی ہفتے اس کا شکریہ ادا کرتے رہتے تھے۔ میں نے ایک دن مرحوم سے سوال کیا، آپ کے مشرف باسلام ہونے کے اسباب کیا ہیں؟

مرحوم نے فرمایا "میرے مسلمان ہونے کا قصہ نہایت ہی عجیب ہے۔ اگر میں عرض کر دوں تو آپ حیران رہ جائیں گے۔ میرا اسلام کے متعلق کوئی مطالعہ نہیں تھا، نہ مجھے کسی عالم و فاضل مسلمان کی صحبت میسر آئی تھی کہ مجھ پر اسلام کی خوبیاں منکشف ہوتیں، میں انگلستان سے آیا اور بمبئی میں رہنے لگا۔ ہندوستان میں میرے سب سے پہلے دوست وہ لوگ تھے جو سیاسی تحریکات میں حصہ لیتے تھے، بمبئی کے مذہبی حلقوں سے نہ میرا تعارف تھا اور نہ تعلق۔ جب میں نے ہندوستان کی سیاسی تحریکات میں حصہ لینا شروع کیا تو بعض مقامی مسلمانوں سے بھی میری ملاقات ہوئی اور میں ان کے ہاں آنے جانے لگا۔ ایک مرتبہ ایک معزز مسلمان نے مجھے کھانے پر بلایا۔ اسلامی طریق کے مطابق دسترخوان بچھایا گیا، اس وقت جو چیزیں میرے سامنے لائی گئیں، ان میں ایک پلاؤ بھی تھا۔ میری زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ میری زبان اس جنتی نعمت سے لذت اندوز ہوئی۔ میں پلاؤ کھا رہا تھا، مزے لے رہا تھا، مسرور ہو رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ کچھ غور کر رہا تھا۔"

"آپ کیا غور کر رہے تھے؟" ڈاکٹر اقبال نے پوچھا۔

"میں نہیں کہہ سکتا، میری سوچ کیا تھی، ڈاکٹر صاحب! میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں، میں پلاؤ کھا رہا تھا، مزے لے رہا

تھا اور کچھ غور کر رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ میرے خیالات میں ایک نہایت ہی خوشگوار تبدیلی پیدا ہو رہی تھی۔ یکایک مجھے ایک خیال سوجھا، اس طرح کہ تمام جسم میں ایک بجلی سی دوڑ گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ غیب سے ایک نشتر چلا ہے اور میری کایا پلٹ گئی ہے۔ میں نے خیال کیا کہ جس قوم کا مذاق کھانے کے معاملے میں اس قدر لطیف اور پاکیزہ ہے، دین اور روحانیت کے معاملے میں اس کا معیار کتنا کچھ لطیف اور پاکیزہ ہوگا؟ یہ کہہ کر مسٹر آپسن نے قہقہہ لگایا اور کہا، ڈاکٹر صاحب! مجھے نہ تو آپ کے کسی مُلّا نے مسلمان کیا اور نہ صوفی نے۔ میں تو حضرت پلاؤ کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوا ہوں۔

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا، دوچار قہقہوں کے بعد مسٹر داؤد آپسن پھر سنجیدہ ہوئے اور کہنے لگے "میں نے پلاؤ کی رکابی کے سامنے بیٹھ کر مسلمانوں کی خوش مذاقی اور اسلام کی لطافت کا جو اندازہ کیا تھا، بعد کے مطالعہ اسلام سے وہ بالکل صحیح ثابت ہوا، میں نے دیکھا کہ زندگی کے ہر میدان میں اسلام صرف بلندی اور برتری کا علم بردار ہے، اسلام کی سلطنت میں کہیں بھی بد مذاقی اور پستی نہیں ہے، جس قدر اسلام کی عبادت بلند ہے، اسی قدر اسلام کی تہذیب بھی بلند ہے۔ جس قدر اسلام کے طعام و لباس بلند ہیں، اُسی قدر اسلام کے اعمال و اخلاق کی روایات بھی بلند ہیں۔ میرے نزدیک کسی شخص کے قبول اسلام کے معنی یہ ہیں کہ وہ ساری دنیا سے اونچا ہو جاتا ہے اور پھر اس کی زندگی میں جس قدر بھی اعمال سرزد ہوتے ہیں وہ بھی دنیا بھر کے عملوں سے اونچے ہوتے ہیں۔"

اس کے بعد مسٹر داؤد آپسن پھر ہنسے اور پلاؤ کی تعریفیں کرنے لگے، ہماری گفتگو کا ماحصل یہ تھا:-

"پلاؤ زندہ باد" ڈاکٹر اقبال نے کہا "اسلام زندہ باد!" مسٹر داؤد آپسن نے جواب دیا۔

## ایمان کی تلاش

"ڈاکٹر صاحب! آپ کا دوسرا واقعہ کیا ہے"؟ میں نے پوچھا ڈاکٹر اقبال نے بیان کرنا شروع کیا:-

مسٹر داؤد آپسن کے قبول اسلام سے زیادہ عجیب لیڈی بارنس کا قبول اسلام ہے۔ آپ ایک نومسلم فوجی انگریز کی بیوی تھیں۔ چند سال کا ذکر ہے کہ یہ دونوں میاں بیوی ایک مقدمے میں مبتلا ہو گئے اور اسی سلسلے میں میرے پاس آئے چونکہ الزامات نادرست تھے اس لئے تھوڑی سی پریشانی کے بعد عدالت نے ان دونوں کو عزت کے ساتھ بری کر دیا۔ اس کے چند روز بعد لیڈی بارنس میرا شکریہ ادا کرنے کے لیے لاہور تشریف لائیں۔ اس وقت میں نے سوال کیا، لیڈی صاحبہ! آپ کے مشرف بہ اسلام ہونے کے اسباب کیا ہیں؟

"مسلمانوں کے ایمان کی پختگی، ڈاکٹر صاحب!" لیڈی بارنس نے جواب دیا۔

"لیڈی صاحبہ! میں نہیں سمجھا، اس سے آپ کی کیا مراد ہے"؟ ڈاکٹر اقبال نے پوچھا۔

"ڈاکٹر صاحب! میں نے دیکھا ہے کہ دنیا بھر میں کوئی بھی قوم ایسی نہیں ہے جس کا مسلمانوں کی طرح ایمان پختہ ہو، بس، اسی چیز نے مجھے اسلام کا حلقہ بگوش بنا دیا ہے"۔ لیڈی بارنس نے اپنا نظریہ پیش کر کے تھوڑا سا تامل فرمایا اور کہا، "ڈاکٹر صاحب! میں ایک ہوٹل کی مالکہ تھی۔ یہیں ایک دفعہ میجر صاحب کھانے کے لیے آئے تھے۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہ مسلمان ہیں، تھوڑا عرصہ ہماری گفتگوئیں جاری رہیں اور اس کے بعد میری ان سے شادی ہو گئی۔

میرے ہوٹل میں ایک ستر سالہ بڈھا مسلمان ملازم تھا۔ اس بڈھے کا فرزند نہایت ہی خوبصورت نوجوان تھا۔ پچھلی بیماری میں جب یہ لڑکا چل بسا تو مجھے بے حد صدمہ ہوا۔ میں بڈھے کے پاس تعزیت کے لیے گئی، اُسے تسلّی دی اور دلی رنج وغم کا اظہار کیا۔ بڈھا نہایت غیر متاثر حالت میں میرے الفاظ سنتا رہا اور جب میں غم کی باتیں ختم کر چکی تو اس نے نہایت شاکرانہ انداز میں آسمان کی طرف انگلی اُٹھائی اور کہا۔

"میم صاحب! یہ خدا کی تقدیر ہے۔ خدا کی امانت تھی، خدا لے گیا، اس میں غمزدہ ہونے کی کیا بات ہے؟ ہمیں تو ہر حال میں خدائے غفور کا شکر ادا کرنا واجب ہے"

لیڈی بارلس اتنا کہہ کر رُک گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اس نے کوئی نہایت ہی عجیب معجزہ بیان کیا ہے اور اب وہ زبانِ حال سے مجھ سے یہ مطالبہ کر رہی تھی کہ میں بھی اس کے ساتھ مل کر حیرت کا اظہار کروں۔ میں نے کہا،

لیڈی صاحبہ! پھر؟

لیڈی نے پھر اپنا قصّہ شروع کیا اور کہا، "ڈاکٹر صاحب! بڈھے کا آسمان کی طرف انگلی اٹھانا ہمیشہ کے لیے میرے دل میں پیوست ہو گیا۔ میں بار بار اس کے الفاظ پر غور کرتی تھی اور حیران تھی کہ الٰہی، اس دنیا میں اس قسم کے صابر، شاکر اور مطمئن دل بھی موجود ہیں۔ مجھے بڑی کاوش یہ تھی کہ بڈھے نے ایسا پُر استقامت دل کیسے پایا؟ اسی غرض سے میں نے پوچھا، کیا مرحوم کے اہل وعیال بھی تھے؟ وہ کہنے لگا "ایک چھوٹا بچہ ہے اور ایک بیوی ہے"۔ بڈھے کے اس جواب نے میری حیرت کو کم کر دیا۔

میں نے بڈھے کے اطمینان قلب کی یہ تاویل کی کہ چونکہ پوتا موجود ہے۔ اس واسطے وہ اس کی زندگی اور محبت کا سہارا ہوگا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب! میں نے اس تاویل سے اگرچہ اپنے دماغ کو بہلا لیا مگر میرے دل کو اطمینان نہ ہوا اور میں برابر اس پڑتال میں لگی رہی کہ کسی طرح اپنے بڈھے ملازم کے دل کی صحیح کیفیت سمجھوں۔

واقعہ کے تھوڑے ہی دن بعد، یتیم بچے کی ماں بھی چل بسی۔ اس سے میرے دل کو بہت تکلیف ہوئی، بڈھے کی بہو کا غم میری عقل پر چھا گیا، مگر ٹھیک اسی وقت میری وہ قدیم تڑپ بھی جاگ اٹھی اور میں نے خیال کیا کہ بڈھے کے امتحان کا اصل وقت یہی ہے۔ میرے دل پر اس کی طویل خدمت گزاریوں کا اثر تھا۔ اس کے نوجوان فرزند کے انتقال کے بعد اب اس کی بہو کی موت اور اس کے پوتے کی یتیمی نے اس اثر کو اور بھی زیادہ چمکا دیا تھا۔ لیکن اس فطری اور رسمی ہمدردی اور دلسوزی کے علاوہ اصل چیز جو میری دلچسپیوں کا حقیقی مرکز تھی، یہ تھی کہ میں بڈھے کی کیفیت قلب کا صحیح اندازہ کروں؟ میں دوسرے دن بڈھے کے گاؤں کو، جو بالکل قریب ہی تھا، روانہ ہوئی۔ اس وقت جذبات و تخیلات کی ایک بے تاب کائنات میرے ہم رکاب تھی۔ میں ہر ایک قدم پر یہ خیال کرتی تھی کہ اس تازہ مصیبت نے بڈھے کے دل کی حالت کو بدل دیا ہوگا۔ وہ کبھی اپنی ضعیفی اور نادار حالی پر غور کرتا ہوگا۔ پھر اپنے یتیم پوتے کی کم سنی کو دیکھتا ہوگا اور غم میں ڈوب جاتا ہوگا مگر دوسرے ہی قدم پر یہ سوچنے لگتی تھی، جب اس کا معصوم، کمسن اور لاوارث پوتا ماں اور باپ کے فراق میں بلبلاتا ہوگا تو وہ کس طریقے سے اُس کے اور اپنے دل کا اطمینان

کرے گا؟ وہ اس کے والدین کی قبروں کو کہاں چھپائے گا؟ وہ اس کے آنسوؤں کی جوابدہی سے کیونکر عہدہ برا ہوگا؟ وہ اپنی ضعیفی اور اپنے پوتے کے تاریک مستقبل پر کیا پردہ ڈالے گا؟ ان تمام سوالات نے میرے دل اور دماغ کے لئے جو قطعی فیصلہ مہیا کیا، یہ تھا کہ بڈھے کا وہ پہلا صبر و استقامت ختم ہو چکا ہوگا۔ میں اسی فیصلے کو ساتھ لے کر بڈھے کے گھر میں داخل ہوئی اور اس کی تازہ مصیبت پر افسوس کا اظہار کیا اور اُسے اپنی ہمدردی کا یقین دلایا بڈھا نہایت ہی امن و سکون سے میری دردمندانہ باتیں سُنتا رہا لیکن جب اس کے جواب کی نوبت آئی تو اُس نے پھر اپنی انگلی آسمان کی طرف اُٹھا دی اور کہا "میم صاحب! خدا کی تقدیر میں کوئی شخص دم نہیں مار سکتا، اُسی نے دیا تھا اور وہی لے گیا، ہمیں ہر حال میں اس کا شکریہ ادا کرنا واجب ہے۔"

لیڈی بارلس بڈھے کے الفاظ نقل کرنے کے بعد پھر رُکی، گویا کہ وہ مجھ سے ان الفاظ کی داد طلب کر رہی تھی۔ اس نے تھوڑا تامل کیا، ایسا تامل جس میں ایک قسم کی محویت ملی ہوئی تھی۔ لیڈی بارلس نے اپنے سلسلہ کلام کو پھر شروع کر دیا اور کہا "ڈاکٹر صاحب! میں جب تک بڈھے کے پاس بیٹھی رہی، نہ اُس کے سینے سے آہ نکلی، نہ آنکھ سے آنسو گرا اور نہ زبان پر افسوس کا لفظ آیا۔ وہ اس طرح اطمینان کی باتیں کرتا تھا کہ گویا اس نے اکلوتے بیٹے اور بہو کو زمین میں دفن نہیں کیا بلکہ اپنی زندگی کا کوئی بڑا فرض ادا کیا ہے۔ تھوڑا عرصہ بعد میں وہاں سے واپس آ گئی۔ میں بڈھے کی پختگیِ ایمان پر بالکل حیرت زدہ تھی۔ میں بار بار غور کرتی تھی اور تھک جاتی تھی مگر مجھ پر یہ معمّا حل نہیں ہوتا تھا کہ اس درجہ مصیبت میں کسی انسان کو یہ استقامت حال کیسے نصیب ہو سکتی ہے؟

چند روز کے بعد اس کا معصوم پوتا بھی گذر گیا۔ اس اطلاع کے بعد میں نے اپنی اندازہ شناسی کی تمام قابلیتوں کو نئے سرے سے اپنے دماغ میں جمع کیا تاکہ اس کے حال کا اندازہ کروں۔ میں بڑی بیقراری کے عالم میں اس کے پاس گاؤں پہنچی، مجھے یقین تھا کہ اب لاوارث بڈھا اپنی تمام دُنیا کو ختم کر چکا ہوگا۔ اس کے حواس، ہوش و حواس سے بیگانہ ہوں گے، اس کا دل و دماغ معطل ہوگا اور یاس اس کی امید کے تمام رشتے منقطع کر چکی ہوگی۔ انہی احساسات کو ساتھ لے کر میں بڈھے کے مکان میں داخل ہوئی اور نہایت ہی دلسوزی سے اس کے مصائب پر غم کا اظہار کیا لیکن مجھے یہ معلوم کر کے ازبسکہ حیرت ہوئی کہ میرے اظہار افسوس کا بڈھے کے دل پر کچھ بھی اثر نہ تھا۔ وہ بڑی بے تکلفی سے بیٹھا تھا اور نہایت ہی غیر متاثر حالت میں میری گفتگو سُن رہا تھا۔ جب میری گفتگو ختم ہو گئی تو بڈھے نے زبان کھولی اور اس نے پہلے کی طرح پھر اپنی اُنگلی آسمان کی طرف اُٹھا دی، اور کہا "میم صاحب! یہ خدا کی حکمت کے کھیل ہیں، جو کچھ اس نے دیا تھا، واپس لے لیا، اس میں ہمارا کیا تھا، جس پر ہم اپنے دل کو بُرا کریں؟ بندے کو ہر حال میں اپنے پروردگار کا شکر ادا کرنا واجب ہے۔ ہم مسلمانوں کو یہی حکم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا پر صبر کریں۔"

اب لیڈی بارلس دردِ دل کی کیفیتوں سے لبریز تھی، اس نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھایا اور روتی ہوئی آواز میں کہا "ڈاکٹر صاحب! بڈھے کا یہ جواب، میرے لئے قتل کا پیغام تھا، اس کی انگلی آسمان کی طرف اُٹھی ہوئی تھی اور نشترِ غم بن کر میرے دل کو کرید رہی تھی، اب میں نے اس مردِ ضعیف کی پختگیِ ایمان کے سامنے ہمیشہ کے لئے اپنا سر جھکا دیا اور

مجھے یقین حاصل ہوگیا کہ بڈھے کا یہ اطمینانِ قلب، مصنوعی نہیں بلکہ حقیقی ہے۔ اب میں نے کہا، اے میرے بوڑھے باپ! اب تم اکیلے اس گاؤں میں رہ کر کیا کرو گے؛ میرے ساتھ ہوٹل میں چلو اور آرام سے زندگی بسر کرو۔ بڈھے نے میری اس عزت کا شکریہ ادا کیا اور بے تکلف میرے ساتھ ہوٹل میں چلا آیا۔ یہاں وہ دن بھر ہوٹل کی خدمت کرتا تھا اور رات کو خدا کی یاد میں مصروف ہو جاتا تھا۔"

کچھ عرصہ کے بعد اس نے کہا کہ میں آج قبرستان کو جاؤں گا۔ میرے دل میں پھر وہی امتحان لینے کی شک پیدا ہوئی، دل نے کہا، یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہاں اس کے صبر و تحمل پہ کیا گذرتی ہے؛ بڈھا ہوٹل سے نکل کر اس خاموش اور ویران مقام کی طرف آیا جہاں اس کے تینوں عزیز مدفون تھے۔ میں ایک طرف کھڑی ہوگئی اور وہ قبرستان پہنچتے ہی پریشان حال قبروں کو درست کرنے میں مصروف ہوگیا۔ وہ مٹی کھود کھود کر لاتا تھا اور قبروں کو درست کرتا تھا۔ اس کے بعد وہ پانی لے آیا اور قبروں پر چھڑکاؤ کرنے لگا، جب قبریں درست ہوگئیں تو بڈھے نے وضو کیا، ہاتھ اٹھائے اور اہلِ قبرستان کے حق میں دعا کی اور واپس چل دیا۔ میں نے اس تمام عرصے میں، نہایت ہی احتیاط سے اس کی تمام حرکات کو دیکھا اور محسوس کیا کہ اس کے ہر کام میں اطمینان کا نور اور ایمان کی پختگی جلوہ گر ہے۔ اب میرے دل پہ ایک غیبی نشتر چلا اور مجھے محسوس ہوا کہ یہ بڈھے کی خوبی نہیں بلکہ یہ اس دینِ حق کی خوبی ہے جس کا یہ بڈھا پیرو ہے۔ میں نے مسلمان ہونے کا فیصلہ کر لیا اور ہوٹل میں پہنچکر بڈھے سے کہا کہ وہ کوئی ایسی عورت بلا لائے جو مجھے اسلام کی تعلیم دے۔ بڈھا فی الفور اٹھا اور اپنے محلہ کی لڑکی کو بلا لایا۔ اس نے مجھے خدا اور اس کے رسولؐ پہ ایمان لانے کی ترغیب دی اور لآ الٰہ الّا اللہ محمد رسول اللہ کا سبق سکھایا۔

ڈاکٹر صاحب! اب میں خدا تعالیٰ کے فضل و رحمت سے مسلمان ہوں اور وہی عظیم الشان قوتِ ایمان، جس سے کہ بڈھے کا دل سیراب تھا، اپنے سینے میں موجود پاتی ہوں۔ اب مجھے اپنے خدا پہ اس قدر پختہ ایمان ہے کہ خواہ کس قدر بھی مصیبت آئے میرے قدموں کو کبھی لغزش نہیں ہو سکتی۔

## جج کی بیوہ

۲۹ر اکتوبر ۱۹۳۰ء کو میں ڈاکٹر اقبال کی خدمت میں پھر حاضر ہوا، آپ آرام کرسی پہ تشریف فرما تھے۔ حقہ چل رہا تھا۔ کل کی ملاقات میں آپ دو نو مسلموں کے واقعات سنا چکے تھے، آج باقی دو واقعات سنانے کی فرمائش کی گئی تو آپ نے پہلے ایک تمہیدی تقریر ارشاد فرمائی جس کا خلاصہ یہ ہے:۔

قبولِ اسلام میں اصل چیز دل ہے۔ جہاں دل ایک تبدیلی پہ رضامند ہو جاتا ہے اور کسی بات پر قرار پکڑ لیتا ہے تو پھر باقی تمام جسم اس کے سوا کچھ نہیں کرتا کہ وہ اس تبدیلی کی تائید کے لیے وقف ہو جائے۔

ہمیں اسلام کے قدیم اور جدید مبلغوں میں ایک واضح فرق نظر آتا ہے، قدیم مبلغوں کا دار، غیر مسلموں کے دلوں پہ تھا، وہ اپنی للٰہیت، بے نفسی، خوش خلقی اور احسان و مروت کی جادو اثر اداؤں سے دلوں کو گرویدہ کرتے تھے اور اس طرح ہزاروں لوگ از خود بغیر کسی بحث و تکرار کے ان کے رنگ میں رنگے جاتے تھے مگر جدید مبلغوں کا سارا زور، دماغ کی تبدیلی پر مرکوز ہوتا ہے، وہ صداقت اسلام پر ایک دلیل دیتے ہیں، مقابلے میں دوسری حجت غیر مسلم پیش کر دیتے ہیں اس پہ

بحث و تکرار شروع ہو جاتی ہے، مسلمان اپنی بات پہ اڑ جاتا ہے، غیر مسلم اپنے قول پر تن جاتا ہے۔ اس سے ضد پیدا ہوتی ہے اور ہدایت ختم ہو جاتی ہے۔

مبلغین اسلام کو دل متاثر کرنے کے لیے نکلنا چاہیے یا دماغ؟ اس کے فیصلے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ہم فطرت کی روش کی پیروی کریں۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ فطرت، اپنی فتوحات حاصل کرنے کے لئے اپنا تعلق ہمیشہ دلوں سے جوڑتی ہے۔ فطرت کھانے میں لذت پیدا کرتی ہے اور آپ اسے بے اختیار کھا جاتے ہیں، اس وقت ایک بھی شخص دماغ سے یہ نہیں پوچھتا، کیا یہ کھانا طبی لحاظ سے مفید ہوگا؟ آپ ایک ضروری کام پہ جا رہے ہوتے ہیں کہ ناگہاں پھولوں کی ایک خوشنما زمین اور لب جو کا ایک حسین نظارہ سامنے آجاتا ہے، آپ وہاں بے اختیار بیٹھ جاتے ہیں، وہیں ٹھنڈی ہوا کا ایک دلنواز جھونکا آتا ہے اور آپ کو میٹھی نیند سلا دیتا ہے۔ اس وقت کوئی شخص بھی دماغ سے یہ نہیں پوچھتا مجھے سونا چاہیے یا نہیں؟ مختصر یہ کہ فطرت ہر کام میں اسی طرح دلوں کو گرویدہ کرکے اپنا مطلب نکالتی ہے، وہ دماغوں کی طرف کبھی متوجہ نہیں ہوتی، اسلام چونکہ سر بسر نورِ فطرت ہے اس واسطے مبلغین اسلام کو چاہیے کہ اخلاق و محبت کی گہرائیوں سے دلوں کو اس طرح شکار کریں کہ ان میں سرکشی اور انکار کی سکت ہی باقی نہ رہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ مبلغ اسلام، اسلامی کیریکٹر کی عظمت کے مالک ہوں تاکہ سرکش سے سرکش آدمی بھی ان کے سامنے اپنی گردنیں جھکا دیں۔ باقی رہے دماغی مباحث اور عقلی تکرار تو اس سے نہ تو دل مطمئن ہو سکتے ہیں، نہ منقلب ہو سکتے ہیں اور نہ فطرت رام ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا، اب دیکھئے کہ دل کی دنیا میں کیسی دلیلوں پر عمل کیا جاتا ہے؟ یہ چند ہی سال کا ذکر ہے کہ یہاں ایک ہندو جج کا انتقال ہوگیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد یکایک یہ خبر مشہور ہوئی کہ ان کی بیوہ مشرف بہ اسلام ہو رہی ہے۔ یہاں کے ہندوؤں کو قدرتی طور پر اس واقعہ سے تکلیف ہوئی۔ عورت کے عزیز و اقارب جمع ہوگئے اور اسے سمجھانے لگے۔ سب نے مل کر زور ڈالا کہ وہ مسلمان ہونے کے خیال سے دستبردار ہو جائے۔ لیکن اس تمام دباؤ کے باوجود عورت کے ارادے میں ذرا بھی تزلزل نہ آیا۔

عزیزوں کی ناکامی کے بعد دوسرا قدم جو اٹھایا گیا، یہ تھا کہ ہندو دھرم کے مذہبی پنڈت اور پیشوا بلائے گئے۔ انھوں نے کتھائیں سنائیں، تاریخی حوالے دیئے، مذہبی احکام بتائے؛ ہندو دھرم کی سچائی کی دلیلیں پیش کیں، تعلیم و تعلم کا یہ سلسلہ کئی دن تک جاری رہا مگر عورت پہ ذرا بھی اثر نہ ہوا، اس نے تمام مذہبی احکام سن لئے اور آخر میں صرف یہ کہہ دیا کہ میں ضرور مسلمان ہوں گی۔

اب آریا سماج کے مبلغ بلائے گئے، انھوں نے مخالفت کا دفتر کھولا، مسلمانوں کے مظالم پیش کئے، اسلامی احکام کی تردید کی، مسلمانوں سے نفرت دلائی، اورنگ زیب اور محمود غزنوی کا ذکر چھیڑا، گائے کے نام پہ اپیل کی، یہ سلسلہ بھی کئی دن تک جاری رہا مگر عورت اب بھی اپنے ارادے پہ محکم تھی۔

تیسرا قدم یہ تھا کہ عورت کو ڈرایا گیا، زدوکوب اور قتل کی دھمکی دی گئی، خوف کے ساتھ طمع کے مناظر بھی سامنے لائے گئے، مگر اب وہ عورت اب بھی متاثر نہ ہوئی۔

اب سوال وجواب شروع ہوئے، عورت سے پوچھا گیا ـــــ تم کیوں مسلمان ہوتی ہو؟ کیا تمہیں مال و دولت کی خواہش ہے؟"

عورت نے کہا "تم دیکھ رہے ہو، میرے گھر میں کسی بھی چیز کی کمی ہے؟ پھر پوچھا گیا" تمہیں کیا کوئی نفسانی خواہش ہے؟"

"تم میری عمر کو دیکھ رہے ہو، میں تو اب چند دن کی مہمان ہوں" عورت نے جواب دیا۔

پھر پوچھا گیا "کیا کسی مسلمان مولوی یا مبلغ نے تمہیں بہکایا ہے؟"

"میں زندگی بھر کسی مسلمان مولوی سے نہیں ملی" عورت نے جواب دیا۔

"پھر کوئی اسلامی کتاب پڑھی ہوگی" رشتہ داروں نے پوچھا۔

"میں نے کوئی اسلامی کتاب دیکھی بھی نہیں"۔ عورت نے کہا۔

اب لوگ متعجب ہوئے اور انھوں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا، "تو پھر تم کیوں مسلمان ہوتی ہو؟"

عورت نے کہا "میرے پتی سالہا سال تک سب جج رہے، وہ بیسیوں شہروں میں گئے اور میں بھی ان کے ساتھ تھی، جس جگہ میں گئی، ہمیشہ اعلیٰ خاندان کی ہندو عورتوں کے ساتھ ہمارا تعلق رہا۔ مسلمان عورتیں بھی کبھی ہمارے گھر میں آتی تھیں مگر یہ سب خدمتگار ہوتی تھیں۔ کبھی اصطبل کے بہشتی کی بیوی ہمارے ہاں آجاتی، کبھی دھوبن کی لڑکیاں آجاتیں، کبھی کسی مسلمان لوہار کی لڑکی کو ہم خود بلا لیتے تھے۔ بس اس سے زیادہ اسلام اور مسلمانوں کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں ہے"۔

سامعین میں ذرا امید پیدا ہوئی اور انھوں نے کہا "پھر تو کوئی وجہ نہیں کہ تم مسلمان ہو جاؤ"۔

عورت نے بیان کیا "بے شک! جن مسلمان عورتوں سے میں ملی، وہ اکثر غریب محتاج اور میلی تھیں۔ متمول گھرانے کی مسلمان عورتوں سے ملنے جلنے کا مجھے اتفاق نہیں ہوا مگر ہندو عورتیں جن کے ساتھ رات اور دن میری نشست و برخاست تھی، سب امیر، متمول اور روشن خیال تھیں۔ اس تفاوت کے باوجود میں نے ہر جگہ ہندو اور مسلمان عورتوں میں ایک واضح فرق دیکھا ہے"۔

اس آخری جملے پر تمام سننے والوں کے دل دھڑکنے لگے، سب کی نگاہیں بے اختیار عورت کی طرف جھک گئیں۔ ہر شخص حیرت و اضطراب کی تصویر بن گیا اور دوسرے جملے کا انتظار کرنے لگا۔ عورت نے اپنے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا "فرق یہ کہ میں جس قدر بھی ہندو عورتوں سے ملی ہوں، ان کے جسموں سے مجھے ایک قسم کی بو محسوس آئی۔ گرمی کے ساتھ یہ بھی میں نے ہر جگہ دیکھا کہ غریب سے غریب مسلمان عورتوں کے جسم میں بھی یہ بو موجود نہ تھی۔ میں اپنے پتی کی زندگی سے لے کر اب تک اس تفاوت پر غور کرتی رہی ہوں، لیکن سبب معلوم نہیں کر سکی۔ اب چند روز ہوئے، میں نے اس راز کو معلوم کر لیا ہے۔ میں نے معلوم کر لیا ہے کہ مسلمان چونکہ خدا پرست اور ایمان دار ہیں اور اُن کی روح پاک ہے اس واسطے ان کے جسموں سے بو نہیں آتی۔ وہ صاف کپڑے پہنیں یا ناصاف،

ان کے جسم ضرور بُو سے پاک ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے بر خلاف ہندو چونکہ مُشرک ہیں اور ان کی رُوح پاک نہیں ہے اس واسطے خواہ وہ کس قدر بھی صاف اور پُرتکلف لباس پہنیں، ان کے جسم بُو سے پاک نہیں ہوتے۔ اس اعلان کے بعد عورت کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں، اس کے چہرے پر جوش ایمان کی سرخیاں دوڑنے لگیں اور اس نے بھرّائی آواز میں اپنے رشتہ داروں کو متنبہ کیا" مجھے اپنے حال پر چھوڑ دو، میں اسلامی توحید کے نور سے اپنی رُوح کو پاک کرنا چاہتی ہوں اس واسطے میں ضرور مسلمان ہوں گی" اسی وقت عورت نے اپنے غضبناک رشتہ داروں کے سامنے کلمہ پڑھا۔ وہ عورت کے بیان پر بہت سٹپٹائے مگر کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکے عورت اپنے اصرار پر قائم رہی اور بالآخر مسلمان ہو گئی۔

## ایمان کا گواہ

"ڈاکٹر صاحب! اب چوتھی کہانی" میں نے کہا۔

"پہلے تمہید سُن لیجئے" ڈاکٹر اقبال نے فرمایا۔

شاید بعض لوگ یہ سمجھتے ہوں گے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اب تبلیغ دین نہیں فرماتے، ایسا سمجھنا مذہب عشق میں داخل خطا کاری ہے۔ رسول اللہ کی کوئی قوت ایسی نہ تھی جسے وقتی یا زمانی سمجھا جائے۔ حضورؐ قیامت تک کے لیے پیشوائے انسانیت ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ حضورؐ کی ہر قوت قیامت تک کارفرما رہے گی، حضورؐ کا جلال بھی قیامت تک کار فرمائی کرے گا اور جمال بھی، آپؐ قیامت تک کے مجاہد ہیں، قیامت تک کے مبلغ ہیں۔ قیامت تک کے مصلح ہیں اور قیامت تک کے رحمۃ اللعالمین ہیں بلکہ اس سے بھی آگے، بہت دُور تک۔ حضورؐ کی شخصیت مبارک موجود ہو یا نہ ہو، حضورؐ کا روحانی فیض آپ کے وجود یا جود ہی کی طرح زندگی کے ہر میدان میں کار فرما رہتا ہے یہ دوسری بات ہے کہ ہماری روحانیت اس قدر لطیف نہیں ہے کہ اپنے زندہ رسولؐ کے زندگی بخش فیوض کے عمل و دخل کو محسوس کر سکیں۔ اگر کوئی اندھا، سورج کو محسوس نہیں کرتا تو اس سے سُورج کی عدم موجودگی ثابت نہیں ہو سکتی۔

سوال صرف روحانی مناسبت کا ہے۔ جہاں کوئی روح مناسب قابلیت حاصل کر لیتی ہے، اُس پر اُسی وقت بلا تاخیر رسول اللہ کے روحانی فیض کا آفتاب طلوع ہو جاتا ہے اور اسی وقت وہ محسوس کر لیتا ہے کہ رسول اللہ زندہ ہیں۔ سرکار دو عالمؐ بنفس نفیس جہاد کر رہے ہیں، تبلیغ بھی فرما رہے ہیں اور بھولے ہوؤں کو راستے بھی بتا رہے ہیں اور گرتے ہوئے گنہگاروں کو تھام بھی رہے ہیں۔

اب آپ رسول اللہ کے فیض روحانی کی کار فرمائی کو واقعاتی رنگ میں دیکھیں۔

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا: کچھ عرصہ ہوا، ایک دولت مند، تعلیم یافتہ، روشن خیال اور کاروباری ہندو، مولانا اصغر علی صاحب روحی پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور کے پاس آیا۔ اس نے مولانا سے درخواست کی" آپ ایک الگ کمرے میں آ جائیں"۔ مولانا اس کی درخواست کے مطابق تنہا کمرے میں چلے آئے اور فرمایا" کیا ارشاد ہے"؟ نووارد نے کہا" مولانا! مجھے مسلمان بنا لیجئے"۔ مولانا نے اسلام کی تلقین کی۔ خدا کی وحدت اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا

اقرار کیا اور پوچھا کہ آپ اس طرح تنہائی میں کیوں داخل اسلام ہوتے ہیں؟

نووارد نے بیان کیا، میں نے کوئی اسلامی کتاب نہیں پڑھی کسی مسلمان عالم سے اسلام کو نہیں سمجھا لیکن خوش قسمتی سے کئی مرتبہ مجھے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت ہوئی ہے، اب میں حضورؐ کی محبت میں بے تاب ہوں اور اسلام قبول کرنے پر مجبور ہوں۔

مولانا نے پوچھا پھر آپ فیروز پور سے چل کر لاہور کیوں آئے اور کھلے بندوں کیوں اسلام قبول نہ کیا؟ نووارد نے اس سوال کے جواب میں اپنی تعلیم، ملازمت کا روبار اور جائداد وغیرہ کے حالات مولانا کے سامنے بیان کئے اور کہا" ان حالات کی بنا پر میں اعلان کرنے سے مجبور ہوں لیکن میں آپ کو اپنے اسلام پر گواہ بنانے آیا ہوں۔ میں اللہ کی وحدت اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لاتا ہوں۔ آپ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں میرے ایمان کی شہادت دیجئے، میری یہ عرصے سے آرزو تھی کہ میں اس دنیا میں کسی نیک مسلمان کو اپنے ایمان کا گواہ بنا لوں۔ خدا کا شکر ہے کہ آج میری یہ آرزو پوری ہوئی"۔

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا، ان چار واقعات سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ خداوند پاک کیسے کیسے نامعلوم دروازوں سے خلق خدا کو اسلام کی طرف کھینچ رہا ہے۔ یہ چار واقعات مجھے معلوم تھے۔ ملک کے ہر حصے میں اسی قسم کے صدہا واقعات روزمرہ پیش آرہے ہیں۔ ایسے تمام واقعات کو ایک کتاب میں جمع کر دیا جائے تو اس سے اشاعتِ اسلام کے کام کو بے حد تقویت حاصل ہو سکتی ہے۔

(اسلام زندہ باد)

## (کرنل صلاح الدین گوہر حزیں)

### قسمت بادہ باندازہ جام

۱۹۳۵ء کا ذکر ہے میں علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہو کر تلاش معاش کے سلسلے میں لاہور اپنے نانا مرحوم کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ والد مرحوم بھی کچھ روز کے لیے رخصت پر لاہور آئے ہوئے تھے۔ میرے نانا مرحوم کو فارسی شاعری سے گہری نسبت تھی۔ خود تو شعر نہیں کہتے تھے لیکن شعر کا ذوق بہت اچھا تھا۔ والد مرحوم خود فارسی کے اچھے شاعر تھے۔

ایک روز نانا مرحوم کی کوٹھی کے پائیں باغ میں والد صاحب، میں اور نانا مرحوم بیٹھے ہوئے تھے۔ باتوں باتوں میں شعر و سخن کا ذکر شروع ہو گیا۔ والد صاحب نے علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مشہور شعر پڑھا ؎

ہست ایں میکدہ و دعوت عام است اینجا
قسمت بادہ باندازہ جام است اینجا

شعر سن کر نانا مرحوم بے ساختہ داد دینے لگے۔ والد مرحوم نے بھی جھوم جھوم کر شعر دہرایا۔ میں خاموش رہا۔ نانا مرحوم اور والد صاحب کی وارفتگی کو دیکھ کر مسکرا دیا۔ مجھے مسکراتا دیکھ کر نانا مرحوم مجھ پر برس پڑے۔ شاعر کہتے ہو اپنے آپ کو۔ ایم اے پاس کرنے کے بعد بھی گدھے کے گدھے ہی رہے۔ اتنا اچھا شعر پڑھا ہے

تمہارے والد نے اور تم داد دینے کی بجائے مسکرا رہے ہو۔ غور تو کرو کتنا اچھا شعر ہے علامہ کا۔

مجھے کچھ شرارت سوجھی اور میں نے غیرارادی طور پہ کہہ دیا "مجھے یہ شعر پسند نہیں آیا۔"

"کیا کہتے ہو؟ سُنا نہیں تم نے شاید!" نانا اس طرح چلّائے جیسے میں نے قرآن کی کسی آیت کو جھٹلا دیا ہو۔

"مجھے شعر میں بیان کیے ہوئے نظریے ہی سے اختلاف ہے۔" میں نے مزید شرارت کی۔

"کیا اختلاف ہے آپ کے علی گڑھی نظریے کو علامہ کے اس پیارے سے شعر سے؟" والد مرحوم بھی بگڑے۔

"تضاد ہے علامہ کے اس شعر میں!" میں نے یونہی بے سوچے سمجھے کہہ دیا۔

"کیا تضاد ہے؟" نانا غصّے میں چلّائے۔

میری شرارت دھری کی دھری رہ گئی۔ شرارت سے کہے ہوئے جملے گلے کی پھانس بن گئے۔ کہاں علامہ کا بصیرت افروز شعر، میں کیا تنقید کر سکتا تھا حکیم مشرق کے شعر پہ۔ میں خاموش ہو کر بوٹ کی ٹو سے زمین کریدنے لگا۔

"کہو نا کیا اعتراض ہے تمہیں اس شعر پہ؟" نانا گرجے

میں نے یوں ہی بات بنانے کے لیے کہہ دیا "علامہ نے ایک دعوت عام دے کر دوسرے مصرعے میں دو قیدیں لگا دی ہیں۔ کہاں دعوت عام، کہاں قسمت بادہ اور وہ بھی باندازۂ جام۔ دعوت عام اور قسمت بادہ تضاد نہیں تو اور کیا ہے؟"

میں ایک بے ہودہ بات بک دینے کے بعد مزید بکواس پہ تُل گیا۔ بہت دیر تک علامہ کے اس شعر پہ لے دے ہوتی رہی۔ نانا مرحوم اور والد صاحب علامہ کے پرستاروں میں تھے۔ میری شرارت کو شرارت کے رنگ میں نہ دیکھ سکے۔ بحث جاری تھی کہ میاں نظام الدین مرحوم تشریف لے آئے اور میں اپنی گلوخلاصی سے خوش ہو کر خاموش ہو رہا۔

ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ میاں صاحب نے بھی آتے ہی علامہ کا ذکر چھیڑ دیا۔ انھوں نے علامہ کی علالت کی خبر سنائی جسے سنتے ہی نانا مرحوم اور والد صاحب علامہ کی عیادت کو جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ میں نے اس وقت تک علامہ کو قریب سے نہیں دیکھا تھا۔ مجھے خود ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا اشتیاق تھا، میں فوراً تیار ہو گیا۔

شام کے کوئی پانچ بجے تھے جب ہم "جاوید منزل" پہنچے۔ میاں نظام الدین صاحب بھی ساتھ تھے۔ علامہ اپنے پلنگ پہ کوٹھی کے لان میں آرام فرما تھے۔ حقہ پلنگ کے پاس پڑا تھا۔ کچھ آرام کرسیاں پلنگ کے قریب رکھی تھیں۔ علامہ کے گلے میں تکلیف تھی۔ وہ پہلے سے بہتر تھے لیکن پھر بھی بہت ہی زیادہ کسل مند نظر آتے تھے۔

جب ہم سب کرسیوں پہ بیٹھ گئے اور مزاج پرسی ہو چکی تو علامہ نے مجھے نووارد دیکھ کر نانا صاحب سے پوچھا "یہ نوجوان کون ہیں شہزادہ صاحب؟"

"میرے بڑے لڑکے ہیں۔ علی گڑھ سے ایم اے کیا ہے۔ فکر معاش میں ہیں۔ نانا کے پاس ٹھہرے ہوئے ہیں آجکل۔" والد صاحب نے تعارف کرایا۔

میں نے نہایت ادب سے جھک کر سلام کیا۔

"اچھا ہوا مجھ سے ملنے چلے آئے۔" علامہ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔

نہ جانے نانا مرحوم کو کیا سوجھی - میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا "علی گڑھ نے اس کا دماغ خراب کر دیا ہے - گستاخ ہو گیا ہے - آپ کے شعر پر اعتراض کرتا ہے"۔

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی - مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا - میرا سر ندامت سے جھک گیا۔

"میرے کون سے شعر پر آپ کو اعتراض ہے"؟ علامہ کی آواز نے مجھے چونکایا۔

"آپ کے شعر پر میں کیا اعتراض کر سکتا ہوں؟ میں کیا اور میری بساط کیا"! میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا -

"دیکھو بیٹا! جو بات کسی کے منہ پر نہ کہہ سکو، وہ اس کی غیر حاضری میں کبھی نہ کہو - میرا شعر قرآن کی آیت تو نہیں جو اس پر اعتراض نہ ہو سکے - اگر تمہیں کوئی شک ہے تو اس کا رفع ہو جانا بہتر ہے" علامہ نے آہستہ آہستہ رکتے رکتے کہا۔

"مجھے اپنی بے ہودگی پر افسوس ہے - میں نادم ہوں" میں نے ندامت سے سر جھکائے ہوئے جواب دیا۔

"جب تک دل میں کوئی الجھن نہ ہو اعتراض لب پر آ ہی نہیں سکتا - تمہارے دل میں ضرور کوئی بات ہے - گھبراؤ نہیں - اپنا شک دور کر لو - میں بھی تو سنوں میرے کس شعر پر تمہیں اعتراض ہے" علامہ نے پیار سے کہا۔

میں نے مجبوراً علامہ کا شعر اور اس پر اپنی تنقید سنا دی - میری تنقید سن کر علامہ مسکرائے - کچھ دیر خاموش رہ کر مجھ سے یوں مخاطب ہوئے -

"مجھے افسوس ہے کہ آج کل کے نوجوان میری شراب کو اسکاٹ لینڈ کی جان ہیگ اور پٹیالہ کی زعفران سمجھتے ہیں۔ کاش وہ سمجھ سکیں کہ میں کس شراب کا ذکر اپنے اشعار میں کرتا ہوں"

"میں آپ کی شراب کو شراب توحید سمجھتا ہوں" میں نے ادب سے جواب دیا -

"شعر کہتے ہو؟" علامہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"کوشش کرتا ہوں" میں نے ادب سے کہا۔

"شراب توحید کی دعوت تم کن الفاظ میں دو گے"؟ علامہ نے مسکراتے ہوئے کہا -

میں گھبرا گیا - لیکن خدا معلوم مجھ میں اتنی جرأت کہاں سے آ گئی کہ میں نے کوئی دو تین منٹ غور کرنے کے بعد عرض کیا"

مئے توحید بہ ہر گردش جام است اینجا
قسمت بادہ کجا شرب مدام است اینجا

علامہ میرا شعر سن کر مسکرائے - مجھ سے شعر دہرانے کو کہا اور پھر فرمایا -

"تم لدھیانہ کے رہنے والے ہو - میری سسرال بھی لدھیانہ ہی میں تھی - میں اکثر لدھیانہ گیا ہوں - وہاں ایک بہت ہی مشہور مجذوب بزرگ تھے جو اپنی پھوس کی بنی ہوئی لنگوٹی کی وجہ سے بابا پھوس والے کے نام سے مشہور تھے - میں نے بابا پھوس والے کو دیکھا ہے - شاید تم نے بھی دیکھا ہوگا - جانتے ہو بابا پھوس والے کا یہ حشر کیوں ہوا؟ اگر نہیں، تو سنو - بابا پھوس والے مئے توحید کی دعوت میں شریک ہوئے - ان پر قسمت بادہ اور اندازۂ جام کی قید نہ تھی - اگر مئے توحید پر قسمت بادہ اور اندازۂ جام کی قید نہ ہو، تو حال وہی ہوتا ہے جو بابا پھوس والے کا ہوا - حضرت مجدد الف ثانی رح بھی مئے توحید کی دعوت عام

میں شریک ہوئے لیکن اس دعوت عام میں قسمت بادہ اور اندازۂ جام کی قید تھی۔ ان کا حشر بابا بھوس والے جیسا نہیں ہوا۔ مئے توحید کے لئے اندازۂ جام ضروری ہے۔"

یہ کہہ کر علامہ رحمۃ اللہ علیہ خاموش ہوگئے اور مسکراتے ہوئے کچھ دیر بعد فرمایا۔

"بیٹا! میں خوش ہوں کہ تمہارا شک رفع ہوگیا۔ اور ہاں اپنے رنگ میں تمہارا شعر اچھا ہے۔ غزل مکمل کرو۔"

میں نے اُٹھ کر علامہ کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور کہا "میں ایک بار پھر معافی چاہتا ہوں۔ شعر پہ اعتراض صرف میری شرارت تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج آپ کا شعر ذہن نشین ہوگیا ہے اور اب پہلے سے بھی زیادہ دلکش اور معنی خیز ہے آپ نے کیا خوب تشریح فرمائی۔"

تھوڑی دیر بیٹھ کر ہم واپس چلے آئے۔ علامہ سے میری یہ پہلی اور آخری ملاقات تھی اور یہی میری زندگی کا حاصل اور سرمایۂ حیات ہے۔

(فضل کریم خاں درّانی)

علامہ مرحوم سے میری گفتگو عموماً دینی یا سیاسی مباحث پر ہوا کرتی تھی۔ اس لیے اندرہ اختصار امرمرف دو ایک لطیفوں پہ اکتفا کروں گا جن سے اقبال کی سیرت اور عقاید پہ روشنی پڑتی ہے۔

## آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق

۱۹۳۵ء کے موسم گرما میں ختم نبوت کی بحث گرم تھی۔ علامہ مرحوم نے اس سال کے ماہ مئی میں قادیانیوں کے خلاف ایک بیان دیا تھا جس نے اس جماعت کے دونوں فریقوں کو ڈاکٹر صاحب سے ناراض کردیا تھا اور انھوں نے ایک لایعنی بحث چھیڑ دی تھی۔ یاد نہیں علامہ مرحوم نے کس غرض سے مجھے طلب فرمایا تھا۔ اتنا یاد ہے کہ گفتگو زیادہ تر ختم نبوت کے مسئلہ پہ ہوئی تھی۔ آپ نے مقام نبوت پہ اظہار خیال کرتے ہوئے حضرت ابوبکر صدیق رضہ کی سیرت سے ایک واقعہ بیان فرمایا۔ اور کہا۔ حضرت ابوبکرؓ سے کسی نے پوچھا۔ کیا آپ کو اللہ تعالےٰ کے ساتھ زیادہ محبت ہے یا اللہ کے رسولؐ کے ساتھ؟ ایک خشک زاہد تو عموماً یہی جواب دے گا کہ مجھے اللہ کے ساتھ زیادہ محبت ہے۔ کیونکہ رسولؐ کے ساتھ زیادہ محبت اس کے نزدیک شرک ہوگا لیکن حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا۔ مجھے اللہ کے رسولؐ کے ساتھ زیادہ محبت ہے۔ کہنے لگے۔ رسول اللہ کی بعثت سے پہلے ہم بھی یہیں تھے اور اللہ بھی یہیں تھا نہ اس نے ہم کو پوچھا نہ ہم نے اس کو پہچانا۔ اب جو اللہ کا رسولؐ آگیا تو ہم نے اللہ کو پہچان لیا اور اللہ نے بھی ہم کو پہچان لیا۔

علامہ نے فرمایا۔ میں نے یہ واقعہ شعر میں بیان کیا ہے۔ چنانچہ آپ نے دو شعر سنائے۔ علامہ مرحوم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق تھا اور میرا ایمان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق ایک انسان کی نجات کے لیے کافی ہے۔ آپ نے ایک شعر تو صاف پڑھ لیا۔ تیسرے مصرع پر رقت طاری ہوئی گھگی بندھ گئی۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور بڑی مشکل سے شعر پورا کیا۔ یہ شعر رموز بیخودی میں ہیں ؎

معنیٔ حرفم کنی تحقیق اگر      بنگری بادیدۂ صدیقؓ اگر
قوت قلب و جگر گردد نبیؐ      از خدا محبوب تر گردد نبیؐ

**الارض للّٰہ** علامہ مرحوم نے ایک دن ذیل کا لطیفہ بیان فرمایا :۔
جنگ سے غالباً پہلے یا شاید جنگ کے دنوں کا واقعہ ہے پنجاب گورنمنٹ اہار پہ مربعہ جات تقسیم کر رہی تھی۔ میں ان دنوں انار کلی میں رہا کرتا تھا۔ ایک دن مغربی پنجاب کے ایک پیر صاحب تشریف لائے۔ عموماً آیا کرتے تھے۔ شریف آدمی تھے اور میری ان کی دیرینہ ملاقات تھی۔ (ڈاکٹر صاحب نے ان پیر صاحب کا نام و مقام بھی بتایا۔ مگر مجھے یاد نہیں رہا) کہنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب! مجھے ایک درخواست لکھ دیں کہ مجھے بھی کچھ مربعے دیئے جائیں۔ میں نے کہا۔ یہ بھی آپ نے دریافت کر لیا ہے کہ زمین کس کی ہے؟ پیر صاحب میرے سوال سے کچھ پریشان سے ہو گئے اور جلدی میں کہنے لگے۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ میں نے کہا۔ پہلے آپ یہ دریافت کر آئیں کہ زمین کس کی ہے۔ پھر میں درخواست لکھ دوں گا۔ چنانچہ پیر صاحب چلے گئے۔ دوسرے دن پھر آئے اور کہنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب! مجھے آپ کا سوال سمجھ میں نہیں آیا۔ زمین گورنمنٹ دے رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ زمین گورنمنٹ کی اپنی ہی ہو گی۔ میں نے کہا۔ شاہ صاحب ایک کتاب ہے بہت پرانی۔ اس کو لوگ قرآن کہتے ہیں۔ ایک شخص ہمارے یہاں سے دور ملک عرب میں ہوا ہے۔ اس کا نام محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تھا۔ یہ کتاب اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی تھی۔ اس کتاب میں لکھا ہے کہ زمین خدا کی ہے۔ اب آپ فرمائیں تو میں اللہ تعالیٰ کے نام چھٹی لکھ دیتا ہوں۔

پیر کے سینے میں ایمان کی روشنی باقی تھی۔ وہ بے حد متاثر ہوئے۔ رو پڑے اور کہنے لگے ڈاکٹر صاحب! کوئی درخواست نہ لکھیں۔ میں زمین کے لئے انگریز سے درخواست نہیں کروں گا۔

اتفاق سے پیر صاحب کو دلی جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں فوج میں ان کے بہت سے مرید تھے۔ انھوں نے پیر صاحب کی ضیافت کی۔ جس میں اپنے افسروں کو بھی بلایا جن میں کمانڈر ان چیف بھی تھا۔ کھانے کے بعد یکایک ایک مرید نے اُٹھ کر تقریر کی کہ ہم سب لوگ ان پیر صاحب کے مرید ہیں۔ ہمارے پیر کو زمین ملنی چاہیئے کیونکہ ان کے لنگر کا خرچ بہت زیادہ ہے۔ فوجی افسر سادہ لوح ہوتے ہیں اور ان کو اپنے سپاہیوں کی مدارات کا بہت خیال ہوتا ہے۔ قصہ مختصر کمانڈر ان چیف نے اپنے طور پر پرائیویٹ لیٹر اوڈوائر لفٹننٹ گورنر پنجاب کو لکھا اور پیر صاحب کو دس مربعہ زمین بغیر درخواست کے مل گئی۔

**شانِ بے نیازی** علامہ مرحوم کچھ دن ریاست بہاول پور کے قانونی مشیر بھی رہے تھے۔ ایک دفعہ ریاست کے کسی کام پر ان کو وائسرائے سے ملاقات کے لیے دلی جانا پڑا۔ دوران ملاقات وائسرائے نے ڈاکٹر صاحب سے کہا۔ کل شام کا کھانا آپ میرے ساتھ کھائیں۔ وائسرائے کی دعوت اہل جاہ کے لیے بہت بڑی نعمت ہوتی تھی۔ اس قسم کی دعوت حاصل کرنے کے لئے بڑے بڑے جتن کیے جاتے تھے۔ پھر ان دعوتوں کا اشتہار اخباروں میں شائع ہوتا تھا۔ سرکاری گزٹ نکلتا تھا اور جن کو یہ نعمت حاصل ہو جاتی تھی وہ اس گزٹ کو حرزِ جاں بنا کے رکھتے تھے اور پشت در پشت اس گزٹ کی حفاظت کرتے تھے لیکن

گدائے میکدہ کی شانِ بے نیازی دیکھ  پہنچ کے چشمۂ حیواں پہ توڑتا ہے سبو

علامہ مرحوم نے والسرائے کی دعوت کا جواب دیا۔ میں کل تک نہیں ٹھہر سکتا۔ میں تو آج شام کو لاہور واپس چلا جاؤں گا۔ والسرائے نے اصرار کیا کہ ایک دن اور ٹھہر جاؤ۔ کل چلے جانا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ اگر آپ کو کھانا کھلانے پر بہت اصرار ہے تو آج شام کو کھلا دو تاکہ میں رات کی گاڑی میں سوار ہو سکوں۔ لیکن کل تک تو میں ہرگز نہیں ٹھہر سکتا۔ ادھر سے اصرار، ادھر سے انکار۔ آخر والسرائے مجبور ہو گیا اور پہلے کے تمام انتظامات کو درہم برہم کر کے ڈاکٹر صاحب کے لیے کھانے کا جلدی جلدی اسی دن انتظام کیا گیا اور ڈاکٹر صاحب کھانے کی رسم ادا کر کے اسی شام لاہور روانہ ہو گئے۔ لاہور پہنچے یہاں کو ریاست کی طرف سے ایک تار ملا کہ فوراً بہاولپور پہنچو۔ ڈاکٹر صاحب کو تار دیکھ کر سخت غصہ آیا۔ کہنے لگے۔ ان کم بختوں نے مجھے اپنا نوکر سمجھ لیا ہے۔ میں نہیں جاؤں گا۔ چنانچہ ایک ہزار روپیہ ماہانہ کی آمدنی پر لات ماردی اور استعفا بھیج دیا۔ (شیرازہ ۱۲ رجون ۱۹۳۸ء)

(شیخ سر عبدالقادر)

## شاعر مشرق سے میری آخری ملاقات

ڈاکٹر اقبال مرحوم کو ادبی حلقوں میں بہت سے خطاب قوم کی طرف سے یا ان کے ہمعصر عزیزوں کی طرف سے دیئے گئے ہیں جو سب اپنی اپنی جگہ موزوں ہیں مگر میں ان کے لیے "شاعر مشرق" کا خطاب خاص طور پر موزوں سمجھتا ہوں کیونکہ انہوں نے تہذیب مغرب کا پول کھول کر اہل مشرق کے دلوں سے اس رعب کو مٹانے میں بڑی کامیابی حاصل کی ہے جو اکثر مشرقی ممالک میں انگریزوں کے دلوں پر مسلط تھا اور مشرق میں یہ احساس پیدا کیا ہے کہ مشرق ہر اس بلندی پر پہنچ سکتا ہے جس پر مغرب پہنچ کر اترا رہا ہے۔

میں جب ۱۹۳۴ میں ہائی کورٹ کے کام سے سبکدوش ہو کر پانچ سال کے لیے اس وقت کے وزیر ہند کے محکمے میں لندن گیا تو میرے محترم دوست سر محمد اقبال بحیثیت مجموعی بخیریت تھے۔ ان کی علالتوں کا دور میری غیر حاضری میں شروع ہوا اور جب میں اپنے بیٹے کی شادی کی تقریب پر رخصت لے کر ۱۹۳۷ء کے اواخر میں ہندوستان آیا تو میں یہاں آنے کے جلد بعد ان سے ملنے گیا۔ جب میں پہنچا تو وہ ایک پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے اور لحاف اوڑھے ہوئے تھے مگر ان کی وسعت اخلاق کی وجہ سے اس حالت میں بھی مختلف ملنے والوں کا ایک گروہ ان کے کمرے میں کرسیوں پر ان کے قریب بیٹھا تھا۔ اس گروہ میں ایک معزز سرکاری عہدیدار اور ایک مالک اخبار اور ایک دو ایڈیٹر موجود تھے اور چند نوجوان طالب علم۔

مرحوم مجھ سے بہت محبت سے ملے اور لیٹے لیٹے مجھے گلے لگایا اور اپنی چارپائی پر ہی بٹھا لیا۔ جو ملاقاتی بیٹھے تھے وہ چند منٹ ٹھہرے اور پھر یہ سمجھ کر کہ شاید مجھے مرحوم سے بحیثیت ایک پرانے دوست کے بہت سی باتیں کرنی ہوں گی، یکے بعد دیگرے اجازت لے کر رخصت ہوتے گئے اور ہمیں آپس میں باتیں کرنے کا موقع دیا۔ ہم ابھی خاصی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ میں نے ان کی صحت کا حال پوچھا اور انھوں نے بتایا کہ اب پہلے سے بہت بہتر ہے۔ وہ مجھ سے انگلستان کے قیام کے حالات سنتے رہے اور بعض دوستوں کی بابت پوچھتے رہے اور میرے رخصت ہونے سے پہلے انھوں نے

مجھے یہ بھی دعوت دی کہ دوسرے دن میں دوپہر کا کھانا ان کے ہاں کھاؤں۔ میں نے بخوشی یہ دعوت منظور کر لی۔

دوسرے دن پھر ان کے ہاں گیا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس وقت وہ لیٹے ہوئے نہ تھے بلکہ اُٹھ کر کرسی پر بیٹھے تھے اور دو اور دوست بھی موجود تھے جو کھانے میں شرکت کے لئے مدعو تھے۔ ایک تو چودہری محمد حسین صاحب ایم اے جو اس زمانے میں ان کے معتمد رفیق تھے اور ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادہ اور صاحبزادی کی نگرانی کے فرائض ادا کرتے رہے ہیں اور جنھوں نے ان کی تصانیف کی اشاعت سے بھی مسلسل اور مستقل دلچسپی رکھی ہے۔ دوسرے صاحب ریاست بہاول پور کے ایک مشہور خاندان سادات کے رکن اور بڑے زمیندار اور رئیس تھے جن کا نام مخدوم الملک سید غلام میراں شاہ صاحب ہے۔ ان سے میری ملاقات پہلے معمولی تھی مگر اس دن یہ دیکھ کر کہ اقبال انہیں بہت پسند کرتے تھے اور اقبال کے دل مداح تھے، میری ان کی ملاقات بڑھ گئی جو بعد ازاں میرے دوران قیام بہاول پور میں اور بھی زیادہ ہو گئی۔

تھوڑی دیر میں کھانا آیا جس میں اقبال صاحب خود بھی شریک ہوئے اور کم از کم اس وقت ایسی اچھی حالت میں تھے کہ کھانا بھی انھوں نے رغبت سے کھایا اور گفتگو بھی دوران قیام بہت دلچسپ ہوتی رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یا تو ان کی طبیعت دفعتہً تندرست ہو گئی ہے یا انھوں نے میری خاطر اس دن کمزوری اور بیماری کا لباس اتار پھینکا ہے اور پورے صحت مند ہو کر بیٹھ گئے ہیں۔ طرح طرح کی باتیں ہوتی رہیں۔ مخدوم الملک صاحب چونکہ پیرزادہ تھے اور اقبال مرحوم سے بہت عقیدت رکھتے تھے، انھوں نے مجھ سے پوچھا۔

"شیخ صاحب کچھ بتا سکتے ہو کہ اس زمانے کا قطب پنجاب میں کون ہے؟"

میں نے کہا "مخدوم صاحب! یہ تو گویا آپ کی معلومات کا ہے۔ آپ ہی بتائیں۔"

انھوں نے کہا کہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اقبال صاحب ہی قطب پنجاب ہیں۔

میں نے کہا کہ آپ چونکہ اس راہ سے واقف ہیں، میں آپ کی بات مان لوں گا۔ ورنہ میں اس راہ سے بے خبر ہوں۔ البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ اقبال کے ہم نشین جن میں میں بھی شامل تھا، کبھی کبھی ان کو "قطب از جا نمی جنبد" کہہ کر چھیڑا کرتے تھے کیونکہ وہ نقل و حرکت کے معاملے میں بہت تساہل برتا کرتے تھے۔

غرض اس قسم کے مزاح و تفریح کے بعد وہ بزم مختصر برخاست ہوئی مگر ان سے رخصت ہوتے وقت یہ معلوم نہ تھا کہ میں ان کو اور وہ مجھے آخری مرتبہ دیکھ رہے ہیں۔

اس کے بعد میں بیٹے کی شادی کے کاموں میں مصروف ہو گیا اور ان سے پھر ملنے نہ جا سکا۔ اور یہ قلق دل میں رہ گیا کہ یہ خبر ہوتی تو باوجود مصروفیت کے وقت نکال کر دو چار مرتبہ اور ان سے مل لیتا۔

میں ۱۹۳۸ء کے شروع ہی میں ملازمت پر چلا گیا اور وہاں پہنچنے کے بعد اپریل کی وہ تاریخ آ گئی جس دن دست اجل نے مرحوم کے حسب دوستوں اور عزیزوں سے ان کو چھین لیا۔ خدا ان کو فردوس بریں میں جگہ دے اور ملت اسلام کو ان کے بیش بہا کلام سے مستفید ہونے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی توفیق دے۔

اب ہم ہر برس ان کی یادگار منانے کو جلسے کرتے ہیں اور جمع ہوتے ہیں۔ یہ تحریک بہت مفید ہے بشرطیکہ اس کے عملی پہلو پر بھی توجہ رہے اور مرحوم کے سب مداح ان کے پیغام پر عمل کریں۔

(محترمہ فاطمہ جناح)

## جاوید منزل میں

میں ۱۹۳۷ء میں قائداعظم کے ہمراہ لاہور آئی، تو قائداعظم کے پروگرام میں اقبال سے ملاقات بھی شامل تھی۔ میں نے اس سے پہلے اقبال کو لندن میں گول میز کانفرنس کے موقع پر دیکھا تھا۔ جب قائداعظم اقبال سے ملنے کے لیے جانے لگے تو میں نے بھی اقبال سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

جب ہم دونوں بھائی بہن جاوید منزل پہنچے تو دیکھا اقبال چارپائی ڈالے برآمدے میں ایک بڑے تکیے پر سر ٹیکے اکڑوں بیٹھے تھے۔ انہیں پہلے صرف یہی معلوم تھا کہ قائداعظم ملاقات کے لئے آئے ہیں۔ اسی لئے وہ اس بے پرواہی کے انداز میں بیٹھے رہے۔ لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ میں بھی ان کے ساتھ ہوں تو انھوں نے تکلف برتنے کی ایک کوشش کی اور لبوں پر مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے ہمیں خوش آمدید کہا اور اپنے خادم سے فرمایا کہ جاوید اور منیرہ کو بلا لاؤ۔

ہم دونوں بہن بھائی بید کی کرسیوں پر ان کے سامنے بیٹھ گئے اور اقبال پھر اسی بے تکلف انداز میں سر کو تکیے سے لگا کر خاموشی سے بیٹھ گئے۔ غالباً اس وقت ان کی طبیعت خاصی ناساز تھی۔ ان کی آواز بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کا جسم نحیف و نزار نظر آ رہا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ان کے چہرے پر جلال چمک رہا تھا۔

اس اثناء میں منیرہ اور جاوید بھی آگئے۔ منیرہ گڑیا کے مانند بالکل معصوم بچی تھی۔ جاوید کی عمر بھی یہی کوئی سات آٹھ سال ہوگی۔ میں نے منیرہ کو پیار کیا تو اقبال کہنے لگے "بچوں کا چھوٹی عمر میں مہر مادری سے محروم رہ جانا بہت دردناک بات ہے۔ میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ ان کی غور و پرداخت اور تعلیم و تربیت میرے لئے بڑا بھاری مسئلہ ہے۔ ولایت میں ایسی درسگاہیں ہیں جہاں بچوں کو والدین پورے اطمینان کے ساتھ بھیج سکتے ہیں۔ یہاں پر ایسا کوئی انتظام نہیں"۔

اس پر میں نے تسلی کے چند کلمات کہے جس پر انھوں نے فرمایا۔

"ہاں ـــ در اصل تو خدا ہی ہے جو مستقبل کا نگہبان ہے"۔

پھر قائداعظم اور اقبال میں سیاسیات پر گفتگو ہوتی رہی۔ میں نے دیکھا کہ اقبال پر مسائل کے سب گوشے بے نقاب تھے۔

ان کی صحت کے پیش نظر ہم نے زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔ ان سے رخصت لے کر ہم چلے آئے۔

پچھلے دنوں میں جب جاوید منزل میں گئی تو مجھے یہ جان کر بے حد مسرت ہوئی کہ جاوید کو یہ سارا واقعہ یاد ہے۔

---

## شاعری اور الہام

ایک مرتبہ فارمن کرسچن کالج لاہور کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر لوکس نے اقبال کو بھی اس میں شرکت کی دعوت دی۔ اجلاس کا پروگرام ختم ہونے کے بعد چائے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ لوگ چائے پینے بیٹھے تو ڈاکٹر لوکس اقبال کے پاس آئے اور کہنے لگے "چائے پی کے چلے نہ جانا۔ مجھے آپ

سے ایک ضروری بات کرنی ہے"۔ حضرت علامہ فرماتے تھے :۔

"ہم چائے پی چکے تو ڈاکٹر لوکس آئے اور مجھے اپنے ساتھ ایک گوشے میں لے گئے۔ فرمایا۔ اقبال! مجھے بتاؤ کہ تمہارا پیغمبر پر قرآن کا مفہوم نازل ہوا تھا اور چونکہ انہیں صرف عربی زبان آتی تھی انہوں نے قرآن کریم عربی میں منتقل کر دیا، یا یہ عبارت ہی اسی طرح اترتی تھی؟ میں نے کہا۔ یہ عبارت ہی اترتی تھی۔ ڈاکٹر لوکس نے حیران ہو کر کہا۔ اقبال! تم جیسا پڑھا لکھا آدمی بھی اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ یہ عبارت ہی اسی طرح اتری ہے؟ میں نے کہا۔ ڈاکٹر لوکس! یقین کیسا میرا تجربہ ہے۔ مجھ پر شعر پورا اترتا ہے تو پیغمبر پر عبارت کیوں نہیں اتری ہوگی؟ جب شعر کہنے کی کیفیت مجھ پر طاری ہوتی ہے تو سمجھ لو کہ ایک ماہی گیر نے مچھلیاں پکڑنے کے لیے جال ڈالا ہے۔ مچھلیاں اس کثرت سے جال کی طرف کھنچی چلی آ رہی ہیں کہ ماہی گیر پریشان ہو گیا ہے۔ سوچتا ہے کہ اتنی مچھلیوں میں سے کسے پکڑوں اور کسے چھوڑوں۔

یہ کیفیت تو مجھ پر سال میں زیادہ سے زیادہ دو بار طاری ہوتی ہے لیکن فیضان کا یہ عالم کئی کئی گھنٹے رہتا ہے اور میں بے تکلفی سے شعر کہتا جاتا ہوں۔ پھر عجیب بات یہ ہے کہ جب طویل عرصہ کے بعد یہ کیفیت طاری ہوتی ہے تو پہلی کیفیت میں کہا گیا آخری شعر دوسری کیفیت کے پہلے شعر سے مربوط ہوتا ہے۔ گویا اس کیفیت میں ایک قسم کا تسلسل بھی ہے۔ یا یوں کہنا چاہیئے کہ یہ فیضان کے لمحے دراصل ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب یہ کیفیت ختم ہو جاتی ہے تو میں ایک قسم کی تکان، عصبی اضمحلال اور پژمردگی سی محسوس کرتا ہوں۔

ایک مرتبہ چھ سات سال تک مجھ پر کیفیت طاری نہ ہوئی تو میں یہ سمجھا کہ خدا تعالیٰ نے مجھ سے یہ نعمت چھین لی ہے۔ چنانچہ اس زمانے میں میں نے نثر لکھنے کی طرف توجہ کی۔ یک بہ یک ایک روز پھر یہی کیفیت عود کر آئی۔ ان لمحوں میں میری طبیعت ایک عجیب لذت محسوس کر رہی تھی۔ بس ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اشعار کا ایک بحر تواج ہے کہ اُمڈا چلا آتا ہے۔ سرور و نشاط کی یہ کیفیت اتنی دیر قائم رہی کہ اس نے چھ سات سال کے جمود و تعطل (قبض) کی تلافی کر دی۔

مشہور شاعر گوئٹے کے متعلق ایک کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ جب اس نے جرمن زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ پڑھا تو اپنے بعض دوستوں سے کہا کہ میں یہ کتاب پڑھتا ہوں تو میری روح میرے جسم میں کانپنے لگتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ شاعر کو بھی ایک قسم کا الہام ہوتا ہے۔ اس لیے جب وہ کوئی آسمانی کتاب پڑھتا ہے تو اپنی روح کو اس معنویت سے ہم آہنگ پاتا ہے اور اس کی طبیعت ایک خاص اہتزاز محسوس کرتی ہے۔ یہ چیز دوسروں کو نصیب نہیں ہو سکتی۔ (روزگار فقیر ص ۳۸ - ۴۰)

مجھے خبر نہیں یہ شاعری ہے یا کچھ اور
عطا ہوا ہے مجھے ذکر و فکر و جذب و سرور

ڈاکٹر سید عبداللہ

# علامہ اقبال کی خدمت میں حاضری کے چند موقعے

میں حضرت علامہ اقبال کا وہ ارادت مند ہوں جس کی حیثیت اس شخص کی سی ہے جو مردِ کامل کے کمال یا جمال کے محض تصور یا اسکی دید ہی سے حیرت زدہ ہو جاتا ہے۔ میں ۱۹۲۶ء سے تا ایّامِ وفات، حضرت علامہ اقبال کے آستانے پر حاضر ہوتا رہا مگر پچھلی صفوں کے خاموش تماشائی کی طرح، اپنی حد سے آگے نہیں بڑھا۔ ان سے ملاقات اور گفتگو کے موقعے بھی ملے مگر ان گفتگوؤں کو کبھی چھپوایا نہیں کیونکہ مجھے اپنی کم علمی کا پورا احساس رہا۔ مبادا میں علامہ کے ملفوظات کو نقل کرنے میں ٹھوکر کھا جاؤں۔

براہِ راست ملاقاتیں بہت ہوئیں جن کے مدھم تاثرات میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ مگر دو تین غیر معمولی موقعے ایسے بھی ملے جن کی یاد آج تک محو نہ ہوئی اور مجھے اُمید ہے کہ ان کا تذکرہ فائدے سے خالی نہ ہوگا۔

(۱)

میں پہلی مرتبہ ۱۹۲۶ء میں علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہُوا اور براہِ راست ان سے بات چیت کرنے کا موقع ملا۔ میں اس زمانے میں، پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں قلمی کتابوں کی تفصیلی فہرست بنانے پر مامور تھا۔ اور میرے کام کے نگران پروفیسر محمد شفیع، پروفیسر محمد اقبال اور حافظ محمود خاں شیرانی تھے۔ پروفیسر محمد شفیع نے مجھے حکم دیا کہ میں فخری بن امیری کا انتخاب شعرائے فارسی لے کر حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوں اور انہیں وہ کتاب دکھا آؤں۔ اس کتاب کا نام "تحفۃ الحبیب" ہے۔ اس میں مصنف نے فارسی شاعروں کی غزلیات کو اس طریق سے جمع کیا ہے کہ مختلف شعرا کی ہم طرح غزلیں یکجا ہو گئی ہیں۔

حضرت علامہ نے مجھ سے کتاب لی اور ورق گردانی شروع کر دی۔ ساتھ ساتھ پنسل سے اشعار پر نشان لگاتے گئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ انتخابِ اشعار پروفیسر شفیع صاحب کی فرمائش پر کیا جا رہا تھا۔ شاید شفیع صاحب اس زمانے میں فارسی نصاب مرتب کر رہے تھے (جو بعد میں "سبد گل" اور "گلشن معانی" کے نام سے چھپا) اور چاہتے تھے کہ اس انتخاب میں حضرت علامہ کے ذوق کی رہنمائی سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اس انتخاب میں ایک گھنٹے سے زیادہ وقت انھوں نے صرف کیا ہوگا۔ جب فارغ ہوئے تو مجھ سے دریافت کیا "بھئی، فارسی کے طالب العلم ہو یا عربی کے؟"

میں نے عرض کیا ایم اے۔ فارسی میں کیا ہے مگر عربی مسجدوں میں پڑھی ہے۔

فرمایا عربی والا جب فارسی میں آتا ہے تو فارسی اس کے لئے مشکل نہیں رہتی۔
وہ فرماتے گئے میں خاموشی سے سنتا رہا۔ اور سچی بات یہ ہے کہ مجھے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ میں ان کی باتوں کا کیا جواب دوں۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھ سے فرمایا۔ یہ کاغذ لو اور اس پہ خواجہ حافظ اور جامی کی یہ غزلیات لکھ دو جن کے مطلع یہ ہیں۔

شاہ شمشاد قداں خسرو شیریں دہناں     کہ بمژگاں شکند قلب ہمہ صف شکناں     حافظ

---

اے ہمہ سیم براں سنگ تو بر سینہ زناں     تلخ کام از لب مے گون تو شیریں دہناں     جامی

اس اثنا میں وہ گنگناتے رہے۔ جب میں لکھ چکا تو فرمایا "تم فارسی کے فارغ التحصیل ہو۔ بتا سکتے ہو ان میں سے کون سی غزل اچھی ہے۔
میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا جواب دوں۔ بہر حال میں نے عرض کیا کہ حافظ کی غزل اچھی ہوگی۔
فرمایا "یہ حافظ کی جادوگری کا اثر ہے۔ ورنہ شیراز اور خراسان کا فرق تو واضح ہے۔ شیرازی میٹھی باتوں سے دلوں کو لبھا رہا ہے اور ہرات والا کوہستانی لہجے میں بات کہہ رہا ہے اور ہم لوگوں کو کوہستانی لہجے کی اب زیادہ ضرورت ہے۔
اس کے بعد جامی کی غزل تحت اللفظ پڑھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی رگ رگ میں شعر اثر کر رہا ہے۔
اس کے بعد مجھے رخصت ہونے کی اجازت دی اور فرمایا کہ "پروفیسر شفیع سے کہنا مجھ سے ذرا مل لیں"۔

(۲)

علامہ اقبال کی خدمت میں حاضری کا دوسرا موقعہ مجھے ۱۹۳۰ء میں ملا۔ لاہور میں ہم لوگوں نے ایک مجلس اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے نام سے قائم کر رکھی تھی — خواجہ عبدالوحید صاحب (مصنف کتابیات اقبال) اس کے سیکرٹری تھے۔ ہم نے ارادہ کیا کہ علامہ اقبال کی تعلیمات کو عام کرنے کے لئے یوم اقبال منایا جائے۔ یہ برصغیر ہند و پاکستان میں پہلا "یوم اقبال" تھا۔ ہم اس سلسلے میں علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ وہ ایک شام ہوٹل سسل (واقع مال روڈ) میں عقیدت مندوں کے ساتھ چائے پئیں۔ علامہ نے یہ دعوت قبول فرمائی۔
گفتگو سے قطع نظر۔ ہوٹل میں ان کی آمد۔ ان کا حلیہ۔ مشہدی لنگی وغیرہ تمام جاذب نظر تھیں۔ ان کی شخصیت میں تمکنت اور وقار تھا۔ یہ مجلس بھی باوقار اور ایک یادگار موقعہ تھا۔ اس مجلس میں علامہ اقبال نے تقریر بھی فرمائی۔ اس کا خلاصہ جو مجھے یاد ہے حسب ذیل ہے۔

"میں شاعر نہیں ہوں شعر شناس ہوں اور حکمت زندگی اور حکمت دین کا طالب علم ہوں۔ میری آرزو ہے کہ میں اپنے ملک کے تعلیم یافتہ لوگوں پہ دین کے اسرار منکشف کر جاؤں تاکہ وہ دین کے قریب آ جائیں"۔

(۳)

ملاقات کا تیسرا موقعہ مجھے اس زمانے میں ملا جب علامہ اقبال مدراس لیکچرز کی تیاری کر رہے تھے مجھے پیغام بھیجا کہ لائبریری میں فلسفہ کی عربی و فارسی کی جو کتابیں ہیں ان کی فہرست بنا کر حاضر کروں ۔ جب میں حاضر ہوا تو فرمایا ۔ مسلمانوں میں دین والا آدمی جب فلسفے کی اصطلاحوں میں بات کرتا ہے تو اس کی بات میں وقار اور وزن پیدا ہو جاتا ہے مگر محض فلسفے والا آدمی جب دین کی بات کرتا ہے تو اس کی نہ فلسفیانہ حیثیت ہوتی ہے نہ دینی لحاظ سے اس میں وزن"

میری بے علمی مانع رہی ۔ اس کی وجہ سے میں خاموش رہا ۔ دراصل میں سننے والوں میں تھا اور میرے لئے بس یہی کافی تھا کہ میں ایک حکیم بالغ نظر کے پاس بیٹھا ہوں ۔ یہ دو تین واقعات محض بطور تذکرہ و تبرک لکھ دیئے ہیں ورنہ ان کی اشاعت کی ضرورت نہ تھی ۔ البتہ مجھے اس بہانے سے یہ عرض کرنے کا موقعہ مل گیا ہے کہ اقبالیات پر کام کے وسیع میدان کھلے ہیں ۔ آج تک اقبال پر اور ان کے کلام کے مختلف موضوعات پر بہت کچھ لکھا گیا ہے مگر اقبالیات کا موضوع ابھی تک تشنہ ہے ۔ درحقیقت ابھی تک مطالعہ اقبال کی تحریک صحیح معنوں میں شروع ہی نہیں ہوئی ۔ وجہ اس کی یہ ہے ۔ کہ اقبال شناسی اور اقبال فہمی کے لئے کئی علوم کی ضرورت ہے ۔ مشرق و مغرب کے عام علوم اسلامی علوم کے امتزاج کے ساتھ سیکھے جائیں ۔ محض جدید تعلیم صحیح اقبال شناسی پیدا کر ہی نہیں سکتی ۔ میری رائے میں قابل توجہ امور جن پر اقبالیات کے بارے میں کام کرنا باقی ہے یہ ہیں ۔

(۱) اقبال کے مآخذ کا مسئلہ

(۲) اقبال کے اہم موضوعات کی وضاحت کا مسئلہ

(۳) اقبال کے علم کلام کی تدوین کا مسئلہ

(۴) پاکستان کے نصب العین میں فکر اقبال سے استفادہ کس طرح کیا جائے ۔

(۵) فکر اقبال کے دبستان کا قیام ۔ اسلامی طرز تفکر ۔ اسلامی قانون ۔

اسلامی طرز حیات اور اسلامی مملکت کے رجحانات کو فروغ دینا چاہیئے اور یہ آخری معاملہ قوم کی توجہ چاہتا ہے ۔ اور اقبال پر کام کرنے والی مجالس کا فرض یہ ہے کہ لوگوں میں صحیح تحقیقی سپرٹ پیدا کریں ۔ محض جذباتی انداز کی اقبال پرستی کافی نہیں ۔ بلکہ علمی بنیادوں پر کام کرنے کی اشد ضرورت ہے اور توفیق میرے رب کے ہاتھ میں ہے ۔

---

چوہدری محمد حسین

# اسرارِ خودی

## اُدبا و حکماء مغرب کی نظر میں

زمانہ حال کے فلسفہ مذہب. شاعری اور عام علم ادب میں علامہ اقبال کا کیا پایہ ہے یا علامہ اقبال کے فلسفہ مذہب اور شاعری کا زمانہ حال پر کیا اثر ہو رہا ہے اور یہ اثر اس "حال" کو کس "مستقبل" میں بدلنا چاہتا ہے؟ ایسے سوالات ہیں جن کے جوابات سے بصورتِ موجودہ مشرقی اقوام کے عام افراد قاصر ہیں! اس کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس نے زمانہ کو زمانہ کے محقق کی نگاہ سے دیکھا ہو. مشرق و مغرب دونوں کی سیر کی ہو دونوں کے علوم و فنون - تمدن و معاشرت مذہب و سیاست اخلاق و رجحانِ طبائع کا وسیع مطالعہ کیا ہو۔ اور پھر یہ اہلیت رکھتا ہو کہ صحیح مطالعہ کے بعد صحیح نتائج مترتب کر سکے۔ ایسے شخص کو بے چون و چرا کہنا پڑیگا۔ کہ جس طرح زوال و انحطاط کی زندگی کو صحیح "زندگی" سے کوئی نسبت نہیں۔ کوئی علاقہ نہیں۔ اسی طرح انحطاط میں بسر کرنے والے افراد کے خیالات کو یعنی "زندہ خیالات" سے کوئی نسبت اور علاقہ نہیں۔ چہ جائیکہ وہ ان کا موازنہ کریں اور اُن کی قدر و قیمت کا پتہ لگائیں۔ اور اگر کوئی نسبت ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ "زندہ خیالات" ایک نئی اور الگ دُنیا کے خیالات تصور کئے جائیں اور اُن کی انتہائی داد جو دی جا سکے وہ حیرت و استعجاب ہو اور بس۔

اقبال بھی مشرق میں پیدا ہوا! یہ سچ ہے. مگر کون ہے جو ارتقاء کے کرشموں سے واقف ہو۔ علل و اسباب کی عجائب آفرینی کا منکر ہو اور پھر اس بات سے انکار کرے کہ قدرت کو جب کسی قوم کو نئی روح بخشنی ہوتی ہے۔ اُسے نئے قالب میں ڈھالنا مقصود ہوتا ہے تو اُس قوم ہی سے پہلے نئی رُوح۔ نئی عقل اور نئے احساس کے افراد پیدا کئے جاتے ہیں۔ وہ افراد جن کی ہستیاں ایک عظیم الشان انقلابِ زندگی کا پیش خیمہ ہوتی ہیں۔ وہ افراد جن کے اقوال اگرچہ ابتدا میں عالم بالا کی باتیں متصور ہوتی ہیں. مگر جونہی لوگ ان کی صداؤں سے مانوس ہوتے ہیں۔ اُن کی دعوت پر کان دھرتے ہیں۔ ان کے خیالات و ارشادات کو جذب کرتے اور ان کے کہنے پر عمل کے لئے کمربستہ ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ وہ خود ویسا ہی سوچنا اور ویسا ہی سمجھنا شروع کر دیتے ہیں تو پھر زندہ ہستیاں رہتی ہیں ورنہ ان کے خیالات معمولی خیالات متصور ہوتے ہیں۔ غرض کہ فطرت کو جن اقوام میں انقلاب منظور ہوتا ہے غیر معمولی افراد بھی انہیں سے پیدا ہوتے ہیں۔

اقبال کس مضبوط فلسفہ کی بنیاد ڈال رہا ہے! ابنائے جنس کو کن مکارمِ اخلاق کی تعلیم دیتا ہے. اُس کے نزدیک

انسان کیا ہستی ہے۔ فرد کیا ہے؟ وہ کامل کس طرح ہو سکتا ہے۔ قوم کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ تمام دُنیا ایک ہی قوم کیسے بن سکتی ہے؟ پھر اقبال کے پاک جذبات کس عالمگیر اخوت کے لئے تڑپ رہے ہیں۔ اس کی باریک نگاہ تمام عالم کو کس ایک معاشرت اور ایک تمدن میں دیکھنے کی آرزو مند ہے۔ اُس کا محبت بھرا دل کس مساوات کا متمنی ہے۔ وہ کس وحشت کے ساتھ دوئی سے گریزاں ہے۔ کس درد سے یکرنگی کا دارفتہ ہے؟ یہ سب ایسے حقائق ہیں کہ افراد کو افراد بننے کے لئے قوموں کو ایک قوم میں ظاہر ہونے کے لئے اور دُنیا کو ایک دُنیا کہلانے کے لئے بغیر ان کی طرف رجوع کئے چارہ نہیں۔

سال گذر رہے ہیں۔ علامہ موصوف نے خدا جانے کتنے عرصہ کے فکر و تدبر اور دماغ سوزی کے بعد اپنی صحیح و اعلیٰ قوتِ فکریہ کی بدولت بنی نوع کے لئے مکمل حیاتِ فردیہ کے حصول کا نسخہ تجویز کیا۔ مثنوی اسرارِ خودی کی شکل میں یہ نسخہ چھپا اور لوگوں نے دیکھا۔ بنی نوع پر تو یہ ایک عام احسان تھا۔ مخصوص مورد اس انعام کے ہم مشرقی لوگ تھے اور پھر ان میں بھی حقیقی مستحق ہم ہندوستانی جن کی زندگی اصلی انسانی زندگی سے کہیں دُور ہے۔ جن کے نفس مردہ ہو چکے ہیں۔ جن کے قویٰ ضعف کا شکار ہیں۔ جن کی ہمتیں سو چکی ہیں۔ جن کے دماغ پست خیالات کا گھر ہیں اور جن کی زندگی ایک طویل شبیہِ حالتِ نزع ہے۔ مگر افسوس نہ صرف مریضوں کو بلحاظ افراد ابھی تک پوری واقفیت نہ ہوئی کہ یہ نسخہ ہمارے ہی مرض کا علاج بلکہ ہمارے مدعی نباضوں کی تشخیص اب تک یہ دریافت کرنے سے قاصر ہے کہ یہی وہ دوا ہے جو کافی و شافی ہو سکتی ہے اور یہ جو اور علاج آج تک عمل میں لا رہے ہیں وہ مریض کو اور مریض بنانے میں ممد ہیں نہ کہ اُسے صحت و تندرستی عطا کرنے میں اور نہ صرف یہ کہ قومی پیشواؤں اور مبلغوں نے اس کتاب میں نگاہ نہیں کی اور افرادِ ملت کو مکمل افراد بنانے کے درپے نہیں ہوئے بلکہ اُدبا و شعرا جن کی نظر عام نظروں سے گہری ہونا چاہیئے اور جن کا مذاقِ سخن عام مذاقوں سے زیادہ لطیف اور زیادہ پاکیزہ ہونا ضروری ہے۔ وہ بھی بلحاظ شعر و ادب کے ابھی تک اس کی خوبیوں سے نا آشنا ہیں۔ مگر نا آشنا ہوں بھی کیوں نہ۔ ہم خود کہہ چکے ہیں کہ زوال و انحطاط کے زمانہ کے خیالات اور مذاق اس قابل نہیں ہوتے کہ اُن کی حقائق و دقائق تک رسائی ہو۔ جب ہم حقیقی زندگی ہی سے روشناس نہیں تو حقیقی ادب اور حقیقی شعر کو کیا سمجھیں گے اور ہمارے اس کتاب کی طرف ابھی تک بہت تھوڑا مائل ہونے کی وجہ بھی یہی ہے ہم علم ادب کی انتہائی وسعتوں سے آشنا نہیں۔ ہمیں یہ معلوم نہیں کہ شعر سے دنیا میں کیا کام لئے جا سکتے ہیں زندہ اقوام کے اشعار میں مضامین کیسے ہوتے ہیں اور کیوں ہوتے ہیں۔ اُن کے اسلوبِ بیان میں کیا سحر ہوتا ہے۔ پھر شعریت کیا ہے اور شعریت کے کونسے اثرات زندگی بخش ہیں اور کونسے مرگ آور؟

ہمارے نقاد مثنوی اسرارِ خودی کی کسی ایک خوبی کو آج تک پورے طور پر واضح نہ کر سکے۔ اس کے مطالب و معانی کو کما حقہٗ ادراک نہ کر سکے۔ یہ نہ جان سکے کہ سلسلۂ خیالات کس مرکز سے کس ربط و ضبط کے ساتھ زمین سے اُٹھا ہے اور کس قوت و اعجاز سے آسمان تک پہنچ کر تمام فضا میں بسیط ہو رہا ہے۔ بلکہ علم ادب کی حقیقت سے اپنے بے بہرہ ہونے کا ثبوت اس طرح دیا کہ اسرارِ خودی میں خواجہ حافظ علیہ الرحمتہ کے ادب پر جو تنقید تھی اُسے

اپنی کم فہمی سے خواجہ کی بزرگی پر حملہ سمجھا۔ گویا نہ صرف ادب کو سمجھنے سے قاصر ہے بلکہ نقاد کہلا کر تنقید کے سمجھنے سے درماندگی کا ثبوت دیا۔

کس قدر افسوس کا مقام ہے۔ کس قدر علم ادب کی حقیقت سے ناآشنائی کا اظہار ہے۔ کہ اسرارِ خودی کے ادبِ کو جو آج مغرب کے اُدبا کو محوِ حیرت کر رہا ہے نہ سمجھنا تو درکنار ہمارے نقاد اس میں ایک معمولی ادبی تنقید کو نہ سمجھ سکے اور پھر اُس پر جو ہمہ دانی کے دعوے ہیں وہ خدا ہی جانتا ہے۔

ہم پھر بھول رہے ہیں۔ ہمارا افسوس ناحق ہے اور ہمارے گلیوں کی بنا یہ ناحق ہے۔ ہم اس وقت تک اسرارِ خودی کو نہ سمجھ سکتے جب تک کہ زندہ قومیں اُسے پہلے نہ سمجھ لیتیں۔ اور ہمارے سمجھانے کے لیئے اس کی تشریح میں کچھ نہ کچھ لکھ نہ چکتیں۔ مثنوی مذکور کے انگلستان میں انگریزی زبان میں ترجمہ ہونے کے بعد کئی مغربی ادیب اور فلسفی اور نقاد اس پر رائے زنی کر چکے ہیں۔ انہیں تنقیدوں میں ایک تنقید کا ترجمہ ہم ناظرین اور بالخصوص نقاد حضرات کے پیش کرتے ہیں تاکہ وہ جان لیں ہم اسرارِ خودی کو کیا سمجھے تھے اور "خودی" کے مالکوں نے اسرارِ خودی کو کیا سمجھا ہے۔ اس مضمون سے یہ بھی واضح ہوگا کہ علم ادب کی کیا حقیقت و وسعت ہے اور اگر دنیا "آج" کی دنیا بنی ہے تو ادب ہی کے اثرات سے بنی ہے اور اگر "کل" کی دنیا بنے گی تو اسی کے کرشموں سے۔ اس تنقید میں یہ حقیقت پڑھ کر ہمارے نقادانِ ادب کی اور بھی آنکھیں کھلیں گی کہ زندہ اقوام کے اُدبا کے نزدیک اگر کوئی مفید اور زندہ ادب کا لکھنے والا۔ مفید اور زندہ شعر کا کہنے والا۔ مفید اور زندہ فلسفہ کا سبق دینے والا اس وقت تمام دُنیا میں زندہ ادیب۔ زندہ شاعر زندہ فلسفی ہے تو وہ صرف ایک اقبالؔ ہے اور بس اور حیاتِ انسانی کا اصل راز اگر کسی نے آج تک سمجھا ہے تو اسی نے۔

فاضل نقادؔ نے جس خوبی اور قابلیّت سے اسرارِ خودی کے اصلی جوہر کو ہمیں دکھایا ہے ہم فی الحقیقت اس کی داد نہیں دے سکتے۔ دنیا کے دو مشہور ترین فلسفی اُدبا (نطشا اور روٹمین) سے جن کا سکہ موجودہ وقت میں تمام اہلِ فکر پر ہے اقبالؔ کا مقابلہ کر کے دکھا دیا ہے کہ وہ دونوں حضرات مدت العمر میں انسان کے متعلق جس نکتہ کو نہ سمجھ سکے اُسے اقبالؔ کی حقائق شناسی نے کس خوبی اور سادگی سے دنیا کا صحیح مطمح بنا کر دُنیا کے سامنے رکھ دیا ہے۔

اس تنقید کا لکھنے والا امریکہ کا مشہور فاضل فلسفی۔ ادیب اور نقاد مسٹر ہربرٹ ریڈ ہے۔ اس مضمون کو پڑھنے اور سمجھنے کا لطف تو اصل زبان انگریزی ہی میں ہے۔ ترجمہ اُس مفہوم کو کیا ادا کرے گا۔ جو مضمون نگار کے انگریزی الفاظ میں مضمر ہے۔ یہ مضمون امریکہ کے اخبار نیو ایج ( [illegible] ) مورخہ ۲۵ اگست ۱۹۲۱ء میں چھپا تھا۔

وٹمین امریکہ کا سب سے بڑا فلسفی شاعر ہے۔ اُس کے کلام پر امریکہ کے ایک نقاد مسٹر لارنس نے اپنی تنقید شائع کی تھی۔ مسٹر ہربرٹ ریڈ یہ شکایت کرتا ہوا کہ صحیح تنقیدِ ادب ادبی دُنیا میں مفقود ہے۔ اس تنقید پر نظر ثانی کرتا ہے۔ اس کی داد دینے کے بعد خود بتاتا ہے کہ وٹمین کے کلام میں کیا کیا خصوصی کمالات تھے۔ پھر اس کے کلام کے بعض نقائص جو مسٹر لارنس نے لکھے ہیں۔ بحث کا آغاز کر کے اس طرح قلم کو جولانی دیتا ہے۔

"مسٹر ملالیس نے جس خوبی کے ساتھ "وٹمین" کی متذکرہ بالا حقیقت آفرینی کو بے نقاب کیا ہے بعینہ ویسی تدقیق و تنقید سے اُس شاعرانہ کذب کے عنصر کو بھی جو اس کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ بالتشریح واضح کر دیا ہے۔ کیونکہ "وٹمین" باوجود اپنی تمام عظمت و علوِ مرتبت کے "کامل شاعر" نہ تھا۔ بلکہ اس کے کلام کی تصویر کے اُس رُخ پر چنداں اصرار کی ضرورت نہیں۔ جہاں تک اس شاعرانہ کذب، تخیل کی محدود جولانی اور تعینات عالم سے چشم پوشی کے مسئلہ سے تعلق ہے اُس کے کلام سے عیاں ہے اور بالکل اظہر من الشمس۔ اس کی شاعری کے اور بھی پہلو ہیں۔ ضبطِ تخیل، اثباتِ تعینات اور یہ وہ پہلو ہیں جن کے سامنے لطیف اندرونی احساس کی بوقلمونی ہیچ نظر آتی ہے۔ اور یہی پہلو ہیں جو زیادہ مستحق توجہ ہیں۔ ان معنوں میں "وٹمین" کی استعدادِ نادرہ کی بہترین توضیح اور اس کے فن کی مکمل ترین تعریف خود "وٹمین" کے قلم سے حُسنِ نگارش پا چکی ہے۔ یہ "وٹمین" کی کتاب "ومبو کر ایک دستاویز" (مناظرِ جمہوریہ) کے صفحات میں پوشیدہ ایک "فٹ نوٹ" ہے جو اس قدر جلی نہیں کہ قاری کی توجہ کو خود بخود اپنی طرف مبذول کرے۔ اس لئے مجھے حق ہے کہ میں اُسے اس مقام پر نقل کر دوں۔

ادبی صناعت و بداعت کی معنیٰ آفرینی کا منتہائے عروج۔ اُس کا حاصل۔ اُس کی حظ و انبساط کی انتہائی وسعتیں جو روحِ انسانی کی بلند پروازی کے لئے ممکن ہو سکتی ہیں سب "مابعد الطبیعیات" کے حقائق و لطائف ہیں۔ عالمِ روحانی کے غوامض و اسرار۔ خود روح۔ اور ہمارے تشخیص ذاتی کی بقا و دوام کا مسئلہ بھی اسی میں شامل ہے۔ تمام قرون میں نفسِ انسانی کی رسائی اس منزل تک ہوتی رہی ہے اور آئندہ ہوتی رہے گی کم سے کم اس نکتہ میں تو بلا اعتبار نسل و زمانہ تمام بنی نوع ایک ہی مقام پر کھڑے ہیں بلکہ اس کی تحسین و توصیف میں بھی متقدمین و متاخرین تمام کے تمام ہم آہنگ ہیں انسانی نگاہ میں وہی مصنفین محبوب ترین ہیں جو اس میدان کے شہسوار ہیں اور اگرچہ ان کا صلہ چاندی سونے کے چند سکوں کے سوا اور کچھ نہ ہو اور اگر بالآخر کچھ ہو تو صرف یہ کہ شہرت اُن کے قدم لے اور عظمت و فضیلت کا تاج اُن کے سر پہ رکھا جائے۔ مگر باایں ہمہ ابتذال اُن کے رشحاتِ قلم (جن میں از روئے حسنِ بیان سقم بھی ہوں) وہ اَمثل ہستی ہیں جن کو دُنیا جان سے بڑھ کر عزیز و محفوظ رکھے گی۔

ادب و شاعری کا منتہا ہمیشہ سے مذہب رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ وید۔ ژند۔ اوستا۔ تالمود۔ زبور۔ مسیح اور اُس کے تلامذہ کی اناجیل۔ تصانیفِ افلاطون۔ قرآن۔ علیٰ ہذا القیاس ہمارے زمانہ میں سویڈن برگ کی تحریریں۔ پھر لیبنٹز، کانٹ اور ہیگل کے گرانبہا افکار۔ سب ایسے اعلیٰ پایہ کے ادبی ذخائر ہیں جو علمِ ادب کی حقیقی بلندیوں اور عروج کو اس طرح نمایاں کرتے ہیں جس طرح دُنیا کے عظیم الشان پہاڑ سطحِ دُنیا سے بلند و نمایاں سر بفلک نظر آتے ہیں۔ پھر ان کے دوش بدوش شعراء کے وہ نتائجِ طبع بھی ہمیشہ حرزِ جاں بنے رہیں گے۔ جن میں اشخاص و واقعات، جذباتِ بہیمیہ انسانی اور مناظرِ عالمِ مادی کے متعلق راگنیاں الاپنے کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے اپنے کلام میں مذہبی انداز اور شعورِ اسرار کے علاوہ مستقبل غیب۔ شہود و مشیئت۔ غایتِ تکوینِ عالم وغیرہ مسائل پہ حصولِ اطلاع کے مضامین کو بھی کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا بلکہ بالواسطہ پیرایۂ بیان میں ان نکات کو ادا کر جاتے ہیں۔

مگر یہ عالمِ ادب کے نقد و ماہیت کی بجائے اُس کی وسعتِ استعداد کی تعریف ہے جو "وٹمین" نے کی ہے یعنی

یہ ادب کا "کم" ہے نہ کہ اس کا "کیف"۔ یہ تعریف "اندازِ بیان" و "حسنِ ادا" کے مسئلہ کو حل نہیں کرتی بلکہ اپنے الفاظ کی سادگی میں اسے پامال کر جاتی ہے۔ وہ گرامی تصانیف جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، علم حسن الاعیان کے نظریہ سے خواہ کتنی سقیم ہوں اپنی ذاتی خوبی میں ہمیشہ پاک و بے عیب ہیں۔ ان کی طاقتِ فکر کی آتش سیری دشت خیالات میں نیا جادو جگاتی ہے۔ اور قلوبِ انسانی کو پگھلا کر تمام عالم کو نئی شکل میں منتشکل کر جاتی ہے) مگر ان توضیحات کے زیر شرائط "وطن" کا مذکورہ صدر "منتہے"، "صحیح و نقد" منتہے ہے جو "عمل"، "مبلا و مطہر افادہ" کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر طرح موزوں و مناسب ہے۔ آج اس مقام اور اس زمانہ میں اس "منتہے" کو نگاہ رکھتے ہوئے میرے ذہن میں اگر کسی زندہ شاعر کا خیال آسکتا ہے جو اس میزان میں پورا اتر سکتا ہے تو وہ ایک ہی ہے اور وہ بھی لازمی طور پر نہ ہمارا ہم قوم اور نہ ہمارا ہم مذہب۔ میری مراد اقبال سے ہے۔ جس کی نظم "اسرارِ خودی" ابھی تھوڑا عرصہ ہوا ڈاکٹر رینلڈ نکلسن کے قلم سے اصل زبان فارسی سے انگریزی میں ترجمہ ہو کر میسرز میکملن کے اہتمام سے شائع ہوئی ہے۔ اس زمانہ میں جب کہ ہمارے ہم وطن متشاعر بلبلوں اور بٹیروں پر تک بندیوں سے اپنے یاروں کی ضیافتِ طبع کا سامان پیدا کر رہے تھے اور کیٹس[1] کے انداز پہ پیش پا افتادہ مضامین پر طبع آزمائیوں میں مشغول تھے غالباً اس وقت لاہور میں یہ نظم جس کی نسبت کہیں بتایا گیا ہے کہ اس نے ہندوستان کے مسلمان نوجوانوں کے خیالات میں ایک محشر برپا کر دیا ہے۔ تصنیف کی گئی اور شائع کی گئی۔ ایک ہندی مسلمان نے لکھا ہے کہ "اقبال ہم میں مسیح بن کر نمودار ہوئے جس نے مردہ اجسام کو جنبش دے کر ان میں حیاتِ تازہ کی لہر دوڑا دی ہے"۔ تم پوچھو گے یہ کیا ٹوٹکا تھا جس نے نادان خریداروں کے دلوں کو موہ لیا؟ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ کوئی ٹوٹکا نہ تھا، کسی سیاسی مجذوب کی بڑ نہ تھی، کسی مکتی فوج کے نجات فروش کا نسخہ نجات نہ تھا۔ بلکہ یہ اس نظم کا اثر تھا جس کا حسنِ معنوی موجودہ فلسفہ کے تمام اہم ترین نکات و دقائق پر حاوی ہے۔ یہ اس نکتہ آفرینی کا طلسم تھا جس نے افکار کی گوناگونی سے وحدتِ ایمانی پیدا کر دی ہے۔ یہ اس حقیقت ترجمانی کا سحرِ حلال تھا، جس نے ایک ایسی منطق کو جو محض مدرسوں کے طلباء تک ہی محدود و مخصوص تھی۔ ایک عالمگیر الہام کی صورت میں بدل کر عالم کے سامنے رکھ دیا ہے۔

اقبال اس بات سے انکار کرتا ہے کہ اس کے افکار نٹشا کے خیالات سے متاثر ہوئے ہیں، بایں ہمہ نٹشا سے اس کا موازنہ ناگزیر ہے۔ نٹشا کا "فوق الانسان"، اقبال کے "انسانِ کامل" سے صرف اتفاقی اوصاف میں مختلف ہے اگرچہ اول الذکر کی بنیاد امراء کے باطل تمدن پر ہے اور موخر الذکر جہاں تک میرا خیال ہے ان معنوں میں زیادہ یقینی اور مستحکم بنیاد پر مبنی ہے کہ اس کی تعریف میں "منتہے" (یعنی کسی سقراط، کسی مسیح، کسی محمد[2]) کا صحبت آشنا ہونا یا اس کا ازروئے پیدائش مکمل و اکمل ہونا تسلیم نہیں کیا گیا۔ بلکہ اسے فطرت کے قوائے مولدہ کا مآل و مقصود ٹھیرایا گیا ہے۔ ساتھ ہی اس کے اقبال کا "انسانِ کامل" ارتقاء جمہور کا منتہے ہے۔ وہ ایک اصول ہے جو اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ ہر انسان ایک مسترقات کا مرکز ہے جس کے ممکناتِ زندگی ایک خاص طریقِ عمل سے ترقی پا سکتے ہیں۔ انسانیت کا یہ نصب العین حقیقت کے

---

۱؎ انگریزی شاعر۔ ۲؎ ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم

زیادہ قریب ہے اور اس لحاظ سے وٹمین کے "نفسِ متوسط"ؔ سے زیادہ مناسب و متشابہ ہے۔ تاہم تینوں نصب العینوں کی تہہ میں ایک ہی ابتدائی خواہش یا خیال مضمر ہے۔ ان میں فرق صرف اسی قدر ہے جس قدر ان کے دیکھنے میں پیش بینی سے کام لیا جاتا ہے۔ از روئے مذہب ان سب کی بنیاد یہ اعتقاد ہے کہ انسان ایک قوتِ الٰہیہ کی کشش و جذب سے پیدا ہوتا اور ارتقا پاتا ہے جس کا نام "خدا" ہے۔ از روئے سائنس مفروضہ یہ ہے کہ ہیئت واقعات میں ایک قوتِ مولدہ داخل کی جاتی ہے جو شعورِ انسانی پہ از خود جلوہ گر ہوتی ہے۔ اور نفسِ انسانی کے نشوونما اور اس کو ہمیشہ ترقی دیتی رہتی ہے از روئے مابعد الطبیعیات یہ دونوں پہلو جن میں سے ایک مذہب نے اختیار کیا ہے اور دوسرا سائنس نے۔ متحد ہیں "زندگی" میں اقبال کی نظم کی تمہید سے اتفاق کرتا ہوں، ایک متقدم حرکتِ جذب و ہضم ہے۔ یہ اپنی پیش روی میں اپنے رستہ کی تمام رکاوٹوں کو خود اپنے اندر جذب کر کے دور کرتی جاتی ہے۔ آرزوئیں۔ اور نصب العینوں کا مسلسل پیدا کرتے رہنا اس کا اصلی جوہر ہے۔ اور اس نے اپنی حفاظت و توسیع کے لئے ایسے ایسے آلے (حواس، عقل، وغیرہ وغیرہ) ایجاد کئے ہیں یا خود اپنی ہی ذات میں سے پیدا کر لئے جو اس کے سنگہائے راہ کو جذب کرنے اور اس کے اپنے مشابہ بنانے میں اس کی مدد کرتے ہیں۔ زندگی کے راستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مادہ ہے یا یوں کہو کہ نیچر ہے۔ تاہم نیچر اس لحاظ سے کہ وہ زندگی کی اندرونی طاقتوں کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ عدم سے وجود میں آئیں۔ اپنی ذات میں شر نہیں۔" لہٰذا زندگی ایک سعی آزادی ہے اور اس سعی کا طریق یہ "آناہ" کی تعلیم ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں جیسے خود محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بتایا **تخلقوا باخلاق اللہ** (اپنے اندر اخلاق اللہ پیدا کرو) یہ حدیث ہمیں وٹمین کا یہ قول یاد دلاتی ہے "میں مکمل اشیا کی انتہا ہوں اور پیدا ہونے والی اشیا کا محیط" وٹمین نے یہ بھی کہا ہے۔ کہ "میں خدا کو مردوں اور عورتوں کے چہروں میں دیکھتا ہوں اور خدا اپنے چہرے میں جب آئینہ کے سامنے کھڑا ہوتا ہوں" نٹشا نے اسی نصب العین کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے "خالق اپنے ایسے افراد خالق کی جستجو میں رہتا ہے" اور فی الحقیقت سارے کا سارا مذہب اور سارے کا سارا فلسفہ بالآخر اس تکمیلِ خودی کے اصول میں آ جمع ہوتا ہے۔ از روئے نفسیات بھی انسان کسی ایسی الوہیت کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ جس کا کہ وہ خود مظہر نہیں اور معلوم بھی یہی ہوتا ہے کہ یہ امر ایک صداقتِ طبعیہ ہے۔ اقبال نے اس صداقت کا نٹشا۔ یا وٹمین کی نسبت زیادہ وثوق سے ادراک کیا ہے۔ وٹمین کا "نفسِ متوسط" مبہم و غیر مشخص ہے اور نہ اس قدر جامع ہی ہے جیسا کہ ایک منتہٰے کو ہونا ضروری ہے۔ نٹشا کا "فوق الانسان" صحبتِ انسان سے گریزاں اور نفور ہے۔ اس لئے جبلتًہ باطل ہے۔ مگر اقبال کا "انسان کامل" "نفسِ متوسط" ہے اور جلیسِ ہمدرد اور اقبال کا "نفسِ متوسط" "انسانِ کامل" گویا ؎

"خود صنم ہے خود پرستارِ صنم"

باخودی بشنید ز افکارِ خودی      نعرہ زد از گنج "اسرارِ خودی"
وا نگشتہ پرمنِ بے خود ہنوز      سرّے از "اسرار" و "رمز" سازِ "رموز"

---

ٹہ وکذٰلک جعلناکم امۃ وسطاً لتکونوا شہداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شہیدا (قرآن)

١٤١٩١

# اسرارِ خودی کا انگریزی ترجمہ

ہم مشرقیوں کا خاصہ ہے کہ اپنے انمول جواہرات کی قدر اس وقت جانتے ہیں جب یورپ والے ان کو ہمارے خزانے سے نکال کر اپنی دکان سجاتے ہیں اور ہم تماشائی بن کر دیکھتے اور اپنی قسمت پر ناز کرتے ہیں۔

اقبال اپنے وطن میں برسوں زمزمہ پرداز رہے۔ ان کی قدر و منزلت ان کی زندگی میں بھی ہوئی لیکن ہمارے انگریزی خواں نوجوانوں کے کان در اصل ان کی سامع نوازی سے اسی وقت لذت گیر ہوئے جب کیمرج کے پروفیسر نکلسن نے ان کی مثنوی اسرارِ خودی کا ترجمہ انگریزی میں کیا۔ ذیل میں ہم پروفیسر نکلسن کے مقدمہ کے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں جن میں انہوں نے اقبال اور ان کی شاعری کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں:-

اسرارِ خودی پہلی مرتبہ ۱۹۱۵ء میں بمقام لاہور شائع ہوئی۔ میں نے اسی زمانہ میں اسے پڑھا۔ اور اس قدر متاثر ہوا کہ میں نے اقبال کو، جن سے میری کیمرج میں ملاقات تھی، اس کے انگریزی ترجمہ کی اجازت کے لئے لکھا۔

اقبال ایک ہندوستانی مسلمان ہے۔ اس نے مغربی ممالک میں رہ کر موجودہ فلسفہ کا اچھی طرح مطالعہ کیا اور اسی فن میں کیمرج اور میونخ (میونچ) سے ڈگریاں حاصل کیں۔

اس کا پیغام نہ صرف مسلمانانِ ہند کے لئے مخصوص ہے بلکہ وہ تمام عالم اسلامی کے لئے ہے۔ چنانچہ اسی مقصد کو مدِّ نظر رکھ کر اس نے اردو کی جگہ فارسی کو ادائے مطلب کے لئے منتخب کیا ہے۔ کیونکہ اوّل تو فارسی دنیائے اسلام میں بہت زیادہ مقبول ہے۔ دوسرے فلسفیانہ خیالات جس خوبصورتی اور وضاحت سے اس زبان میں ادا ہو سکتے ہیں کسی دوسری زبان میں ممکن نہیں

اقبال نے ادبیات یورپ کو گھول کر پی لیا ہے۔ اس کا فلسفہ بہت کچھ نیٹشے Nietzsche اور برگسان Burgson کا رہینِ منت ہے اور اس کی شاعری ہمارے دل میں Shelly کی یاد تازہ کرتی ہے لیکن اس پر بھی اس کا ہر خیال اور ہر قول ایک مسلمان کا خیال اور مسلمان کا قول معلوم ہوتا ہے، اور شاید اسی وجہ سے اس کا اثر زیادہ ہو۔ وہ ایک پُر جوش مذہبی مسلمان ہے وہ ایک نئے مکہ (معظمہ) کا خواب دیکھتا ہے۔ اسے ایک وسیع جمہوری دنیا نظر آتی ہے جس میں تمام اسلامی ریاستیں متحد و مشترک ہیں جس میں ملک و ملت کی کوئی تمیز نہیں۔ اسے قومیت اور

شہنشاہی کی ضرورت نہیں اس کے خیال میں تو یہ چیزیں انسان کو جنت سے محروم کردیتی ہیں۔ انسان ایک دوسرے سے ناآشنا ہوجاتا ہے۔ برادرانہ جذبات مفقود ہوجاتے ہیں اور جنگ کا تلخ تخم بویا جاتا ہے۔ وہ سیاست کی جگہ مذہبی حکومت کا خواب دیکھتا ہے۔ اور "مکیاولی" machiavelli کو جو جھوٹے دیوتاؤں کی پرستش کرتا ہے اور جس نے بہتوں کو اندھا (گمراہ) کر رکھا ہے بُرا بھلا کہتا ہے۔

یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ جب کبھی مذہب کا نام لیتا ہے تو اس سے اس کی مراد صرف مذہب اسلام ہے۔ غیر مسلم کے معنی خدا کا منکر ہے (اور ایک حد تک) اس پر جہاد کرنا لازم ہے۔ بشرطیکہ وہ محض لوجہ اللہ ہو۔ ایک آزاد و مخلص اسلامی برادری جس کا مرکز کعبہ ہو اور جو رشتہ حب اللہ و الرسول سے بندھی ہوئی ہو۔ اقبال کا نقطہ نظر ہے۔ اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی میں اسی کو نہایت مؤثر خلوص کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ اور ہم بجز تعریف کے کچھ نہیں کرسکتے، اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کے ذرایع حصول بھی بتاتا ہے۔ اوّل الذکر میں مسلم کی فردی حیثیت سے بحث ہے اور موخر الذکر میں جماعتی حیثیت سے جب ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ کتاب کی زبان مصنف کی مادری زبان نہیں تو اس کے کمالات شاعری پر تعجب آتا ہے۔ میں نے حتیٰ الوسع جہاں تک ہوسکا ہے اس کے لطف کو نثر میں قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں بعض حصے تو ایسے ہیں کہ ایک بار پڑھ لینے کے بعد ان کو بھولنا مشکل ہے۔ مثلاً وہ حصہ جہاں وہ اس آنے والے انسان کا نقشہ کھینچتا ہے۔ جس کے لئے دنیا منتظر ہے اور جو آکر تمام عالم کو نجات دلائے گا۔ یا مناجات جس پر کتاب ختم ہوتی ہے۔

جلال الدین رومی کی طرح اقبال بھی اپنے مطالب کو زود فہم اور آسان بنانے کے لیے جابجا حکایت و امثال سے کام لیتا ہے۔ کیونکہ اس کے سوا کوئی دوسری بہتر صورت نہیں۔

پہلے پہل جب اسرارِ خودی عالم وجود میں آئی تو اس نے ہندی نوجوانوں کو محو حیرت کردیا۔ ان میں سے ایک لکھتا ہے "اقبال کا وجود ایک مسیحا سے کم نہیں کہ اس نے ہماری مردہ لاش میں جان ڈال کر اسے متحرک کردیا ہے"۔ اب یہ دیکھنا باقی رہ گیا ہے کہ یہ بیدار جماعت کس طرف کا رُخ کرتی ہے۔ کیا یہ لوگ ایک دُور دراز "مدینۃ اللہ" کا خواب دیکھ کر مطمئن ہوجائیں گے یا ان اصولوں کو وہ اس کے مصنف کے خیال کے برخلاف کسی دوسری غرض کے حصول کے لیے استعمال کریں گے؟ باوجودیکہ وہ واضح طور سے علانیہ قومیت پرستی (نیشنلزم) کی مذمت کرتا ہے۔ تاہم اس کے معتقدین کا خیال ہے کہ اس سے اس کی کوئی دوسری مراد ہے۔

میں ابھی سے یہ پیشین گوئی کرنا نہیں چاہتا کہ اس کتاب کا کیا اثر ہوگا۔ اس کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ وہ اس زمانہ کا آدمی نہیں۔ وہ قبل از وقت پیدا ہؤا اور وہ اس زمانہ کے لائق نہیں۔ ہم اس کے خیال کو اس کے مذہب کے کسی فرقہ کے نقطۂ نظر سے مطابق نہیں پاتے۔ اس سے اسلامی دماغ میں بڑی تبدیلی ممکن ہے۔ لیکن اس کی اہمیت ہمیں اس واقعہ سے نہ سمجھنا چاہیئے کہ ایک محدود عرصہ میں ایسا انقلاب بھی ہوسکتا ہے۔

شیخ عبدالقادر مرحوم

# رموزِ بیخودی

علامہ ڈاکٹر محمد اقبال علیہ رحمتہ کی مثنوی "رموزِ بیخودی" جب پہلی مرتبہ شائع ہوئی تھی تو "مخزن" کے نامور بانی جناب شیخ عبدالقادر نے اس پہ تبصرہ کیا تھا۔ شیخ صاحب موصوف نہایت اعلیٰ پایہ کے نقاد ہونے کے علاوہ سب سے بڑے "اقبال شناس" بھی تھے۔ "بانگِ درا" کے مقدمے کے لئے نگہ انتخاب انہی پہ پڑی تھی۔ اس مضمون میں مثنوی "رموزِ بیخودی" پہ سرسری نظر ڈالی گئی ہے لیکن اس سرسری میں بھی حقائق و معارف کے دریا بہائے ہیں۔ اس مضمون کو مخزن کے پرانے انبار سے نکال کر حیاتِ نو دی گئی ہے۔

محمد عبداللہ قریشی

مثنویاں تو بہت لکھی گئی ہیں اور لکھی جائیں گی۔ لیکن یہ امتیاز شاید کسی کسی کو حاصل ہو کہ ملک و قوم تک کوئی ضروری پیغام پہنچانے کے لئے مثنوی کو ذریعۂ اظہارِ خیال بنایا جائے۔ خدا جزائے خیر دے شیخ محمد اقبال کو جنھوں نے اس زمانۂ انحطاط میں ملّتِ اسلامیہ کو مثنوی "اسرارِ خودی" کے ذریعہ سے پیغامِ عمل دیا ہے۔ اور "رموزِ بیخودی" میں مژدۂ حیات سنایا ہے۔

دُنیا میں سب سے بڑی مثنوی غالباً مثنویِ مولانا روم (علیہ الرحمتہ) ہے۔ جس کو اسلامی ممالک میں اکثر لوگ قرآن مجید کے بعد اعلیٰ درجہ کی مذہبی کتاب سمجھتے ہیں۔ اور "قرآن در زبانِ پہلوی" کا خطاب دیتے ہیں۔ اس کی زبان ایسی سلیس اور اندازِ بیان ایسا دلنشین ہے کہ خاص و عام میں مقبول ہے۔ یہ عالیشان مثنوی ایک دریائے ناپیدا کنار ہے۔ اس کی کئی ضخیم جلدیں ہیں جن میں کلامِ الٰہی کے ضروری مسئلے جا بجا عام فہم پیرایہ میں اور مثالوں اور حکایتوں کے ذریعے لوگوں کو سمجھائے گئے ہیں۔ اس کتاب کا مقصد مذہبِ اسلام کی خدمت ہے۔ تصوّف کا عنصر اس میں غالب ہے۔ اس لئے یہ کتاب علماء اور صوفیا دونوں میں مقبول ہے۔ اور فلسفی بھی اسے شوق سے پڑھتے ہیں۔

"اسرارِ خودی" اور "رموزِ بیخودی" میں طرزِ مثنویِ مولوی معنوی کا تتبع کیا گیا ہے۔ ہمارا یہ مطلب نہیں کہ ہم ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کی ان دو مختصر مثنویوں کا مولانا روم کی عظیم الشان کتاب سے مقابلہ کیا چاہتے ہیں۔ ہاں یہ نسبت ضرور ہے کہ اقبال نے مثنوی شریف کی شیریں زبان اپنی مثنویوں کے لئے اختیار کی ہے اور مثنوی کی مقبول بحر اپنے لئے تبرکاً انتخاب کی ہے۔

جناب مولانا علیہ رحمتہ کا فیض مثنوی سمجھئے کہ ان دونوں مثنویوں میں ایک خاص تاثیر موجود ہے۔ ذیل کے اشعار میں "اسرارِ خودی" کی تمہید میں اقبال نے خود اس فیض کا اعتراف کیا ہے۔ ؎

این قدر نظارہ ام بے تاب شد ۔۔۔ بال و پر بشکست و آخر خواب شد
روئے خود بنمود پیرِ حق سرشت ۔۔۔ کو بحرفِ پہلوی قرآں نوشت
گفت اے دیوانۂ اربابِ عشق ۔۔۔ جرعۂ گیر از شرابِ نابِ عشق،
بر جگر ہنگامۂ محشر بزن، ۔۔۔ شیشۂ بر سر دیدہ بر نشتر بزن

آشنائے لذّتِ گفتار شو
اے درائے کارواں بیدار شو

"درائے کارواں" یعنی اقبال نے بیدار ہو کر اس ارشاد کی تعمیل کی ہے۔ سوز و گداز خدا نے فطرت میں ودیعت کیا تھا۔ ملتِ اسلامیہ کی موجودہ حالت پر نظر پڑتے ہی وہ سوز و گداز نالۂ نے کی طرح فریاد بن کر سینہ سے نکلا اور پکارا کہ دنیا میں وہی افراد زندگی کا فرض کماحقہٗ ادا کرتے ہیں جو لذتِ عمل سے بہرہ یاب ہیں اور جو وقتِ عمل کھو بیٹھے یا محوِ خیال ہو بیٹھے ہیں۔ اُن کا شمار زندوں میں نہیں۔ اس ایک مضمون کو کئی پیرایوں میں ادا کیا گیا ہے اور تشبیہوں سے اور کئی مؤثر مثالوں سے واضح کیا گیا ہے۔ "اسرارِ خودی" کے لئے ایک بسیط ریویو جداگانہ درکار ہے۔ جو کبھی (اگر حالات مساعد ہوئے) لکھا جائے گا۔ اخبارات میں اُس پر بہت سے ریویو ہو چکے ہیں اور بہت کچھ اُس کی تعریف میں لکھا جا چکا ہے۔ اس وقت تو اس مثنوی کے دوسرے حصے سے بحث ہے۔ جو حال میں شائع ہوا ہے۔ اور جس کا نام "رموزِ بیخودی" رکھا گیا ہے۔

اگر صرف دو مثنویوں کے ناموں کو سرسری طور سے دیکھا جائے تو خیال ہوتا ہے کہ حضرتِ اقبال نے اضداد کے جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور نکتہ چینی زبانِ قلم سے بے اختیار نکلنے کو ہوتی ہے کہ پہلے تو ملتِ اسلامی کو پیغام دیا کہ اس کا ہر فرد خودداری سیکھے اور اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے جد و جہد زیست کے میدان میں مردانہ کارزار کے لئے تیار ہو اور پھر دوسری کتاب میں خود ہی خودی سے بیگانہ بن کر وہی بیخودی کا جادۂ فرسودہ اختیار کر لیا۔ لیکن جب "رموزِ بیخودی" کو غور سے پڑھیں تو یہ اعتراض رفع ہو جاتا ہے۔ اوّل تو یہ صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ مصنف نے "رموزِ بیخودی" میں اُن اصول سے بالکل انحراف نہیں کیا جو "اسرارِ خودی" میں اصولِ زندگی قرار دیئے گئے تھے۔ اور دوسرے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں افراد کے لئے خودی اور خودداری ذریعۂ استواری ہے۔ وہاں افراد کا اپنی ہستی قومی میں محو کر دینا اور اپنی انفرادی زندگی کے جزو کو قومی زندگی کے کُل میں شامل کر دینا قومی ترقی کے لئے لازم ہے۔ اور اس کو بیخودی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ گویا یہ وہ بیخودی ہے جو خودداری اور خودشناسی کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ اور جو فرد و قوم دونوں کے لئے عین نفع ہے۔ اس مثنوی میں یہ مضمون کس خوبی سے ادا ہوا ہے۔ ؎

تو خودی از بے خودی نشناختی ۔۔۔ خویش را اندر گماں انداختی

جوہرِ نوریست اندر خاکِ تو          یک شعاعش جلوۂ ادراکِ تو
خوگرِ پیکارِ پیہم دیدمش          ہم خودی ہم زندگی نامیدمش
چوں ز خلوت خویش را بیروں کشد          پائے در ہنگامۂ جلوت نہد
در جماعت خود شکن گردد خودی
تا ز گلبرگے چمن گردد خودی

یہ اُصول ذہن نشین کرتے ہوئے شاعر مطلب کی طرف آتا ہے اور یہ بتلاتا ہے کہ ربطِ افراد کا نام ہی ملّت ہے اور افراد کی ہستی کے قیام کا مدار اسی ارتباط پر ہے۔ اور اس دعویٰ کی زبردست دلیل نیچر کا مشاہدہ ہے۔

محفلِ انجم ز جذبِ باہم است
ہستیِ کوکب ز کوکب محکم است

اس ضمن میں کیا اچھا اصول بتایا ہے کہ افرادِ انسانی کو باہم مربوط کرنے کے لئے کسی خاص صاحبِ اثر فرد کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاریخ کے اہم ترین موقعوں پر وہ فرد لباسِ نبوّت میں جلوہ گر ہوا ہے۔ اور اس سے کم ضروری مرحلوں پر رہبرِ کامل کی صورت میں ایسے انسانِ کامل کے اوصاف کیسے اچھے پیرائے میں بیان کئے گئے ہیں۔ ؎

تا خدا صاحبدلے پیدا کند          کو ز حرفے لغزۂ انشا کند
سازِ پردازے کہ از آوازۂ          خاک را بخشد حیاتِ تازۂ،
زندہ از یک دم دو صد پیکر کند          محفلے رنگیں ز یک ساغر کند
گلستاں در دشت و در پیدا کند
تازہ اندازِ نظر پیدا کند

قوم کا اندازِ نظر بدل دینا یہ ایک بڑا کارنامہ ہے۔ جو خاص اور برگزیدہ آدمیوں کے حصّے میں آتا ہے۔ اور اگر وہ اندازِ نظر صحیح ہے تو اسی سے حیاتِ تازہ پیدا ہوتی ہے۔ اس نئی زندگی کے پروں سے قوم بلند پروازیاں کرتی ہے۔ مگر اس کی بلند پروازیاں آئین کی پابندی پر منحصر ہوتی ہیں۔ یہ ایک عجیب صداقت ہے۔ جس پر اس مثنوی میں جابجا زور دیا گیا ہے۔ کہ آئین یا قانون جو بظاہر پابندی ہے۔ یہی اصول میں آزادی بنا ہے۔ اور جو قومیں آئین کی پابندیاں اپنے اوپر لازم کئے بغیر آزادی کے خواب دیکھتی ہیں وہ ایک خیالِ خام میں مبتلا ہیں۔ جو اُن کو منزلِ مقصود سے ہمیشہ دور رکھے گا۔ اس سلسلہ میں یہ جتایا گیا ہے۔ کہ آئینِ اسلام کا بنیادی پتھر توحید ہے۔ یعنی خدائے واحد پر ایمان لانا۔ ایک کلمہ۔ ایک کعبہ۔ ایک کتاب۔ ایک سُنّت یا دستورِ العمل۔ یہ اینٹیں ہیں جن کے ساتھ وہ بنیادی پتھر مضبوط گڑا ہوا ہے۔ ملّت کے استحکام کے لئے ہم آہنگی کی ضرورت ہے۔ ؎

ملّتِ از یک رنگیٔ دلہا ستے          روشن از یک جلوہ ایں سینا ستے

قوم را اندیشہا باید یکے　　　در ضمیرش مدعا باید یکے

یہ مشہور مسئلہ ہے کہ اسلام میں ملت کی بنا نہ ایک ملک کے باشندے ہونے پر ہے اور نہ ایک نسل پر۔ بلکہ ہم مذہب یعنی ہم عقیدہ اور ہم خیال ہونے پر ہے۔ مگر اس زمانہ میں اکثر لوگ اس رائے کی طرف مائل ہیں۔ کہ یہ ہم خیالی کا رشتہ گو خالی از اثر نہیں مگر ایسا مضبوط نہیں ہو سکتا جیسا وہ رشتہ جس کی بنا قومیت یا وطنیت پر ہو۔ اور اس رائے کی تائید میں بعض ممالک کے جوش قومیت یا وطنیت کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ اور اس کے مقابل میں موجودہ دنیائے اسلام کی منتشرہ اور غیر متحدہ حالت دکھائی جاتی ہے۔ اس مسئلہ پر کوئی قطعی فیصلہ کرنا اس مختصر ریویو میں ممکن نہیں۔ مگر عام اسلامی خیال اب تک مذہبی بنا ہی کو بہتر سمجھتا ہے۔ اور اس بارے میں حضرت اقبال کا مذہب اس خیال کے عین مطابق ہے۔ کہ تائید میں جو دلائل انہوں نے پیش کی ہیں۔ نظم میں آجانے سے ان کا زور دوبالا ہو گیا ہے۔ میرے خیال میں اس سے زیادہ پُر زور الفاظ میں اس مسئلے کو بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ ؎

| | |
|---|---|
| با وطن وابستہ تقدیر امم | بر نسب بنیاد تعمیر امم |
| اصل ملت در وطن دیدن کہ چہ | باد و آب و گل پرستیدن کہ چہ |
| بر نسب نازاں شدن نادانی است | حکم او اندر تن و تن فانی است |
| ملت ما را اساس دیگر است | ایں اساس اندر دل ما مضمر است |
| تیر خوش پیکان یک کیشیم ما | یک نما یک بیں یک اندیشیم ما |
| مدعائے ما مآل ما یکے است | طرز و انداز خیال ما یکے است |

ما ز نعمتہائے او اخواں شدیم
یک زبان و یک دل و یک جاں شدیم

قومی زبان کی بنیاد یکدلی پر رکھ کر قومی خیالات کی تدبیروں کا ذکر شروع کیا گیا ہے۔ پہلے تنبیہہ کی ہے کہ یاس یعنی ناامیدی قومی زندگی کے لئے زہر کا حکم رکھتی ہیں۔ ترقی چاہنے والی قوموں کو چاہیئے کہ ناامیدی کو پاس نہ آنے دیں حوصلے بلند رکھیں۔ اور سرگرم جستجو رہیں۔ ناامیدی عموماً خوف سے پیدا ہوتی ہے یا غم سے۔ اس لئے خوف اور غم سے بھی الگ رہنا چاہیئے۔ اس ہدایت پر عمل کی تاکید کرتے ہوئے مثنوی میں آیات و احکام قرآنی کے حوالے پیش کئے گئے ہیں۔ اور بتلایا گیا ہے کہ سوائے خدا کے کسی سے ڈرنا شانِ ایمان کے خلاف ہے۔ اور جب بیم غیر اللہ سے نجات ہو۔ تو کوئی کام ایسے آدمی کے لئے دشوار نہیں ہوتا۔ ؎

بیم چوں بند است اندر پائے ما
ورنہ صد سیل است در دریائے ما

اس سلسلہ میں ایک حکایت اورنگ زیب عالمگیر کی درج کی ہے۔ جس پر جنگل میں نماز پڑھنے کی حالت میں شیر نے حملہ کیا۔ مگر بادشاہ اس سے نہ ڈرا۔ اور بغیر تاک کر ضرب لگانے کے اس نے خنجر کا ایسا وار کیا کہ شیر کو

ہلاک کردیا اور پھر مصروفِ نماز ہوگیا۔ اس حکایت کو نظم کرتے ہوئے اورنگ زیب کی خدماتِ مذہبی کی تعریف کی ہے۔ اور اس ساری تعریف کی جان یہ شعر ہے جو عالمگیر کی شان میں کہا گیا ہے۔ دوسرے مصرع کی بلاغت خصوصاً قابلِ داد ہے ؎

درمیانِ کارزارِ کفر و دیں
ترکشِ ما را خدنگِ آخریں،

اس کے بعد ملّتِ اسلامی کو بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کا باہمی رشتہ جنابِ رسالتمآب کی ذاتِ بابرکات کی بدولت مضبوط ہے ؎

از رسالت ہم نوا گشتیم ما
ہم نفس ہم مُدّعا گشتیم ما
کثرتِ ہم مُدّعا وحدت شود
پختہ چوں وحدت شود ملّت شود

پھر ملّتِ اسلامی کی خصوصیات چند پُر معنی شعروں میں بیان کی ہیں اور بتایا ہے کہ حُرّیت اور مساوات اس ملّت کی سرشت میں داخل ہیں۔ اسلامی مساوات کی تمثیل کے طور پر ایک دردانگیز تاریخی روایت نظم کی گئی ہے۔ لکھتے ہیں کہ سلطان مراد نے ایک مسجد بنوائی تھی جو ملک خجند کے رہنے والے ایک پردیسی معمار نے بنائی تھی۔ بادشاہ کو اس کی عمارت کچھ ناپسند ہوئی۔ اور اُس نے معمار کا ہاتھ کاٹ دیا۔ اس معمار نے قاضی کی عدالت میں بادشاہ کے برخلاف استغاثہ کیا۔ بادشاہ عدالت میں طلب کیا گیا۔ قاضی نے مقدمہ سننے کے بعد فتوے دیا کہ ؎

عبدِ مسلم کمتر از احرار نیست
خونِ شہ رنگیں تر از معمار نیست

یہ فتوے سُن کر بادشاہ نے اپنا ہاتھ کاٹے جانے کے لئے پیش کیا ؎

چوں مُراد ایں آیۂ محکم شنید
دستِ خویش از آستیں بیروں کشید
مُدّعی را تابِ خاموشی نماند
آیۂ بِالعَدْلِ وَالْاِحْسَان خواند
گفت از بہرِ خدا بخشیدمش
از برائے مصطفےٰ بخشیدمش

یعنی قانون نے ہاتھ کاٹنے کے عوض میں ہاتھ کاٹنے کا فتوے دیدیا۔ مگر خود مستغیث کو رحم آگیا۔ اور اُس نے اپنا بدلہ نہیں لیا۔ اور بادشاہ کو معاف کر دیا۔ آگے چل کر میدانِ کربلا میں حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے متعلق ایک پُر درد باب لکھا ہے جس میں یہ ظاہر کیا ہے کہ حضرت امام حسینؓ کی شہادت حُرّیت کی بنیاد رکھنے کے لئے ایک ضمیرِ انسانی کا حقِ آزادی قائم کرنے کے لئے تھی۔ ؎

ماسوا اللہ را مسلماں بندہ نیست
پیشِ فرعونے سرش افگندہ نیست
خونِ او تفسیرِ ایں اسرار کرد
ملّتِ خوابیدہ را بیدار کرد

اقبالؔ نے ایک باب ہجرت پر لکھا ہے۔ اور یہ سچ ہے کہ اس میں معنی آفرینی کی داد دی ہے۔ مقصود تو اس باب سے وہی ہے جو پہلے بھی بیان ہو چکا ہے۔ کہ ملّتِ اسلام کی بنیاد اپنی یگانگت پر ہے۔ اور کسی خاص ملک یا وطن کی پابند نہیں مگر اس باب میں مصنف نے اپنے دعوے پر ایک زبردست دلیل ہجرتِ نبوی کے ایک مسئلہ واقعہ سے پیدا کی ہے۔ یعنی آنحضرت صلعم جو مکّہ شریف سے ہجرت کر کے مدینہ منوّرہ میں جا بسے۔ اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ وُہ فی الحقیقت دشمنوں سے عاجز آ کر بھاگ گئے تھے۔ بلکہ اس میں یہی حکمت چھپی تھی کہ اسلام کی عالمگیری کی بنیاد پڑے اور اسلام کے نام لیوا ہر جگہ اپنا وطن بنائیں اور وہاں نورِ اسلام پھیلائیں ؎

آنکہ در قرآں خدا او را ستود　　آنکہ حفظِ جان او موعود بود

دشمناں بیدست و پا از ہیبتش　　لرزہ بر تن از شکوہِ فطرتش

پس چرا از مسکنِ آبا گریخت　　تو گماں داری کہ از اعدا گریخت؟

قصّہ گویاں حق ز ما پوشیدہ اند　　معنیٔ ہجرت غلط فہمیدہ اند،

ہجرت آئینِ حیاتِ مسلم است

ایں ز اسبابِ ثباتِ مسلم است

اس کے مقابل میں ملّت کی بنا وطن پر رکھنے کا جو خیال ہے۔ اور جس کے خلاف دلائل چند اشعار میں اس سے پہلے بیان ہو چکی ہیں۔ اُن پر اس باب میں اقبالؔ نے ایک اور دلیل اضافہ کی ہے۔ اور وہ تمام انسانی اغراض کے لحاظ سے ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مختلف جغرافی قطعات میں سے ایک قطعہ بنائے ملّت قرار پانے سے دُنیا میں تنگ خیالی ایسی پھیلی ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کی دشمن بن گئی ہے۔ اور دُنیا میں جنگ و جدل کی کثرت ہو گئی ہے۔ گہری فلسفیانہ نگاہ سے اگر دیکھیں تو عام نوعِ انسان کو اس اُصول سے ضرور نقصان پہنچتا ہے۔ گو وہ محدود جماعتیں جو علیٰحدہ علیٰحدہ قومیں بنی ہوئی ہیں۔ اس اصول کی بدولت جلد ترقی کر جائیں۔ اِن خیالات کو نظم میں یوں بیان کیا گیا ہے۔ ؎

آں چناں قطعِ اخوّت کردہ اند　　بر وطن تعمیرِ ملّت کردہ اند

ایں شجر جنّت ز عالم بردہ است　　تلخیٔ پیکار بار آوردہ است

مردمی اندر جہاں افسانہ شد　　آدمی از آدمی بیگانہ شد

روح از تن رفت و ہفت اندام ماند　　آدمیت گم شد و اقوام ماند

اس مسئلہ سے کہ ملّت اسلامی حدودِ مکانی کی پابند نہیں۔ قدرتی طور پر حدودِ زمانی کی طرف خیال منتقل ہوتا ہے۔ اور اس کے متعلق شاعر نے ایک باب میں یہ بیان کیا ہے کہ ملّت اسلامی کا دوام جریدۂ عالم پر ثبت ہے۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں۔ ؎

رومیاں را گرمِ بازاری نماند  آں جہانگیری جہانداری نماند
شیشۂ ساسانیاں در خوں نشست  رونقِ خمخانۂ یوناں شکست
مصر ہم در امتحاں ناکام ماند  استخوانِ او تہِ اہرام ماند
در جہاں بانگِ اذاں بود است و ہست  ملتِ اسلامیاں بود است و ہست
گر چہ مثلِ غنچہ دلگیریم ما  گلستاں میرد اگر میریم ما

اسلامیوں کو یہ بتانے کے بعد کہ اُن کی ملت اُن کے مذہب پر مبنی ہے۔ اور اُس کے دوام کا وعدہ ہو چکا ہے۔ ان کو یہ یاد دلایا گیا ہے کہ یہ سب جبھی ہوگا کہ وُہ اپنے آئین کے پابند ہوں جو اُن کی آسمانی کتاب یعنی قرآن شریف میں مندرج ہے۔ اس باب میں قرآنِ مجید کی تعریف خوب اشعار میں کی گئی ہے۔ جن میں سے صرف دو یہاں درج کئے جاتے ہیں۔ ؎

نوعِ انساں را پیامِ آخریں  حاملِ او رحمۃٌ للعٰلمیں
گر تو مے خواہی مسلماں زیستن  نیست ممکن جُز بہ قرآں زیستن

آگے چل کر مسلمانوں کو شرع کی پابندی کی تاکید کی گئی ہے ؎

ہست دینِ مصطفےٰ دینِ حیات  شرعِ او تفسیرِ آئینِ حیات
گر زمینی آسماں سازد ترا  آنچہ حق مے خواہد آں سازد تُرا

اگر اسی طرح باقی سب بابوں کا خلاصہ اِس مختصر تبصرہ میں درج کیا جائے تو شاید باعثِ طوالت ہوگا۔ شائقین اصل کتاب کو پڑھیں اور مستفید ہوں۔ مگر دو تین بابوں میں خاص خاص اشعار کا ذکر کئے بغیر بھی رہا نہیں جا سکتا۔ اُن میں ایک تو وہ باب ہے جس میں علمِ تاریخ کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ ترقیِ قومی کے لئے تاریخ دانی لازم ہے۔ یہ مضمون کیسے خوبصورت اور سلیس لفظوں میں ادا ہوا ہے۔ ؎

ربطِ ایّام است مارا پیرہن  سوزنش حفظِ روایاتِ کہن
چیست تاریخ اے زخود بیگانۂ  داستانے۔ قصّۂ۔ افسانۂ
ایں ترا از خویشتن آگہ کند
آشنائے کار و مردِ رہ کند

اِس سے اگلا باب بھی توجہ کے قابل ہے۔ اس میں عورتوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ جتایا گیا ہے کہ اچھے بیٹوں بیٹیوں کی ماں بننا بڑے فخر کی بات ہے۔ اور نوعِ انسان کے صنفِ نازک کا یہہ سب سے بڑا فرض ہے جدید زمانہ میں اس فرض کی طرف جو بے توجہی کا میلان ہے وُہ بہت نقصان دہ ہے۔ ایک گنوار اور بد وضع لڑکی جو کسی نیک اور کارآمد شخص کی ماں بنتی ہے اُس نازنین گلُ اندام سے بہتر ہے جو اپنے اِس اہم فرض سے بے پرواہ ہو یا اُس ذمہ داری کی متحمل ہونے کے ناقابل ہو۔ اِس پیغام کو تو حضرتِ اقبال سے اُنہی کے الفاظ میں سُنئے ؎

آں دُخترکِ رستاق زادے جاہلے   پست بالائے، سطبرے، بدگِلے
ناتراشے، پرورش ناوادۂ   کم نگاہے، کم زبانے، سادۂ
دل ز آلامِ امومت کردہ خوں   گردِ چشمش حلقہ ہائے نیلگوں
ملت ار گیرد ز آغوشش بدست   یک مسلمانِ غیور و حق پرست
ہستیٔ ما محکم از آلامِ اوست   صبحِ ما عالم فروز از شامِ اوست

رسولِ عربی کی بیٹی حضرت فاطمۃ الزہرا کا نامِ مبارک اِس سلسلہ میں مسلمان عورتوں کے لئے نمونہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے وہ اپنی خوبیوں اور نیکی کے لحاظ سے رسولِ کریم جیسے باپ کی پیاری بیٹی حضرت علی جیسے شوہر کی چاہتی بیوی اور حضرت امام حسنؓ و حضرت امام حسینؓ جیسے بیٹوں کی واجب التعظیم ماں تھی۔ اور اُنھوں نے اپنی زندگی میں مثال قائم کی کہ عورت ذات کس طرح اپنی زندگی کے اِن تینوں مرحلوں پر اپنے فرائض کو ادا کرے کہ ساری ملّت کے لئے بہتری کا باعث ہو۔ حضرت فاطمہؓ کی شان میں جو اشعار اقبالؔ کے قلم سے نکلے ہیں۔ وہ اس دِلی ارادت کے ترجمان ہیں جو اقبالؔ کو رسولؐ اور آلِ رسولؐ سے ہے۔ اور ان میں یہ دو شعر آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ صفات کا ایک دریا ہے جو ایک ایک شعر کے کوزے میں بند کیا گیا ہے۔ اہلِ نظر داد دیں گے۔ اور جنہیں تفصیل نہ معلوم ہو وہ صفحاتِ تاریخ و سیر ملاحظہ کریں۔ ؎

آں ادب پروردۂ صبر و رضا   آسیا گردان و لب قرآں سرا
گریہ ہائے او ز بالیں بے نیاز   گوہر افشاندے بدامانِ نماز

آخری باب جس میں مثنوی کے مطالب کا خلاصہ اور سورۂ قل ھو اللہ احد کی تفسیر ہے۔ خاص طور پر پڑھنے کے لائق ہے۔ کتاب کا خاتمہ عرضِ حالِ مصنّف پر ہوتا ہے۔ جو بارگاہِ رسالت مآبؐ میں کی گئی ہے۔ اس میں مسلمانوں کی موجودہ حالت کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ وہ راستے سے دُور جا پڑے ہیں۔ اُن کے "شیخ و برہمن" سے زیادہ بت پرست ہو گئے ہیں۔ کیونکہ اُن کے دماغوں میں بُت جو مندر سے نکل گئے ہیں۔ جو صفات پہلے غیر مُسلموں سے مخصوص تھیں۔ وہ اُنھوں نے سیکھ لی ہیں۔ موت سے نہ ڈرنے کی بجائے ڈرنے لگے ہیں۔ عرب کی بجائے عجم کی تقلید میں مُبتلا ہیں۔ دُعا ہے کہ اُن کو جو پیغام اس مثنوی کے ذریعے سوئے حق کی طرف پھر آنے کے لئے دیا گیا ہے وُہ بااثر ثابت ہو اور مقبول ہو۔

آخیر میں چند شعر شاعر نے اپنی ایک دلی آرزو کے اظہار میں لکھے ہیں اور اُن میں درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ اِن شعروں کا مزا اہلِ دل اور فدایانِ نبیؐ لیں گے ؎

ہست شانِ رحمتت گیتی نواز   آرزو دارم کہ میرم در حجاز
مسلمے از ماسوا بیگانۂ   تا کجا زنّاریٔ بُت خانۂ
حیف چوں او را سر آید روزگار   پیکرش را دیر گیرد در کنار

از درت خیزد اگر اجزائے من
وائے امروزم خوشا فردائے من

کرم حیدری

# اقبال کا فلسفۂ تعلیم

برصغیر ہند و پاکستان میں جتنا کچھ اقبال، اور اُس کے کلام اور پیام کے متعلق لکھا گیا ہے شاید ہی آج تک کسی بھی اور فردِ واحد کے متعلق لکھا گیا ہو۔ لیکن اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو جو کچھ اقبال کے متعلق لکھا گیا ہے اُس کی شخصیت اُس کا مقام اور اُس کا پیغام اُس سے کہیں زیادہ لکھے جانے کا متقاضی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بہت سے لکھنے والوں نے محض اُوپر اُوپر اُٹھنے والی لہروں کا مشاہدہ کر کے اپنے اپنے قیاس کے مطابق اُس بحرِ ذخار کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے جو اِن اوپری لہروں کے نیچے اپنے دامن میں علم و حکمت کے بے بہا موتی سمیٹے ہوئے ایک ازلی ابدی کشمکش میں مصروف ہے۔ جس طرح معمولی روشنی کی شعاعیں سمندر کی تہہ تک پہنچنے میں ہماری رہنمائی نہیں کر سکتیں اُسی طرح اقبال کے کلام کی تہہ تک پہنچنے کے لئے محض علمِ ظاہر ہماری معاونت نہیں کر سکتا۔

اقبال کے متعلق لکھنے والوں نے سب سے زیادہ اُس کے فلسفۂ خودی کی توضیح و تشریح کرنے کی کوشش کی ہے۔ کچھ لوگوں نے زمان و مکان کے متعلق اس کے تصورات پر بھی بحث کی ہے لیکن تصوّرِ زمان و مکان چونکہ خالصتاً علمی اور فلسفیانہ موضوع ہے اِس لئے بحث کرنے والوں نے عام طور پر اس میں ٹھوکریں کھائی ہیں۔ اقبال کی عام اصطلاحات مردِ مومن، قلندر، حکیم، کلیم، شاہین اور عقاب پر بھی لوگوں نے بہت کچھ زورِ قلم صرف کیا ہے اور اُس کے فوق البشر کے متعلق بھی طویل بحثیں کی گئی ہیں مگر جس چیز پر سب سے کم توجّہ صرف کی گئی ہے وُہ اقبال کا فلسفۂ تعلیم ہے۔ آج سے چند سال پہلے اقبال کے متعلق ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کی ایک فاضلانہ تصنیف "فکرِ اقبال" کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب اُن بزرگوں میں سے ایک تھے جنھیں اقبال کے ساتھ بیٹھنے کے مواقع بکثرت نصیب ہوئے۔ اِس کے علاوہ اُن کی اپنی افتادِ طبع بھی فلسفیانہ تھی مزید برآں وہ ہمارے ملک کے ایک بڑے نامور، ماہرِ تعلیم بھی تھے۔ توقع تھی کہ اُن کے ہاں اِس موضوع پر بہت کچھ ملے گا لیکن اُنھوں نے بھی اقبال کے نظریۂ تعلیم پر بحث نہیں کی۔ اُسی سال "نقوشِ اقبال" کے نام سے ایک کتاب شائع ہوئی جو آقائے رازی اور علاّمہ عرشی کے مقالات پر مشتمل ہے۔ آقائے رازی گورنمنٹ کالج لاہور میں ادبیاتِ فارسی کے پروفیسر تھے اِس لئے تعلیم سے براہِ راست متعلق تھے لیکن یہ کتاب بھی اقبال کے فلسفۂ تعلیم کے متعلق خاموش ہے۔ اقبال کے فکر و فن کے متعلق ایک نہایت عمدہ، گراں بہا اور قابلِ قدر تصنیف "روحِ اقبال" ہے جو اپنے اعلیٰ معیارِ تنقید کی بنا پر برِّصغیر کے تمام علمی حلقوں میں بڑی قدر و منزلت حاصل کر چکی ہے لیکن اِس کتاب میں بھی اقبال کے نظریۂ تعلیم پر سیر حاصل تبصرہ

نہیں کیا گیا۔

اِس سلسلے میں ہم اقبال کے ناقدین پر کوئی الزام بھی نہیں دھر سکتے ۔ چونکہ اقبال نے خود تعلیم کے متعلق براہِ راست بہت کم کہا ہے اِس لئے ہر ناقد کی نظر اُس مخصوص فلسفۂ حیات کی طرف ہی جاتی ہے جس کی تبلیغ اُنھوں نے زندگی بھر نہایت شدّ و مد سے کی ہے اور یہ مخصوص فلسفۂ حیات اُن کا فلسفۂ خودی ہے ۔

اگر ہم اس امر کو تسلیم بھی کر لیں کہ اقبال ایک فلسفۂ حیات کے داعی تھے اور نظری اختلافات کے لئے تمام تر گنجائش رکھتے ہوئے بھی یہ فلسفۂ حیات جامع اور مکمل ہے تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ تعلیم و تربیت کے متعلق بھی اُن کے خیالات واضح اور مکمل تھے کیونکہ کوئی فلسفۂ حیات بھی تعلیم و تربیت جیسے اہم اور بنیادی پہلو کو نظر انداز نہیں کر سکتا ۔ اور ہر چند کہ اقبال نے اپنی گراں مایہ تصانیف میں فلسفۂ تعلیم کو اُس تفصیل سے بیان نہیں کیا جس تفصیل سے کوئی ماہرِ تعلیم بیان کرتا ۔ تاہم ہمیں اُن کے کلام میں اُس تفصیل کے اجمالی خاکے ، جو اپنی جگہ بالکل واضح اور مکمل ہیں ضرور ملتے ہیں ۔ ہمیں ایک فلسفی اور شاعر سے اجمالی خاکوں سے زیادہ کی توقع بھی نہ رکھنا چاہیئے ۔ اِن خاکوں میں رنگ بھرنا اُن ماہرینِ تعلیم کا کام ہے جو تعلیم و تربیت کے اہم قومی اور ملکی مسئلے کے تمام عملی پہلوؤں پر نظر رکھتے ہیں اور جن کا کام اِس بنیاد پر ملّت کی آئندہ تعمیر و تشکیل ہے ۔

سترھویں صدی کے آغاز میں یورپی اقوام نے اپنے ملکوں سے نکل کر تجارت اور تسخیرِ ممالک کے میدان میں قدم بڑھانے شروع کئے ۔ نئی دُنیا کی دریافت اور وہاں کے بے پناہ ذخائرِ دولت کی درآمد نے اُن کے سینوں میں نئے نئے ولولے اور نئی نئی اُمنگیں پیدا کیں ۔ اٹھارویں صدی کے وسط تک یہ اقوام ترقی کی کئی منازل طے کر چکی تھیں سائنسدانوں کی نت نئی ایجادات اور سائنس کی پیش قدمی نے اہلِ یورپ کے ذہنی اُفق میں بڑی وسعت پیدا کر دی تھی ۔ انہیں اپنی صلاحیتوں کا احساس ہو چکا تھا یا اقبال کے الفاظ میں اُن کی خودی بیدار ہو چکی تھی اور وُہ اِن صلاحیتوں کو بطریقِ احسن بروئے کار لا رہے تھے ۔ اِدھر ایشیا اور افریقہ میں جہاں بیشتر علاقوں میں مسلمانوں کو عددی تفوّق حاصل تھا ۔ اور نیل کے ساحل سے لے کر خاکِ کاشغر تک اور طرابلس الغرب کے میدانوں سے لے کر ملایا اور انڈونیشیا کے سبزہ زاروں تک تہذیبی تفوّق کے مالک بھی وہی تھے اقبال مندی کا سورج ڈھل رہا تھا ۔ مسلمان اپنی بارہ سو سالہ جد و جہد کی زندگی کے بعد گویا تھک کر ستا رہے تھے ۔ تاریخِ انسانی کے سٹیج پر ایک طویل عرصے تک نمایاں ترین کردار ادا کرتے رہنے سے اب اُن کے قوائے ذہنی و جسمانی انحطاط پذیر ہو رہے تھے ۔ وُہ سیلِ بے پناہ جو کسی زمانے میں تمام بلندیوں اور پستیوں کو روند چکا تھا بلکہ یوں کہیئے کہ بلند و پست کو ایک کر چکا تھا اب چھوٹی چھوٹی ندیوں میں بٹ کر بعض سنگ ریزوں پر ہی قناعت کئے ہوئے تھا ۔ دیارِ مغرب پر عظمت و اقبال کا سُورج نصف النہار پر تھا اور ارضِ مشرق پر شام کے دھندلکے گہرے ہوتے چلے جا رہے تھے ۔

سرزمینِ ہند میں جو ایران کے بعد اسلامی تہذیب و تمدّن کی سب سے بڑی جولانگاہ تھی مسلمانوں کی قوتیں منتشر ہو چکی تھیں شمشیر و سناں کا زمانہ ختم ہو چکا تھا ۔ اور طاؤس و رباب کا دور دورہ تھا ۔ طاؤس و رباب کے نغموں میں بھی وُہ ہمہ گیری اور بلند آہنگی مفقود ہوتی چلی جا رہی تھی جو دو صدیاں پہلے مُغل دربار کا طُرّۂ امتیاز تھی اور جس کی گونج وسط ایشیا اور مشرق قریب سے گزر کر ڈینیوب کے کناروں بلکہ اطلانتک کے سواحل تک سُنی جاتی تھی ۔

اِن حالات میں یورپین اقوام اور ہندی مسلمانوں میں تصادم ہوا۔ یہ تصادم دو فوجی قوتوں یا دو حکومتوں کا نہ تھا بلکہ دو تہذیبوں کا تھا۔ ایک تہذیب اپنی اٹھان پر تھی دوسری زندگی کے آخری مراحل طے کر رہی تھی۔ ایک برفانی پہاڑوں سے پھوٹنے والا تند و تیز دریا تھا دوسری تپتے ہوئے میدانوں میں نرم و گرم ریت کی آغوش میں سوئی ہوئی ندی۔ ایک کو اپنے بلاؤ کے سامنے شش دانگ عالم کی وسعتیں تنگ نظر آ رہی تھیں اور ایک پر اپنے گھر کی چار دیواری تنگ ہو رہی تھی۔ اس کشمکش کا نتیجہ وہی ہوا جو تاریخی عوامل اور جدلیاتی فلسفے کے اعتبار سے ہونا چاہیئے تھا۔ مسلمانوں کی قوت و حشمت کی بساط لٹ گئی اور وہ چراغ جسے خواجہ معین الدین اجمیری رح، سید علی ہجویری رح اور خواجہ نظام الدین اولیاء رح جیسے بزرگوں نے اپنے نفسِ گرم سے روشن کیا تھا اور جسے ایک ہزار سال تک افغانوں، ترکوں اور مغلوں نے اپنے خون سے روشن کئے رکھا تھا لال قلعہ کے سرمودیں طاقوں میں گل ہو کر رہ گیا۔ اس کے بجھنے سے مسلمانوں کے دل و دماغ پر یک لخت یاس و اندوہ کی ظلمتیں چھا گئیں۔ آخری دور میں چند کرنوں نے کاویری، ہگلی اور جمنا کے کنارے اُفقِ مغرب سے آنے والی تاریکیوں سے نبرد آزما ہونے کے لئے بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے لیکن بادِ مخالف کچھ اس شدت سے چل رہی تھی کہ ؎

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

زوال و انحطاط کے اِس دور میں مسلمانوں کے اندر دو مکتبہ ہائے فکر کام کرنے لگے۔ ایک مکتبۂ فکر وہ تھا جس کی داغ بیل شاہ ولی اللہؒ دہلوی اور ان کے خانوادۂ پاک نے ڈالی تھی۔ دوسرا مکتبۂ فکر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد وجود میں آیا۔ اِس کی بنیاد رکھنے والے سید احمد خاں تھے۔

شاہ ولی اللہ رح کا مکتبۂ فکر جد و جہد یعنی زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز کا علم بردار تھا۔ اِس فکر کا مرکزی نقطۂ نگاہ جہاد تھا اور جہاد بھی بالسیف۔ اِس مکتبۂ فکر کے پیرو کفر و اسلام میں کبھی سمجھوتے کے قائل نہ تھے۔ وُہ راہِ خدا میں سر کٹانا اور گھر لٹانا جانتے تھے۔ دشمنانِ دین سے براہِ راست ٹکرانا اور شکست پر شکست کھا کر بھی ہار نہ ماننا اُن کا مسلک تھا۔ وُہ اپنے سر کو جو خدائے وحدہٗ لاشریک کے آستانے پر جھکتا تھا کسی اور دروازے پر جھکانے کے لئے تیار نہ تھے۔ وُہ فتح یا موت کے قائل تھے۔ درمیانی راستہ چاہے کتنا ہی دلفریب اور پُرکشش ہو اُنہیں قبول نہ تھا۔

مغلیہ سلطنت کے انحطاط کے ساتھ ہی اِس تحریک کا آغاز ہو چکا تھا۔ اِس تحریک کے سربراہ ہندی مسلمانوں کے انجام کا اندازہ ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے کر چکے تھے۔ چنانچہ ملکی اور غیر ملکی دشمنوں کے ساتھ اُن کے پے در پے تصادم ہوئے اور ۱۸۵۷ء تک احیائے اسلام کی یہ عملی تحریک دشمنوں کی ریشہ دوانیوں اور دوستوں کی کج فہمیوں کے باعث کئی زخم کھا چکی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے سانحۂ عظیم کے بعد تو مسلمانانِ ہند کو اپنی ہستی ہی خطرے میں نظر آنے لگی۔ انگریزوں کی نگاہ میں ہر مسلمان سرکش اور باغی تھا۔ اِس لئے اُس کی سرکوبی لازمی تھی۔ اُس پُر آشوب زمانے میں سید احمد خاں ایک عزمِ مجاہدانہ لئے ہوئے آگے بڑھے اور نہ صرف مسلمانوں کی کشتیٔ حیات کو نذرِ طوفاں ہونے سے بچا لیا بلکہ اُن کے سامنے زندگی کا ایک نیا لائحہ عمل بھی رکھا۔

سرسید احمد خاں کی تحریک حقیقت پسندی پر مبنی تھی وُہ جان چکے تھے کہ ہر قوم کے لئے اجل یعنی ایک میعادِ عمل ہے۔ فرمانِ خداوندی کے مطابق اِس برِّعظیم میں مسلمانوں کی حاکمیت کی زندگی ختم ہو چکی ہے۔ نیا سورج اُبھر رہا ہے۔ اِس لئے ڈوبتے ہوئے تاروں کا ماتم کرتے رہنے یا آنکھیں مُوند کر نئے سُورج کے وجود سے انکار کرتے رہنے سے کچھ نہ بنے گا۔ اِس وقت مصلحت یہی ہے کہ اس نئے سورج کی تابانیوں سے استفادہ کیا جائے۔ اپنی کمزوریوں کا محاسبہ کیا جائے اور نئے زمانے کی تابانیوں کو اپنی ذات میں سمو لینے کی جدوجہد کی جائے۔ اِس کلتۂ فکر کی بنیاد سمجھوتے پر تھی۔ مشرق اور مغرب میں سمجھوتہ۔ قدیم اور جدید میں سمجھوتہ۔ زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز کا اصول۔ جو لوگ قوموں کے عروج و زوال کے اسباب و علل پر گہری نظر نہ رکھتے تھے جو دماغ کی بجائے دل، معنی کی جگہ لفظ، اور غور و فکر کے بدلے جذبات سے کام لینے کے عادی تھے اُنہیں سمجھوتے کی یہ تحریک ایک آنکھ نہ بھائی۔ اُنھوں نے صرف موافقت نہ کرنے پر بس نہ کی عملی مخالفت بھی کی۔ لیکن سمجھوتے کی اِس تحریک کو کامیاب ہونا تھا سو ہوئی۔ کیونکہ واقعات و حالات کا ظہور تاریخی عوامل کے تابع ہوتا ہے اور جس دَور میں تاریخی عوامل کا جو تقاضا ہوتا ہے حالات اور واقعات اُسی نہج پر چل نکلتے ہیں اور وہ شخصیتیں بھی جو ہمیں حالات و واقعات کا رُخ موڑتی ہوئی نظر آتی ہیں درحقیقت اُنہی تاریخی عوامل کے زیر اثر نشو و نما حاصل کرتی ہیں۔

انیسویں صدی کے اواخر تک مسلمان سمجھوتے کی اِس تحریک کی طرف پُوری طرح مائل ہو چکے تھے۔ اُنھوں نے اپنی زندگی کے اِس نئے دَور کے لئے مغربی علوم اور کسی حد تک مغربی طرزِ معاشرت کو بھی اپنا لیا تھا۔ اس کے باوجود یہاں یہ کہنا غیر ضروری نہ ہوگا کہ دُنیائے اسلام میں صرف ہندی مسلمان ہی ایسے تھے جنھوں نے مغربی علوم کے حصول کے ساتھ ساتھ اپنی ملّیت اور قومی خصوصیات کو برقرار رکھا تھا۔ حالانکہ استیلائے مغرب کی زد سب سے زیادہ انہی پر پڑی تھی۔ اب مسلمان طلباء نہ صرف اندرونِ مُلک انگریزی زبان اور جدید مغربی علوم کی تعلیم حاصل کرنے لگ گئے تھے بلکہ سینکڑوں نوجوانوں نے خود انگلستان کی یونیورسٹیوں میں جا کر ان علوم کی تکمیل کی۔ انہی نوجوانوں میں سے بہت سے ایسے نکلے جنھوں نے آگے چل کر ہندوستانی مسلمانوں کے طرزِ فکر و نظر پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ اُنہی میں سے ایک اقبال بھی تھے جن کا اثر غالباً سب سے گہرا اور سب سے زیادہ دُور رس ہے اور جوں جوں زمانہ گذرتا چلا جائے گا یہ اثر اور زیادہ ہوتا چلا جائے گا۔

بظاہر یہ ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ ہندوستان میں انگریزی استعمار کے سب سے بڑے حریف اور سب سے بڑے دشمن جنھوں نے اِس استعمار کا مقابلہ کیا اور بالآخر اسے ختم کر کے دم لیا وُہی لوگ تھے جنھوں نے سرزمینِ انگلستان میں تعلیم حاصل کی تھی اور اپنی زندگی کا بڑا حصّہ اُس ملک میں بسر کیا تھا۔ لیکن درحقیقت یہ چیز اصولِ فطرت کے عین مطابق ہے کیونکہ ہر خلیل کسی آذر کے گھر میں اور ہر موسیٰ کسی فرعون کے ہاں نشو و نما حاصل کرتا ہے۔ جن لوگوں نے انگریزوں کے درمیان رہ کر اُن کی زندگی اور معاشرے کا نہایت قریب سے مطالعہ کیا وہی اُس طلسم سے آزاد ہوئے جو سات ہزار میل کی دوری کے باعث عام ہندوستانیوں کی آنکھوں کے سامنے ایک نظر فریب پردہ بنا ہُوا تھا۔ اُن پر دانشِ مغرب کی تمام حقیقت فاش ہو گئی اور اُنہیں احساس ہو گیا کہ اپنی تمام ظاہری چمک دمک کے باوجود

یہ دانش نوعِ بشر کے لئے ایک عذاب سے کم نہیں۔ اقبال اسی بنا پر فرماتے ہیں کہ

عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں ۔۔۔ کہ میں اِس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل

مجھے وہ درسِ فرنگ آج یاد آتے ہیں ۔۔۔ کہاں حضور کی لذّت، کہاں حجابِ دلیل

عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہونے کے بعد اپنے ہم قوم اور ہم وطن لوگوں کو اس عذاب کی ماہیت سے باخبر کرنا اور اس عذاب سے بچانے کی کوشش کرنا اقبال کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد قرار پا گیا اور اِس مقصد کے حصول کے لئے اُنھوں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ صرف کر دیا۔ اُن کی تمام عمر مغربی استعمار کے خلاف لڑتے لڑتے گزر گئی۔ اِس استعمار نے اُنہیں اپنے ارادوں سے باز رکھنے کے لئے طرح طرح کے دام بھی پھیلائے لیکن وُہ مُرغِ بلند آشیاں جو فطرت سے عالی ہمّتی کا جوہر لے کر آیا تھا اِس دام میں کہاں آنے والا تھا اُس نے اپنے ہم صفیروں کو بھی آگاہ کیا کہ

اے طائرِ لاہوتی، اُس رزق سے موت اچھی ۔۔۔ جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

مغربی تہذیب و تمدّن اور فلسفہ و علوم جن کی تمام تر بنیاد مادیت پر تھی اُن کا بغور مطالعہ کرنے اور اُن کا موازنہ اور مقابلہ مشرقی علوم و فنون اور تہذیب و تمدّن سے جن کی بنیاد روحانیت پر تھی کرنے کے بعد اقبال نے اقوامِ مشرق کے لئے بالعموم اور مسلمانوں کے لئے بالخصوص ایک عملی فلسفۂ حیات پیش کیا۔ یہ فلسفۂ حیات شاہ ولی اللہ کے مکتبۂ فکر اور سیّد احمد خاں کے مکتبۂ فکر کے بین بین اعتدال کا ایک راستہ تھا اور مختصراً اِس کی خصوصیات یہ تھیں۔

۱۔ مغربی تہذیب و تمدّن کے خلاف بغاوت

۲۔ اہلِ مغرب کی استعماریت کے خلاف عملی جدوجہد

۳۔ علومِ مغربی سے بقدرِ ضرورت و ہمّت استفادہ

شاہ ولی اللہ رح کے مکتبۂ فکر کے پیرو مغربیت سے قطعاً نفرت کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اُن کے نزدیک انگریزی زبان کا پڑھنا پڑھانا بھی غلط بلکہ ناجائز تھا۔ سرسیّد سکول کے حامی نہ صرف انگریزی زبان اور یورپی علوم و فنون کے حصول کو اپنی ترقی کے لئے لازمی خیال کرتے تھے بلکہ یورپ کی مادّی ترقّی سے مرعوب ہو کر وُہ یورپی تہذیب و تمدّن کی برتری کے بھی قائل تھے۔ یہ دونوں راستے اعتدال سے ہٹے ہوئے تھے۔ یورپی علوم و فنون کی حیثیت اپنی جگہ مسلّم تھی لیکن احساسِ کمتری سے اِس تہذیب کے سامنے ہتھیار ڈال دینا بھی غلط تھا۔ خدا نے علم و حکمت کو خیرِ کثیر کہا ہے چنانچہ اقبال نے اِسی خدائی فرمان کی یاد دلاتے ہوئے مسلمانوں سے کہا ہے کہ

گفت حکمت را خدا خیرِ کثیر ۔۔۔ ہر کجا ایں خیر را بینی بگیر

اِس سلسلے میں رسول اکرم م کے ارشادات واضح ہیں۔ جب حکمت کو مومن کی گمشدہ متاع کہتے ہیں اور چین تک بھی جا کر علم حاصل کرنے کی تلقین فرماتے ہیں تو اس کا مطلب یہی ہے کہ دنیوی اور سائنسی علوم کو بھی اُسی ذوق و شوق سے حاصل کیا جائے جس ذوق و شوق سے دینی علم حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ تاہم یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیئے

کہ جہاں حصولِ علم انسانیت کے بہت بڑے مقاصد میں ایک ہے وہاں یہ مسئلہ نہایت احتیاط طلب بھی ہے۔ علم نور بھی ہے اور حجاب بھی۔ العلم حجاب الاکبر ایک بہت بڑی اور ٹھوس حقیقت ہے۔ عام طور پر لوگ خصوصاً ناپختہ نوجوان دوسری اقوام کے علوم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ غیر شعوری طور پر اُن کے وہ اصولِ حیات بھی اپناتے چلے جاتے ہیں جو اُنہیں احساسِ کمتری میں مبتلا کرکے دوسری اقوام کا صیدِ زبوں بنا دیتے ہیں۔

آہ مکتب کا جوانِ گرم خوں　　　ساحرِ افرنگ کا صیدِ زبوں

صیدِ زبوں بن جانے کی وجہ پیرِ رومی کی زبانی سُنئے ؎

مرغِ پرنارستہ چوں پرّاں شود　　　طعمۂ ہر گربۂ درّاں شود

چنانچہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ یہ مرغانِ پرنارستہ جب مغرب کی علمی فضاؤں میں اُڑتے ہیں تو اکثر و بیشتر گربۂ تہذیب کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ اس طرزِ معاشرت، طریق رفتار و گفتار لباس اور چال ڈھال ہی کو قوت و عظمت کی اساس سمجھنے لگتے ہیں۔ بیسویں صدی کے نصف اوّل میں مشرقی اقوام نے جس تیزی سے مغربی رسوم و عادات کو اپنایا ہے وہ اسی مرعوبیت اور احساسِ کمتری کی دلیل ہے۔ اقبال اُنہیں آگاہ کرتے ہیں کہ

قوتِ مغرب نہ از چنگ و رباب　　　نے ز رقصِ دخترانِ بے حجاب
نے ز سحرِ ساحرانِ لالہ رُوست　　　نے ز عریاں ساق و نے از قطعِ موست
محکمی او را نہ از لادینی است　　　نے فروغش از خطِ لاطینی است
قوتِ افرنگ از علم و فن است　　　از ہمیں روغن چراغش روشن است

ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سی مشرقی اقوام نے اور بدقسمتی سے زیادہ تر مشرقِ وسطیٰ اور مشرقِ قریب کے مسلمانوں نے چنگ و رباب، رقص و سرود، ساقِ عُریاں اور قطعِ مُو ہی کو ترقی و تمدن کی بنیاد سمجھ لیا۔ یہاں تک کہ ترکوں نے اسی سات سو سالہ علمی اور ثقافتی روایات سے قطع تعلق کرکے خطِ لاطینی بھی اختیار کرلیا اور علم و فن بالخصوص سائنسی علوم و فنون کی طرف وہ توجہ نہ دی جو اہلِ مغرب کی ترقی کا حقیقی سبب تھی۔ اِس شعر میں اقوامِ مشرق کی نقالی اور کورانہ تقلید پر کس قدر بھرپور طنز ہے ؎

حکمت از قطع و بریدِ جامہ نیست　　　مانعِ علم و ہنر عمّامہ نیست

علم و ہنر جہاں قطع و برید جامہ کا پابند نہیں اور عمّامہ مانعِ علم و ہنر نہیں ہو سکتا وہاں یہ نکتہ بھی ذہن نشین کرلینا چاہیئے کہ علم کی دو بڑی شاخیں ہیں ایک علم طاغوتی اور دوسری علم لاہوتی۔ طاغوتی علم وہ ہے جو انسان کو سرکشی اور تمرّد سکھاتا ہے اور لاہوتی وہ علم ہے جو اُسے اِس راستے سے بچاتا ہے۔ طاغوتی علم کی بدولت انسان اپنی معمولی سی صلاحیتوں کا مشاہدہ کرتا ہے تو فرطِ مسرت سے جھوم اُٹھتا ہے اور بے اختیار اَنَا وَلا غَیرِی کا نعرہ بلند کرتا ہے اور جس طرح رات کی تاریکی میں کسی ویرانے میں چمکنے والا تنہا جگنو یہ سمجھتا ہے کہ فضائے بسیط میں صرف وہی روشنی کا منبع ہے اسی طرح آدمی اس زعمِ باطل کا اسیر ہو جاتا ہے کہ تمام کائنات میں وہی وہ ہے۔ یہ لادینی خرد جُوں جُوں زیادہ پختہ کار ہوتی جاتی ہے ترقی

یُوں دنیا اور اُس میں بسنے والے اپنے ہی ابنائے جنس کی ہلاکت و بربادی کے سامان مہیا کرتے ہیں۔ اور جیسے جیسے بربادی اور ہلاکت کے سامان زیادہ ہوتے چلے جاتے ہیں ویسے ہی ویسے آدمی انانیت کے نشے میں اور زیادہ مدہوش ہوتا چلا جاتا ہے اسی علم کے متعلق اقبالؔ فرماتے ہیں ؎

علم را بے سوزِ دل خوانی شر است  نورِ اُو تاریکیٔ بحر و بر است
عالمے از غازِ اُو کور و کبود  فرودینش برگ ریز ہست و بود
بحر و دشت و کوہسار و باغ و راغ  از بم طیارۂ اُو داغ داغ
علم بے عشق است از طاغوتیاں  علم با عشق است از لاہوتیاں

یعنی علم ہو لیکن علم با عشق ہو۔ اِس کا پس منظر دینی اور بنیاد روحانیت پر ہو۔ اِس کا مقصد بنی نوعِ انسان کی خیر و فلاح ہو۔ علم و دانش کو اگر ہم ایک پھُول کھلانے والا سدا بہار پودا سمجھیں تو اِس پودے کے لئے ذہن کی زمین بھی ایسی ہونی چاہیے جس میں یہ پودا ترو تازہ رہ سکے اور اس کے ساتھ وہی پھُول لگیں جو دماغی اور روحانی کثافتوں کو دُور کر سکیں۔ اگر ہمارے ذہن کی زمین میں ایمان و ایقان کی بجائے کفر و الحاد کی مٹی ہو گی تو پھُول بھی وُہ کھلیں گے جو دیکھنے میں تو ترو تازہ اور خوش رنگ ہوں گے اور اُن میں خوشبوئیں بھی ہوں گی لیکن یہ ترو تازگی اور خوش رنگی ہمیں فریبِ نظر میں مبتلا کر دے گی اور خوشبوؤں میں ایسا زہر ہوگا جو انسانیت کے جوہرِ لطیف کو ہلاک کر دے گا۔

اقبالؔ نے اپنے کلام میں جابجا مدرسے اور مکتب کو لتاڑا ہے اُس کی وجہ یہ نہیں کہ ان دانشکدوں سے خواہ مخواہ کی کدّ ہے بلکہ وجہ صرف یہ ہے کہ اِن میں جو علم و ہنر جوانوں کو سکھایا جاتا ہے وُہ سوزِ عشق سے خالی ہے۔ اِس علم سے دماغ تو منوّر ہو جاتے ہیں لیکن دلوں میں سوز و ساز پیدا نہیں ہوتا۔ یہ علم گویا عصرِ حاضر کی برقی قوّت کی طرح ہے کہ اِس کی لہر سے انسان کا گھر بھی روشن ہو جاتا ہے لیکن ایک جھٹکے سے وُہ ابدی نیند بھی سو جاتا ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ مدرسہ و مکتب میں نئی نسل کا گلا گھونٹا جا رہا ہے اور لَا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ کی صدا جو مسلمان کے جسم میں رُوح کا مرتبہ رکھتی ہے اب کہیں سنائی نہیں دیتی ؎

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا  کہاں سے آئے صدا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ
اُٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے نم ناک  نہ زندگی، نہ محبّت، نہ معرفت نہ نگاہ

سوز و گداز کی اِس بنیادی کمی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان علم کے جوہرِ تابناک سے مستفید ہونے کے باوجود اپنے اندر وُہ اطمینان محسوس نہیں کرتا جو اُسے علم حاصل کرنے کے بعد خود بخود مِل جانا چاہیئے۔ اطمینان تو در کنار حقیقتاً جتنا وہ علم کے میدان میں آگے بڑھتا ہے اُتنا ہی اس کے دِل کے اضطراب اور روح کی پیاس میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ حکمت کے پیچ و خم اُسے زیادہ اُلجھاتے چلے جاتے ہیں۔ وہ راہِ علم کا ایسا مسافر ہوتا ہے جسے اپنی منزل کا کچھ پتہ نہیں اور وُہ فِی کُلِّ وَادٍ یَّھِیْمُوْن کے مصداق مختلف اطراف و جوانب میں بھٹکتا رہتا ہے ؎

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا  اپنے افکار کی دُنیا میں سفر کر نہ سکا

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں اُلجھا ایسا — آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا

ایسا علم بجائے اس کے کہ انسان کو کمالِ انسانیت کی طرف لے جائے اُسے گمراہیوں میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیتا ہے مغرب میں اسی علم نے ایک ایسے معاشرے کو جنم دیا جس میں مرد اپنی مردانہ صفات اور عورت اپنے عورت پن سے محروم ہو گئی۔ انسانوں کے دلوں میں سے محبت کے وہ لطیف جذبات جو مختلف افراد کو ایک دوسرے سے وابستہ رکھتے ہیں جو مرد اور عورت کو ایک پاک جذبے کے تحت ایک خاندان کی بنیاد رکھنے پر آمادہ کرتے ہیں یکسر معدوم ہو گئے۔ اور آج مغرب میں عائلی زندگی تقریباً تباہ و برباد ہو چکی ہے۔ کنبہ یا خاندان جو معاشرے میں ایک مضبوط اکائی کی حیثیت رکھتا ہے تقریباً ختم ہو چکا ہے اور پھر عائلی زندگی کے اس طرح درہم برہم ہونے سے اقوام میں اخلاقی انارکی پھیل گئی ہے۔ اقبال کے نزدیک علمِ مغرب کا دردناک ترین المیہ یہ ہے کہ اُس نے عورت کو جذبۂ امومت سے بیگانہ کر دیا ہے ؎

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ امومت — ہے حضرتِ انساں کے لئے اس کا ثمر موت

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن — کہتے ہیں اُسی علم کو اربابِ نظر موت

بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن — ہے عشق و محبت کے لئے علم و ہنر موت

گویا دین انسانی معاشرے کے لئے اہم ترین بنیادی ضرورت ہے یہ سیاست کے ساتھ ملتا ہے تو اُسے چنگیزی سے بدل کر فاروقی بنا دیتا ہے علم کے ساتھ ملتا ہے تو اُسے نار سے نور اور مار کی جگہ یار بنا دیتا ہے۔ بہادری اور مردانگی سے ملتا ہے تو مرحبی اور عنتری کو شجاعتِ حیدری میں بدل دیتا ہے دولت کے ساتھ ملتا ہے تو اُسے بخلِ قارونی کی بجائے غنائے عثمانی کا لباس عطا کرتا ہے اور انسانی اخلاق سے ملتا ہے تو اُسے ملکوتیت سے بھی بلند تر لے جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ کسی معاشرے میں معنوی انقلاب دین ہی کے ذریعے پیدا کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ نظامِ تعلیم ہی وہ عظیم ترین قوت ہے جو معاشرے کے دھارے کا رُخ بدلتی اور اس کی ہیئت کو متشکل اور متصور کرتی ہے اس لئے اس سرچشمۂ قوت میں اعتدال اور توازن کا قائم رکھنا نہایت ضروری ہے۔ یہ اعتدال اور توازن دین ہی کے ذریعے پیدا کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ نظامِ تعلیم کی بنیاد جب تک دینی افکار کے ذریعے مربوط اور مرصوص نہ کی جائے گی معاشرے کی عمارت کبھی مضبوط اور مستحکم نہیں ہو سکتی۔

صنعتی طور پر اقبال کے فلسفۂ تعلیم میں دوسرے عناصر بھی شامل ہیں۔ ان عناصر میں محنت کوشی، استغنا، تیرِ مقام سے آزادی، خودگری اور خودنگہری اہم تر ہیں۔ محنت کوشی کے متعلق جا بجا اُن کے اشعار ملتے ہیں اور جہاں بھی وہ نوجوانوں کا ذکر کرتے ہیں اُن کے پیشِ نظر وہ نوجوان ہوتے ہیں جو محنت کوش ہوں ؎

قوم را سرمایہ اے صاحب نظر — نیست از نقد و قماش و مال و زر

مالِ او فرزندہائے تندرست — تر دماغ و سخت کوش و چاق و چُست

لیکن افسوس کہ وہ اپنی قوم کے نوجوانوں میں انتہائی تن آسانی اور آرام پسندی دیکھتے ہیں اور اس پر جا بجا آنسو بہاتے ہیں ؎

ایں مسلماں زادۂ روشن دماغ — ظلمت آبادِ ضمیرش بے چراغ

در جوانی نرم و نازک در حریر  آرزو در سینۂ تو زود میر

تن آسانی کا سب سے بڑا نقصان یہی ہے کہ انسان کے دل میں آرزو مر جاتی ہے اور جس کے دل میں آرزو مر جائے وہ کبھی زندہ دل اور باحوصلہ نہیں ہو سکتا۔ تن آسانوں کے لیے زندگی ہمیشہ ایک تماشہ رہتی ہے اور اِس تماشے کو انگبیں میں بدلنے کا نسخہ محض سخت کوشی ہے ؎

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخِ زندگانی انگبیں

حقیقت یہ ہے کہ اقبال نے جس فلسفۂ خودی کی تبلیغ کی ہے وہ سخت کوشی ہی کی ایک ارفع صورت کا نام ہے جب تک کوئی شخص سخت کوش نہ ہوگا وہ اپنی خودی کی نگہبانی نہ کر سکے گا اور انفرادی خودی کی حفاظت نہ ہو سکے تو اجتماعی یا قومی خودی کی حفاظت بھی ناممکن ہے ؎

غافل از حفظِ خودی یک دم مشو  ریزۂ الماس شو شبنم مشو
پختہ فطرت صورتِ کہسار باش  حاملِ صد ابر و دریا بار باش

سخت کوشی اور حفظِ خودی ہی سے قوموں میں قوت اور صلابت پیدا ہوتی ہے۔ دُنیا میں جو ملت بھی سخت کوش اور اپنی خودی کی نگہبان ہوگی وُہی پائیداری اور ثبات حاصل کرے گی اور جو ملت تن آسان اور آرام پسند ہوگی وُہ نیست و نابود ہو جائے گی۔ سخت کوشی ہی سے انسان میں استغنا کا جوہر پیدا ہوتا ہے اور استغنا کا جوہر اُسے سربلند اور ممتاز کرتا ہے۔ اِس استغنا کی تعریف اقبال نے اِن الفاظ میں کی ہے ؎

ز علمِ چارہ سازے بے گدازے  بسے خوشتر نگاہِ پاکبازے
نکوتر از نگاہِ پاکبازے  دلے از ہر دو عالم بے نیازے

شاعری میں اقبال نے شاہین کا جو نیا سمبل تراشا ہے وُہ بھی حقیقتاً بلند اعلیٰ اور ارفع صفات کے اظہار کے لیے ہے۔ شاہین جرأت مند اور سخت کوش ہے۔ اُس کی نگاہ ہمیشہ بلندیوں پر رہتی ہے۔ وہ آزادہ رَو ہے اسے مقام نہیں، پابندِ خانہ و لانہ نہیں۔ خوددار ہے مُردہ شکار پر نہیں جھپٹتا۔ اُس کے اندر بے نیازی اور استغنا کی شان پائی جاتی ہے۔ اقبال جب اپنی ملت کے نوجوانوں کو شاہیں بچے کہہ کر مخاطب کرتا ہے تو اِس سے اُس کی مُراد یہی ہوتی ہے کہ ان نوجوانوں میں وُہ تمام صفات پیدا ہو جائیں جو شاہینوں میں پائی جاتی ہیں۔ حیوانات میں جتنی صفات ہوتی ہیں وہ عام طور پر جبلی ہوتی ہیں لیکن انسان اُنہیں اکتساب کرتا ہے۔ اکتسابِ صفات کے لیے واضح اور ٹھوس خطوط پر تعلیم و تربیت کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ جہاں ممولے تعلیم و تربیت سے شہباز بن سکتے ہیں وہاں شہباز بھی تعلیم و تربیت نہ ہونے سے ممولوں سے ڈرنے لگتے ہیں۔ ایسے ہی غلط طور پر تربیت پائے ہوئے نوجوانوں کے لیے اقبال نے کہا ہے ؎

تنش از سایۂ بالِ تدروے لرزہ می گیرد
چوں شاہیں زادۂ اندر قفس با دانہ می سازد

اِس تمام گفتگو سے ایک نہایت اہم سوال ذہنوں میں اُبھرتا ہے جس کا مختصر سا جواب دئے بغیر یہ گفتگو مکمل نہیں ہوسکتی ۔ وُہ سوال یہ ہے کہ اقبال کے نظریۂ تعلیم کا منتہا کیا ہے یعنی وہ کس قسم کے انسان کی تخلیق کا آرزومند ہے ۔ اِس سوال کا نہایت مختصر اور سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ وُہ مردِ مومن کا آرزومند ہے جس کی تعریف اُس نے اپنی ایک مشہور نظم میں اس طرح کی ہے ؎

| | |
|---|---|
| ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان | گفتار میں، کردار میں، اللہ کی بُرہان |
| قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت | یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان |
| قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے | دُنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان |
| جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وُہ شبنم | دریاؤں کے دِل جس سے دہل جائیں وُہ طوفان |

یہ اقبال کے مکمل انسان کی تصویر ہے ۔ وُہ اپنے مکمل انسان میں چار بڑی صفات دیکھنا چاہتا ہے یعنی قہاری، غفاری، قدوسی اور جبروت ۔ یہ چاروں صفات، صفاتِ الٰہیہ میں سے ہیں گویا ایک مکمل انسان ایک مختصر اور محدود پیمانے پر الوہیانہ صفات کا مظہر ہوتا ہے ۔ اُس میں اور خدا میں فرق یہی ہے کہ خدا کی ذات میں یہ صفات لا محدودیت کا جامہ پہنے ہوتی ہیں اور انسان کی ذات میں یہ صفات محدود ہو جاتی ہیں ۔ اِس کے علاوہ خدا کی ذات میں اور بہت سی ایسی صفات ہیں جو اُس کی ذات کے لئے مخصوص ہیں ۔ انسان اُن صفات کا اکتساب کرنے سے معذور ہے ۔ پھر چونکہ خدا قائم بالذات اور قدیم ہے اِس لئے اُس کی ذات میں جو صفات ہیں وہ بھی قدیم اور لایزال ہیں ۔ انسان چونکہ حادث ہے اِس لئے اُس کی ذات میں اگر چند الوہیانہ صفات پیدا ہوں گی تو وُہ بھی حادث اور زوال پذیر ہوں گی ۔

یہاں یہ ذکر کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ دُنیا کے اکثر بڑے بڑے فلسفیوں نے انسانِ کامل کا خواب دیکھا ہے اور اپنی اپنی دانست کے مطابق اُسے مختلف نام دیئے ہیں ۔ یورپ کے ایک مشہور مفکر نطشے نے بھی انسانِ کامل کا ایک تصور پیش کیا ہے جسے وُہ فوق البشر کے نام سے یاد کرتا ہے ۔ بعض نقادوں نے جن میں سے زیادہ تر مغرب سے تعلق رکھتے ہیں یہ کہا ہے کہ اقبال نے اپنے انسانِ کامل کا تصور نطشے سے مستعار لیا ہے ۔ لیکن انہیں یہ غلط فہمی اِس لئے ہوئی ہے کہ مشرق کے فلسفیوں کے افکار اُن تک نہیں پہنچے ۔ اقبال اور نطشے کے انسانِ کامل میں ایک بنیادی فرق ہے ۔ نطشے کے خیال کے مطابق انسانِ کامل کا ظہور جدلیاتی عمل کا ایک لازمی نتیجہ ہے ۔ گویا وُہ زمان و مکان کی انفرادی قوتوں کی پیداوار ہوگا ۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ فوق البشر کا ظہور اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک زمان و مکان کی انفرادی قوتیں نقطۂ کمال کو نہ پہنچ جائیں ۔ اقبال کا انسانِ کامل زمانی اور مکانی قوتوں کی پیداوار نہیں اور نہ اُس کا ظہور کسی خاص وقت یا بعض خاص حالات کا مرہونِ منت ہے بلکہ زمان و مکان خود اس کے پابند ہیں ۔ اُس کا ظہور ہر دور میں ممکن ہے ۔ بلکہ کامل ترین انسان کا ظہور تو ہو بھی چکا ۔ اب جو کامل انسان آئے گا وُہ اُسی کامل ترین انسان کے نقشِ قدم پر چلے گا ۔ نطشے کا فوق البشر مادی طاقتوں اور قوتوں کا مظہر ہوگا ۔ اُس کی قوتیں بے پناہ اور لا محدود ہوں گی اُن پر کوئی تحدید نہ ہوگی ۔ اقبال کا انسانِ کامل رُوحانی اور

مادّی قوتوں کے لطیف امتزاج کا مظہر ہوگا اور روحانی قوتوں کی باگ اُس کی مادّی قوتوں کو اعتدال اور توازن کے رستے سے نہ ہٹنے دے گی۔ لطیفے کا توق الیشر انسانوں کے لئے باعثِ رحمت بھی ہوسکتا ہے اور باعثِ بربادی و ہلاکت بھی کیونکہ وُہ اپنے سے برتر کسی قوت کے سامنے جواب دِہ نہیں۔ اقبالؔ کا انسانِ کامل محض رحمت ہی رحمت ہے کیونکہ اُسے ہر وقت یہ احساس رہتا ہے کہ وُہ اپنے ہر فعل اور ہر عمل کے لئے ایک بہت برتر قوت کے سامنے جواب دہ ہے اور یہ برتر اور بزرگ قوت دانا، بینا اور دلوں کا حال جاننے والی ہے۔

نصیر احمد ناصر

# اقبال کا فلسفۂ غمِ دیگر

زندگی غم و اندوہ سے عبارت نہیں، جیسا کہ ہندی مذاہبِ فکر (مثلاً ویدانت، بدھ مت، جین مت) اور بعض مغربی یاسیت پسند مفکرین (جیسے شوپن ہاور وغیرہ) کا خیال تھا، یہ شر بھی نہیں، جیسا کہ زرتشت کے متبعین نے گمان کیا، بلکہ "یہ عشقِ حسن" ہے۔

حسن ایک ازلی و ابدی حقیقتِ مطلقہ ہے، جس کے قرب و وصال کی فطری طلب و آرزو اور تلاش و جستجو کو علامہ اقبال نے عشق کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو حسن مقصودِ حیات ہے، اور عشق اس مقصودِ حقیقی کے حصول کا ذریعہ۔ یہ ذریعہ حسین تو ہے لیکن اس میں انسان کو قدم قدم پر بے حضوری و مہجوری اور ہجر و فراق کے صدمات بھی اٹھانا پڑتے ہیں، اس لئے عشق اور درد و غم لازم و ملزوم ہیں اور یہی غمِ عشق ہے، جسے علامہ نے "غمِ دیگر" سے تعبیر کیا ہے۔ اس نے ایک طرف تو علامہ کی اپنی خودی کو زندہ و بیدار کر کے انھیں درویشی و قلندری کے رفیع المرتبت مقام پر پہنچایا، دوسری جانب اُن کی نظر کو بے عدیل گیرائی و گہرائی اور فکر کو بے مثال رفعت و عظمت بخش کر اُن کے کلام کو پُرسوز و اثر انگیز بنا دیا۔ اصل یہ ہے کہ یہ "غمِ دیگر" نہ صرف علامہ کی کُل متاعِ حیات ہے، بلکہ اُن کے فلسفہ و فکر کی روح بھی ہے۔

بہر حال، حسنِ مطلق ایک لاشعور، جامد و ساکت حقیقت کا نام نہیں، جسے بعض مغربی فلاسفہ نے "نیچر" یا فطرت سے تعبیر کیا ہے، بلکہ یہ ایک زندہ و متحرک ہمہ گیر قوت کا نام ہے، جو واحد ہے اور شعوری و ارادی طور پر ہر لحظہ زمان و مکان اور خودی کی تخلیق و ربوبیت کرتی رہتی ہے۔ ربوبیت قرآن حکیم کی اصطلاح ہے، جس کے معنی کسی چیز کی ایک حال سے دوسرے حال تک پرورش، تربیت اور تکمیل کرنے کے ہیں (۱)۔ اس لحاظ سے ربوبیت میں ارتقاء اور کمال کا مفہوم بھی مضمر ہوا۔ یوں تو اس حسنِ مطلق کی، جو احسن الخالقین (۲) بھی ہے، ہر مخلوق میں حسن و کمال پایا جاتا ہے، لیکن جہاں تک انسان کا تعلق ہے، وہ صوری اور معنوی ہر لحاظ سے حسن و کمال کا منفرد و بے مثال پیکرِ حیات ہے (۳)۔

---

(۱) امام راغب الاصفہانی : المفردات فی غریب القرآن، بذیل مادہ

(۲) وَتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِيْنَ (۳۷ : ۱۲۵) فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ (۲۳ : ۱۴)

(۳) وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ (القرآن، ۶۴ : ۳)، وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْۤ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (القرآن، ۹۵ : ۴)

انسان، علامہ اقبال کے نزدیک پیکرِ انسانی کے اندر ایک ایسی زندہ و حرکی اور منفرد و باشعور قوتِ حسن کا نام ہے، جسے روح، نفس، انا اور خودی وغیرہ کئی الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ خودی، چونکہ حسنِ مطلق کے انفاخِ روح سے معرضِ ظہور میں آتی ہے(۱)، اس لئے فطری طور پر اس کی تمام صفاتِ حسنہ سے متصف ہوتی ہے، اور اپنی صفات کو، جو اس میں فطری طور پر بالقوۃ موجود ہوتی ہیں، فعل میں لانے کے لئے بیقرار رہتی ہے، تاکہ وہ اپنی ذات کی تکمیل کرکے اپنا مقصدِ زندگی حاصل کر سکے۔ اب قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خودی کا مقصدِ زندگی کیا ہے؟ علامہ کے نزدیک خودی کا حقیقی مقصدِ حیات حسنِ مطلق کا قرب و وصال ہے اور بس۔ بالفاظِ دیگر یہ حسنِ مطلق ہے، جو خودی کا نصب العین (منصب العین) ہے اور جس کی طلب و جستجو اُسے فطری طور پر ودیعت کی گئی ہے اور جس کے بغیر اُسے طمانیت و سرور حاصل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ یہی وہ "سرور" ہے، جس کا اِس دورِ جدید میں فقدان ہے، جس کا اظہار علامہ نے اپنے اس شعر میں کیا ہے:

کیا غضب ہے کہ اس زمانے میں
ایک بھی صاحبِ سُرور نہیں (بالِ جبریل، ۶۵)

بہرحال، جب خودی کو حسن کا یہ قرب و وصال میسر نہیں آتا، تو اُس کی یہ فطری طلب و آرزو تشنہ رہ جاتی ہے اور یہ تشنگی اگر دائمی ہو، تو اُسے خوف و حزن کے اُس آتشکدے میں مقید کر دیتی ہے جسے جہنّم یا دوزخ کہتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر یہ تشنگی عارضی نوعیت کی ہو اور عارضی فراقِ حسن کی وجہ سے ہو، تو وہ خودی کو ایسا "غم" عطا کرتی ہے، جو اُس کے خوف و حزن کے آتشکدے کو ٹھنڈا کرکے اُسے طمانیت و سُرور کے حسین گلزار میں تبدیل کر دیتی ہے، قرآن حکیم نے اسے جنت اور حسن المآب کی مصطلحات سے تعبیر کیا ہے۔ علامہ اس "غم" کو "غمِ دیگر" کہتے ہیں، جس کا مطالعہ میرے نزدیک علامہ کے فلسفے کی روح کو سمجھنے کے لئے ناگزیر ہے۔ اس "غمِ دیگر" کی حقیقت سمجھنے کے لئے علامہ اقبال کے اُن تصورات کا مطالعہ بھی ضروری ہے، جو اُن کے اِس تصورِ غم سے گہرا تعلق رکھتے ہیں، مثلاً خودی، عشق و آرزو وصال و فراق وغیرہ۔

علامہ کے نزدیک خودی کی حقیقت یہ ہے کہ وہ خودیٔ مطلقہ کے نور کا ایک نقطہ ہے:

نقطۂ نورے کہ نامِ او خودی است
زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی است (اسرار و رموز، ۱۸)

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ "نقطۂ نورے"، جو خودی سے عبارت ہے، انفرادیت کا مالک تو ہے، مگر قائم بالذات نہیں۔ یہ خودیٔ مطلق کے اعتبار سے اُس کی مخلوق ہے، اس لئے وہ تخلیق بالحق بھی ہے اور قائم بالحق بھی:

خودی را از وجودِ حق وجودے — خودی را از نمودِ حق نمودے
نمی دانم کہ ایں تابندہ گوہر — کجا بودے اگر دریا نبودے (ارمغانِ حجاز، ۱۷۳)

---

(۱) ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ط (۳۲: ۹)

حق چونکہ نور ہے (اللّٰہُ نورُ السّمٰوٰتِ والارض: القرآن)، اس لیے خودی میں تمام نورانی صفات کا ظہور بھی حق ہی کی بدولت ہے:

خودی روشن ز نورِ کبریائی است ‏ ‏ ‏ رسائی ہائے او از نارسائی است
جدائی از مقاماتِ وصالش ‏ ‏ ‏ وصالش از مقاماتِ جدائی است

(ارمغانِ حجاز، ۱۷۲)

یہ نورِ کبریائی دراصل خودیٔ مطلق کی صفاتِ حسنہ کا ایک بحرِ بیکراں ہے، جس کا ہر قطرہ جب اپنے خالقِ حقیقی کی ارادی تخلیقی فعلیت سے اپنی اصل سے جدا ہو کر اپنی ایک مستقل، انفرادی حیثیت اختیار کر لیتا ہے، تو اُس کی فطرت کو ایک ساتھ یہ دو آرزوئیں ودیعت ہو جاتی ہیں: اولاً، اپنی انفرادیت کی بقائے دوام کی آرزو، اور ثانیاً، اپنی اصل کے قرب و وصال کی آرزو۔ خودی کی یہ دونوں آرزوئیں، چونکہ فطری ہیں، لہٰذا اس کی انفرادیت کبھی ختم نہیں ہوگی، جیسا کہ بعض ہندی مذاہبِ فکر کا عقیدہ ہے، بلکہ یہ ہمیشہ اپنی انفرادی شخصیت کی مالک رہے گی، جو اُسے "امانت" کے طور پر ودیعت کی گئی ہے۔ اس جگہ اس نکتے کی صراحت ضروری ہے کہ خودی کی اپنی اصل سے قرب و وصال کی فطری آرزو ہی اس کے اعمال و افعال کی محرکِ حقیقی ہے۔ یہی آرزو ہے، جو خودی کے داخلی اور خارجی ماحول کی بوقلمونی و تنوّع کی وجہ سے مختلف صورتیں اختیار کر لیتی ہے، جنھیں جذبات و احساسات، عواطف و میلان، محبت و عشق کئی ناموں سے موسوم کرتے ہیں۔ نیز اسی آرزو کا اعجاز ہے کہ انسان کو ہمیشہ حسن کی طلب و جستجو رہتی ہے، اور اس کا حریفِ اعظم یعنی ابلیس ہمیشہ اس کی اس کمزوری (اعلیٰ مفہوم میں) سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اپنے اس حریفِ دیرینہ کو اس حسن سے محروم کرنے کے لیے قبیح کو حسن بنا کر دکھاتا ہے۔ ابلیس کے اس رنگین فریبِ نظر سے، جو انسان کی گمراہی و شکست اور مجبوری و محرومی کا حقیقی سبب ہے، فقط وہی انسان محفوظ رہتے ہیں، جو صاحبِ دل اور اہلِ نظر ہوتے ہیں، اور یہ وہ خوش قسمت لوگ ہیں جن کی نظر اور دل کا حسن ابلیس کے قبضہ و تصرّف سے محفوظ ہوتا ہے، یعنی اُن کے اپنے قبضہ و تصرّف میں ہوتا ہے۔ یہ یاد رہے کہ یہ نظر و دل کا حسن ہے، جو خارجی حسن کو پہچانتا اور محسوس کرتا ہے۔ حسن کے ان محسوسات کو کیف و سرور، مسرّت و طمانیت وغیرہ حسین ناموں سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے انسان اور ابلیس میں فرق یہ ہے کہ انسان حسن کا عاشق ہے اور اس کی فطری طلب و آرزو رکھتا ہے اور ابلیس حسن کا دشمن ہے اور انسان کو اس سے محروم و مہجور رکھنا چاہتا ہے۔ آدم و ابلیس کی مخاصمت، دراصل حسن و قبح کی آویزش ازلی ہے۔ اس آویزش میں جب انسان مات کھا جاتا ہے تو اس کا دل خوف و حزن کا اسیر ہو جاتا ہے، نتیجتہً زندگی اور اس کا یہ حسین خارجی ماحول جسے دنیا کہتے ہیں، اُس کی حسن سے محروم نظروں میں تاریک و قبیح ہو جاتا ہے اور یاس و ناامیدی اُس کے من کی دنیا کو محیط ہو جاتی ہے۔ اگر ایسے انسان کی یہ شکست مسلسل اور دائمی ہو تو اس کی یاس و ناامیدی کا عالم، جاوداں اور اُس کی اذیتیں ابدی ہو جاتی ہیں۔ اس کے برعکس، اگر انسان اس آویزش میں اپنے حریفِ اعظم پر غالب آجائے اور اُسے اپنا مطیع و فرمانبردار بنا لے، تو اس کی یہ فتح انسان کے لیے حظ و نشاط

اور کیف و سرور کے اس جہاں کے دروازے کھول دیتی ہے، جس کی ابدی صورت کو جنت یا حسن المآب کہتے ہیں۔ اسی فتح کو قرآن حکیم "فوزِ العظیم" (۱) کہتا ہے۔ اسی فتح سے انسان کی زندگی سراپا حسن بن جاتی ہے۔ وہ اس کائنات کے ایک ایک گوشے میں حسنِ حقیقی کے جلووں کو دیکھتا، ان سے کیف و سرور حاصل کرتا اور حسنِ حقیقی کی حمد و ستائش کے گیت گاتا ہے۔ لیکن اس کی نظر ابلیس کی فتح اور آدم کی شکست کے اندوہگیں اور عبرتناک نظاروں کی حریف نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ جب وہ فریب خوردہ افرادِ نسلِ انسانی کی محرومیوں اور نامرادیوں کو دیکھتا اور ان کی روحوں کی نالہ و زاری اور آہ و فریاد کو سنتا ہے تو اس کا دل بھر آتا اور آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں اور وہ نوعِ انسانی کی آتشِ غم میں جل اٹھتا ہے لیکن اس غم میں سوز کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ اس میں ساز اور کیف ہوتا ہے۔ اس غم میں تاریکی نہیں نور ہوتا ہے۔ اس غم میں روح مرتی نہیں بلکہ زندۂ جاوید ہو جاتی ہے۔ وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر کبھی اپنے غم دینے والے کا شکریہ ادا کرتا ہے اور کبھی اپنے شکست خوردہ بھائیوں کی امداد کے لئے اللہ تعالیٰ سے توفیق مانگتا ہے۔ اس طرح آہ و فغانِ نیم شبی اور نالۂ سحرگاہی اس کا محبوب مشغلہ بن جاتا ہے۔ اسی عالمِ سوز و ساز میں آخر کار حسنِ مطلق کی یہ صدا اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر کر اس کی دنیا کو حسین و منور کر دیتی ہے:

وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ : (۲۸ : ۷۷)

یعنی اسے ربِ جلیل کا یہ حکم ملتا ہے کہ میری اس مخلوق کے ساتھ ایسا حسین برتاؤ کر جیسا حسین برتاؤ میں تیرے ساتھ کرتا ہوں۔ میں نے تیری دنیائے حیات کو حسین بنایا ہے تو بھی اسی طرح میرے ان بندوں کی دنیا کو حسین بنا۔

یہ حکم ملتے ہی وہ صاحبِ دل انسان اولادِ آدم کی زندگی کے ہر گوشے کو حسین بنانے کے لئے میدانِ عمل میں کود پڑتا ہے۔ یہ دیکھ کر طاغوتی طاقتیں اس کی حریف بن جاتی ہیں اور خم ٹھونک کر سامنے آ جاتی ہیں اور اس کی مساعیٔ جمیلہ کو ناکام بنانے کے لئے کبھی حیلۂ پرویزی سے کام لیتی ہیں تو کبھی قوتِ فرعونی سے۔ لیکن اس کا حسین و نڈر دل ان ابلیسی قوتوں سے مرعوب نہیں ہوتا، وہ تنہا ہی ان سے آمادۂ جنگ ہو جاتا ہے، اور اس جہاد میں اسے کبھی قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں تو کبھی جامِ شہادت پینا پڑتا ہے اور جب وہ میدانِ شہادت میں زخموں سے چور اللہ تعالیٰ کی امانت (جان) کو اس کے سپرد کر رہا ہوتا ہے تو اس وقت بھی اس کے حسین دل کی پکار یہی ہوتی ہے:

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی    حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

یہ جان یا زندگی کیا ہے؟ علامہ کے نزدیک یہ ایک باشعور، مستقل حیثیت رکھنے والی انفرادیت ہے۔ جو ذاتِ الٰہی کے قرب و وصال سے اپنی ذات کی تکمیل کرتی ہے۔ حیات کیا ہے؟ انفرادیت۔ اس کی اعلیٰ ترین صورت اس وقت "انا" یا خودی ہے، جس میں انفرادیت اپنے علاوہ دوسری چیزوں کو اپنے آپ سے خارج کر دیتی ہے اور ایک محیط بالذات مرکز ہو جاتی ہے۔ جسمانی اور روحانی دونوں اعتبار سے انسان ایک محیط بالذات مرکز ہے لیکن وہ ہنوز مکمل

---

(۱) وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۴ : ۱۳)

انفرادیت نہیں۔ اُس کا خدا سے جتنا بُعد ہوتا ہے اُتنی ہی اس کی انفرادیت ضعیف ہوتی ہے۔ خدا سب سے زیادہ قریب، سب سے زیادہ کامل ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ خدا میں جذب ہو جاتا ہے۔ برخلاف اس کے وہ خدا کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے"۔ (اقبال: دیباچۂ اسرارِ خودی، ترجمہ از چھوٹے لال)

خودی اگر چاہے بھی تو خدا تعالیٰ کی ذات میں جذب و فنا نہیں ہو سکتی، کیونکہ خدا تعالےٰ ہر لحظہ ایک نئی شانِ ارتقائی میں جلوہ افروز ہوتا ہے، جس کی طرف قرآنِ حکیم کی یہ آیت کریمہ اشارہ کرتی ہے: كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ

اللہ تعالےٰ، چونکہ اس زمان و مکان کی ایک زندہ دھڑکتی قوت ہے، اس لئے اس کائنات میں زندگی کا ہر مظہر تغیرِ مدام کی حالت میں رہتا ہے، اور یہ نظر کا قصور ہے کہ وہ مظاہرِ حیات کو ثابت و ساکن دیکھتی ہے:

فریبِ نظر ہے سکون و ثبات — تڑپتا ہے ہر ذرّۂ کائنات

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود — کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود — (بالِ جبریل، ۱۷۱)

اس حقیقت کو انھوں نے باندازِ دیگر اس طرح بیان کیا ہے:

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں — ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

(بانگِ درا، ۱۲۸)

اور

ایک صورت پر نہیں رہتا کسی شے کو قرار — ذوقِ جدّت سے ہے ترکیبِ مزاجِ روزگار

(بانگِ درا، ۱۹۳)

جب زندگی کی حقیقت ہی تغیرِ مدام ہے تو پھر سکون یا ٹھہراؤ زندگی کا دشمن ٹھہرا، لہذا فرد ہو یا قوم جس کا بھی کاروانِ حیات کسی مقام یا منزل پر آ کر رُکا، تو موت نے، جو رہزنِ حیات ہے اور اس کے تعاقب میں لگی رہتی ہے، اُس کی متاع کو لوٹا۔ اس سے ثابت ہوا کہ زندگی کی نہ کوئی منزل ہے نہ مقام، لہذا کاروانِ حیات کو مسلسل سفر کی حالت میں رہنا چاہیے:

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا — حیات، ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

(بالِ جبریل، ۷۰)

"ذوقِ سفر" کی ترکیب لفظی میں علامہ نے چپکے سے یہ مفہوم داخل کر دیا ہے کہ زندگی فطرۃً حرکتِ مدام اور تغیرِ احوال و مقامات کو چاہتی ہے۔ یہ حرکتِ مدام ارتقائی ہے، اس لئے انھوں نے دوسری جگہ "ذوقِ پرواز" کی اصطلاح استعمال کی ہے:

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی — فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

(بالِ جبریل، ۱۷۱)

یہی وجہ ہے کہ زندگی کو شباب اور بقائے دوام حاصل ہے اور وہ ہمیشہ رواں دواں رہتی ہے:

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ — جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

(بانگِ درا، ۲۹۲)

زندگی کی یہ حرکت مسلسل اور اُس کا یہ ذوقِ پرواز بے مقصد تو نہیں۔ یہ اُس کی فطرت کی اُس تمنا و آرزو کا مظہر ہے کہ اُسے اپنی اصل یعنی حسنِ حقیقی کا قرب و وصال میسر آجائے تاکہ وہ اُس کی "دید" سے سرورِ جاوداں حاصل کرسکے۔

حقیقت یہ ہے کہ زندگی کی بقا و ارتقا کا راز بھی اسی آرزو میں مضمر ہے، کیونکہ یہ آرزو ہی اس کی حرکتِ جاوداں کا مبدائے حقیقی ہے۔ چنانچہ زندگی جب اس آرزو سے محروم ہو جاتی ہے تو اس میں جمود و تعطل پیدا ہو جاتا ہے اور تخریب و فنا اُس کی قسمت کا لکھا بن جاتا ہے:

| | |
|---|---|
| زندگانی را بقا از مدعاست | کاروانش را درا از مدعاست |
| زندگی در جستجو پوشیدہ است | اصلِ او در آرزو پوشیدہ است |

جب یہ حقیقت ہے تو پھر

| | |
|---|---|
| آرزو را در دلِ خود زندہ دار | تا نگردد مشتِ خاکِ تو مزار |

آرزو سے حیاتِ انسانی ہی کی بقا وابستہ نہیں، بلکہ کل موجودات ہی آرزو سے زندہ و قائم ہے:

| | |
|---|---|
| آرزو جانِ جہانِ رنگ و بوست | فطرتِ ہر شے امینِ آرزوست |
| از تمنا رقصِ دل در سینہ ہا | سینہ ہا از تابِ او آئینہ ہا |
| طاقتِ پرواز بخشد خاک را | خضر باشد موسیِٔ ادراک را |
| دل ز سوزِ آرزو گیرد حیات | غیرِ حق میرد چو او گیرد حیات |

غرض، یہ آرزو ہی ہے، جس کی تخلیق و پرورش گویا اپنی زندگی کی تخلیق و پرورش ہے اور اس کی نشوونما اصل میں ہماری اپنی زندگی کی نشوونما ہے۔

| | |
|---|---|
| ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم | از شعاعِ آرزو تابندہ ایم |

(اسرار و رموز، ۱۶ تا ۱۸)

علامہ کا یہ نظریۂ آرزو چونکہ اُن کے نظامِ فکر میں غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے، اس لئے وہ مختلف اسالیب میں بار بار اس کی توضیح کرتے ہیں:

| | |
|---|---|
| گرم خونِ انسان ز داغِ آرزو | آتشِ ایں خاک از چراغِ آرزو |
| از تمنا مے بجام آمد حیات | گرم خیز و تیز گام آمد حیات |

(اسرار و رموز، ۳۷)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آرزو کیوں اور کیسے پیدا ہوتی ہے؟ علامہ کا جواب یہ ہے کہ یہ حسن ہے جو آرزو کی تخلیق کرتا ہے اور اپنے لئے کرتا ہے:

| | |
|---|---|
| حسن خلاقِ بہارِ آرزوست | جلوہ اش پروردگارِ آرزوست |
| ہرچہ باشد خوب و زیبا و جمیل | در بیابانِ طلب ما را دلیل |

(اسرار و رموز، ۳۸)

یہ معلوم کرنے کے بعد کہ حسن کا مقصودِ حقیقی حسن ہے، جس کی طلب و آرزو اُسی کی طرف سے انسان کو فطری طور پہ ودیعت کی گئی ہے، یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حسنِ حقیقی چونکہ ہر لحظہ ایک نئی شان میں نظر آتا ہے، لہٰذا انسان کو حسن کے نئے سے نئے جلووں کی تلاش آرزو رہتی ہے:

| | |
|---|---|
| آتشہ ہر کیفیت بس اک نئے جلوے کی ہے | مضطرب ہوں، دل سکوں نا آشنا رکھتا ہوں میں |
| گو حسینِ تازہ ہے ہر لحظہ مقصودِ نظر | حسن سے مضبوط پیمانِ وفا رکھتا ہوں میں |
| جستجو کل کی لئے پھرتی ہے اجزا میں مجھے | حسن بے پایاں ہے، دردِ لادوا رکھتا ہوں میں |

(بانگِ درا، ۱۲۹، ۱۳۰)

یہ کُل یا حسنِ مطلق کی طلب ہی کے سبب انسان کو خوب سے خوب تر کی آرزو رہتی ہے اور وہ اس کی تلاش میں بیقرار رہتا ہے۔ اُس کی یہ بیقراری ہی اُس کے "غمِ دیگر" کی وجہِ حقیقی ہے۔ انسان کی اس نفسیاتی اور جمالیاتی کیفیت کو علامہ نے بڑے حسین انداز میں بیان کیا ہے:

| | |
|---|---|
| چو نظر قرار گیرد بہ نگارے خوب روئے | تپد آں زماں دلِ من پئے خوب تر نگارے |
| ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے | سرِ منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے |
| چو ز بادۂ بہارے قدحے کشیدہ خیزم | غزلے دگر سرایم بہ ہوائے نو بہارے |

(پیام مشرق، ۱۴۸، ۱۴۹)

آخری شعر ملاحظہ ہو، جس میں انھوں نے اپنے فلسفۂ غم کی طرف نہایت لطیف اور فکر زا اشارہ کیا ہے:

| | |
|---|---|
| طلبم نہایتِ آں کہ نہایتے ندارد! | بہ نگاہِ ناشکیبے بہ دلِ امیدوارے |

(پیام مشرق، ۱۴۹)

یہ آرزوئے حسن ہی ہے جسے علامہ "عشق" سے بھی تعبیر کرتے ہیں، اور عشق اُن کے نزدیک اصلِ حیات ہے، لہٰذا موت اُس کی حریف نہیں ہو سکتی:

| | |
|---|---|
| مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ | عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اُس پر حرام |

(بالِ جبریل، ۱۲۷)

عشق نہ صرف اصلِ حیات ہے بلکہ اصلِ ایمان ہے:

| | |
|---|---|
| اگر ہو عشق، تو ہے کفر بھی مسلمانی | نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق |

(بالِ جبریل، ۵۴)

علامہ نے اپنے اس تصور کی وضاحت دوسرے مقام پر اس طرح کی ہے:

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

اور

صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبرِ حسینؑ بھی ہے عشق　　　معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

(بالِ جبریل، ۱۵۳)

اس عشق کی حقیقت، جو اصلِ حیات و ایمان ہے، فراق میں مضمر ہے، کیونکہ یہ فراق ہی ہے جو عشق کی تپش و بیقراری پیدا کرتا اور اس کی پرورش کرتا ہے۔ چنانچہ اگر فراق عشق کو لازم نہ ہو، تو وصل اُسے تب و تاب اور حرکتِ زندگی سے محروم کر دے اور نتیجۃً حیات اور انسانیت دونوں کا ارتقاء رُک جائے۔ اپنے اس نظریۂ فراق کو علامہ نے زبورِ عجم میں بالخصوص بڑے حکیمانہ انداز میں پیش کیا ہے:

جدائی عشق را آئینہ دار است　　　جدائی عاشقاں را سازگار است　　　(ص ۲۲۰)

اہلِ عشق کے لئے یہ جدائی سازگار ہی نہیں، خیر و برکت کا موجب بھی ہے:

خودی را زندگی ایجادِ غیر است　　　فراقِ عارف و معروف خیر است

اس شعر میں علامہ نے خودی اور خدا کے لئے عارف و معروف کی مصطلحات استعمال کر کے قرآنِ حکیم کی اس آیت: "الستُ بربکم، قالوا بلیٰ" کی طرف اشارہ کیا ہے اور اس حقیقت کی ترجمانی کی ہے کہ خودی اپنے خالقِ حقیقی کو فطرۃً پہچانتی ہے۔ بہرکیف، خودی اگرچہ فطرۃً اس کے عشق میں مبتلا رہتی ہے، لیکن وہ اپنی انفرادیت قائم رکھنے کے لئے اُس میں ضم نہیں ہو جانا چاہتی، بلکہ اُس کے فراق میں سوزِ غم کی سازآفرین لذتوں میں سدا آشنا رہنا چاہتی ہے کیونکہ یہ اُس کی فطرت ہے:

از خود را بریدن فطرتِ ماست　　　تپیدن، نارسیدن فطرتِ ماست
نہ ما را در فراقِ او عیارے　　　نہ او را بے وصالِ ما قرارے
اگر ما زندہ ایم از دردمندی است　　　وگر پائندہ ایم از دردمندی است

(زبورِ عجم، ۲۲۰)

اس جگہ اس نکتے کی توضیح بھی کر دی جاتی ہے کہ اہلِ عشق کا فراق ابدی یا دائمی نہیں ہوتا، بلکہ اس کی نوعیت محض عارضی ہوتی ہے۔ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ یہ فراق کیفیتِ وصال کا حامل ہوتا ہے:

نہ او بے ما نہ ما بے او چہ حال است　　　فراقِ ما فراق اندر وصال است

(زبورِ عجم، ۲۲۰)

جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں یہ فراق خودی کے حصولِ کمال کے لئے ناگزیر ہے، کیونکہ اس سے ہی اس کے اندر وہ صفات پیدا ہوتی ہیں، جن کے بغیر وہ اپنی تکمیل نہیں کر سکتی:

جدائی خاک را بخشد نگاہے　　　دہد سرمایۂ کوہے بکاہے
چہ سودا در سرایں مشتِ خاک است　　　ازیں سودا درونش تابناک است

چہ خوش سودا کہ نالد از فراقش | ولیکن ہم بہ بالد از فراقش
فراقِ او چناں صاحب نظر کرد | کہ شامِ خویش را بر خود سحر کرد
خودی را دردمندِ امتحاں ساخت | غمِ دیرینہ را عیشِ جواں ساخت (زبورِ عجم: ۲۲۱)

ان مباحث سے ہم اس نتیجے پہ پہنچتے ہیں کہ علامہ اقبال کا غم، وہ غم نہیں، جو اصطلاحِ قرآنی میں "**خوف و حزن**" سے عبارت ہے اور جو انسان کی حسن سے غفلت و ناآشنائی کا یا فقدانِ عشقِ حسن کا ثمرہ ہے، جس کی وجہ سے اُسے ظالم و جاہل کہا گیا ہے۔ اس کے علی الرغم علامہ کا غم "غمِ دیگر" یعنی دوسری نوعیت کا غم ہے۔ وہ عشقِ حسن کا غم ہے یا دوسرے لفظوں میں وہ اہلِ حسن و عشق کا غم ہے، جنھیں اپنا نہیں دوسروں کا غم ہوتا ہے، اور اس لئے ہوتا ہے کہ وہ ان کی زندگیوں کو حسین بنا دیں اور ان کے دلوں کو اپنی آتشِ غم سے زندہ و بیدار کر دیں، تاکہ اس کے خالق و معبود کی یہ مخلوق بھی اس "غمِ دیگر" سے حیاتِ جاوید اور سرورِ ابدی حاصل کرلے۔ اس "غمِ دیگر" کی تشریح خود اُن کی زبان سے سنئے:

غم دو قسم است اے برادر گوش کن
شعلۂ ما را چراغِ ہوش کن

اے بھائی! اس بات کو توجہ سے سنو کہ غم اپنی ماہیئت میں دو قسم کا ہوتا ہے۔ ہماری اس بات کو جو (آفتابِ حقیقت کا ایک نورانی) شعلہ ہے، اپنی عقل کے لئے چراغِ راہ بنالو۔

یک غم است آں غم کہ آدم را خورد
آں غمِ دیگر کہ ہر غم را خورد

ایک غم وہ ہوتا ہے (جو قرآن کی اصطلاح میں حزن ہے) جو انسان کو گھن کی طرح کھا جاتا ہے، لیکن اس کے برعکس دوسرا غم بھی ہے (جو دراصل غمِ عشقِ حسن ہے یا انسانیت کا غمِ محبت ہے) جو ہر قسم کے غمِ روزگار **یعنی خوف و حزن** کو مٹا دیتا ہے۔

آں غمِ دیگر کہ ما را ہمدم است
جانِ ما از صحبتِ او بے غم است

دوسری قسم کا غم، یعنی عشقِ حسن کا غم (جو دراصل طمانیت و سرور ہے) ہمارا رفیق و دمساز ہے اور ہماری روح اُس کی ہم نشینی سے خوف و حزن سے ناآشنا رہتی ہے۔

اندرو ہنگامہ ہائے غرب و شرق
بحر در وے جملہ موجودات غرق

اس دوسری قسم کے غم ہی میں مشرقی اور مغربی دُنیا کے تمام ہنگامے پوشیدہ ہیں، یعنی مشرق و مغرب میں سرگرمیٔ حیات کے تمام مظاہر اسی غمِ عشقِ حسن کی بدولت معرضِ ظہور میں آتے ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے

تو خشکی و تری بلکہ کُل کائنات اس میں سمائی ہوئی ہے، یعنی یہ غم نہ ہو تو کائنات کا وجود بھی باقی نہ رہے۔

چوں نشیمن می کند اندر دلے        دل از و گردد یم بے ساحلے

(زبورِ عجم، ۲۵۲)

جب یہ غم دل میں جاگزیں ہو جاتا ہے، تو دل کی وسعتیں بیکراں ہو جاتی ہیں، یا بالفاظِ دیگر انسان کی شخصیت ہمہ گیر آفاقی بن جاتی ہے۔

علامہ کے نزدیک یہ "غمِ دیگر" ہی مقصدِ حیات اور مقصودِ فطرت ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس سے تمام عالمِ انسانیت اخوت کے رشتے میں منسلک ہو جاتا ہے۔ آدمی قبیلہ، قوم اور ملک و وطن کی تنگنائوں سے نکل کر انسانیت کے لامحدود جہاں میں آ جاتا ہے، جہاں مساوات و محبت کی کمی نہیں، کثرت و فراوانی ہوتی ہے۔ اس سے اس کی روح ایک لامحدود طمانیت و مسرت محسوس کرتی ہے اور اُس کی شخصیت تمام کائنات پر چھا جاتی ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں، بلکہ حیاتِ انسانی کی بہت بڑی کامرانی ہے، جسے قرآنِ حکیم "فوزا لعظیما" کہتا ہے، اور اسی لئے علامہ اسے ایمان کا راز سمجھتے ہیں:

یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی
اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی

اصل یہ ہے کہ یہ "غمِ دیگر" ہی اُن کے فلسفہ و پیغام کی روح ہے:

در غمِ دیگر بسوز و دیگراں را ہم بسوز
گفتمت روشن حدیثے گر توانی دار گوش

اس غمِ دیگر کی آگ میں خود بھی جل اور دوسروں کو بھی جلا۔ میں نے تجھ سے ایک حسین و منور بات کہہ دی ہے۔ اگر ہو سکے تو اسے ہوش کے کانوں سے سن لے۔

جہاں تک علامہ اقبال کی اپنی زندگی کا تعلق ہے وہ خود بھی اس غم سے آشنا تھے اور اُن کی فطرت کی رفعت و عظمت بھی اسی غمِ دیگر کی مرہونِ منت تھی:

جس طرح رفعتِ شبنم ہے مذاقِ رم سے
میری فطرت کی بلندی ہے نوائے غم سے

اور

اس نشاط آباد میں گو عیش بے اندازہ ہے
ایک غم، یعنی غمِ ملت ہمیشہ تازہ ہے

مختصر یہ کہ علامہ اپنے علم و مشاہدہ اور احوال و واردات کی بنا پر غمِ دیگر کو انسانیت کے ارتقاء کے لئے ناگزیر سمجھتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس میں وہ توحید کو مضمر دیکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں، یہ غم ہی اُن کے نزدیک وہ اکسیر ہے، جس

سے خوف و حزن کی آگ کو طمانیت و سرور کی جنتِ جاوداں میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

| | |
|---|---|
| آتشے افروز از خاشاکِ خویش | شعلۂ تعمیر کن از خاکِ خویش |
| علمِ مسلم کامل از سوزِ دل است | معنیٔ اسلام ترکِ آفل است |
| چوں ز بندِ آفل ابراہیمؑ رست | در میانِ شعلہ ہا نیکو نشست (اسرار و رموز، ۷۶) |

علامہ کے پیامِ عالمگیر کو اگر ایک حرف میں بیان کرنا ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کا پیام غمِ دیگر کے سوز میں آگیں میں جلنا اور اولادِ آدم کے دامنِ حیات کو اپنے سوز و ساز کے حاصل سے معمور کرنا ہے:

| | |
|---|---|
| عشق نے کر دیا تجھے ذوقِ تپش سے آشنا | بزم کو مثلِ شمع بزم حاصلِ سوز و ساز دے |

(بانگِ درا، ۱۱۷)

آخر میں اس اہم نکتے کی طرف بھی اشارہ کر دوں کہ علامہ کا مثالی انسان کوئی مافوق الفطرت انسان نہیں، بلکہ وہ شخص ہے، جس کا دل اِس "غمِ دیگر" کی فراوانی سے معمور و بیقرار ہو۔ وہ اس کی دلیل یہ دیتے ہیں ایسے ہی انسان کے ہاتھ میں زمانے کی تقدیر ہوتی ہے اور وہی نئے زمان و مکان کی تخلیق کرتا ہے:

| | |
|---|---|
| خنک انساں کہ جانش بیقرار است | سوارِ راہوارِ روزگار است |
| قبائے زندگی بر قامتش راست | کہ او نو آفرین و تازہ کار است (پیامِ مشرق، ۱۱۰) |

غرض، علامہ اقبال کے فکر اور پیام کی روح اُن کا یہ فلسفۂ غم ہے، جس کا لب لباب یہ ہے کہ انسان جب عشقِ حقیقی سے آشنا ہو جاتا ہے تو وہ دنیا کے سود و زیاں سے بے غم ہو جاتا ہے۔ اُس کے دل میں انسانیت کی محبت موجزن ہو جاتی ہے، جو اُس کی شخصیت کو رفعت و گیرائی بخشتی اور آفاقی بنا دیتی ہے۔ یہ غمِ دیگر ہی وہ نسخہ ہے جس سے انسان اپنی تکمیل کر کے مثالی انسان بن سکتا ہے اور تمام افرادِ نسلِ انسانی کو بلا امتیازِ رنگ و نسل اور بلا تمیزِ خون و قومیت اخوت و محبت کے رشتے میں منسلک کر سکتا ہے۔ یہی غمِ دیگر ہے جو نوعِ انسان کے تمام مادی اور روحانی دکھوں کا مداوا ہے۔ یہی وہ کیمیا ہے جس سے خوف و حزن کی آگ کو کیف و سرور کی بہشتِ جاوداں میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ یہی وہ اسمِ اعظم ہے جو اصلِ توحید ہے اور اسی سے اُسے حسنِ حقیقی کا قرب و وصال حاصل ہوتا ہے، جو معراجِ انسانیت ہے اور جہاں پہنچ کر انسان کو ایسا کیف و سرور حاصل ہوتا ہے، جس کے مقام ابدیت کو جنت یا حسن المآب کہتے ہیں۔

---

# اردو میں نئی کتابیں

موسسہ فرینکلن غیر تجارتی ادارہ ہے یہ اچھی انگریزی کتابوں کے اردو تراجم شائع کرنے میں پاکستانی ناشرین کی مدد کرتا ہے چنانچہ یہ اشتہار اور فروخت کا انتظام بھی صرف معاون ناشرین کی حوصلہ افزائی اور فائدے کے لیے ہے کیونکہ اس طرح شائقین کتب کو بسہولت ایک ہی مرکز سے سب معاون ناشرین کی کتابیں مل جاتی ہیں۔ اس فروخت کی پوری آمدنی بالآخر متعلقہ ناشرین ہی کو منتقل کر دی جاتی ہے۔

| اردو کتاب | مترجم | قیمت |
|---|---|---|
| آپ کا دل اور اس کی دیکھ بھال | ڈاکٹر سعید نقوی لقمان | ۱٫۵۰ |
| سرطان کا ابتدائی علاج خیبول المنحان | " " " | ۱٫۵۰ |
| آپ کی سماعت | " " " | ۱٫۵۰ |
| ذیابیطس کے نامعلوم مریض | " " " | ۱٫۵۰ |
| آپ کی شریانیں اور خون کا دباؤ | " " " | ۱٫۰۰ |
| سرطان اور اس کا علاج | " " " | ۱٫۵۰ |
| جب کسی گھر کو سرطان کا سامنا ہو | " " " | ۱٫۵۰ |
| حیاتین اور تندرستی | " " " | ۱٫۵۰ |
| بچہ اور اس کی دیکھ بھال (قسم اول) | " " " | ۱۰٫۰۰ |
| اعصاب زندگی | " " " | ۱٫۵۰ |
| اتفاقات جو عظیم ترقی کا زینہ بن گئے | " " " | ۵٫۰۰ |
| نابینائی | " " " | ۱٫۵۰ |
| معذور بچوں کی طبی امداد کے بہتر طریقے | " " " | ۱٫۵۰ |
| میرے اندر کیا ہے؟ | " " " | ۱٫۵۰ |
| سست ذہن بچوں کی مدد | " " " | ۱٫۵۰ |
| کند ذہن بچوں کے لیے امید کی کرن | " " " | ۱٫۵۰ |
| دل کے امراض اور ان کی روک تھام | ڈاکٹر ایس ایم حیدر | ۱٫۵۰ |
| آپ کا اپریشن | ڈاکٹر شفیق الرحمان | ۱٫۵۰ |
| ذہنی امراض اور ان کا علاج | " " " | ۱٫۵۰ |

| اردو کتاب | مترجم | قیمت |
|---|---|---|
| کیا میرا بچہ تندرست پیدا ہوگا | ڈاکٹر شفیق الرحمان | ۱٫۵۰ |
| طبی تحقیق آپ کو مہلک امراض سے بچا سکتی ہے | " " " | ۱٫۵۰ |
| معاشرہ اور ذہنی صحت | " " " | ۱٫۵۰ |
| ایام حمل سے زچگی تک | افتخار بانو و پروفیسر عبدالواحد | ۹٫۰۰ |
| آپ کے بچے کی صحت | مولانا شاہد احمد دہلوی | ۱٫۷۵ |
| تمہاری تندرستی | مولانا عبدالمجید سالک | ۲٫۰۰ |
| سگریٹ اور صحت | حکیم حبیب اشعر دہلوی | ۱٫۵۰ |
| جڑی بوٹیوں سے علاج | " " " | ۲٫۱۰ |
| ذہنی صحت کی راہ پر | " " " | ۱٫۵۰ |
| اعصابی کمزوری | بیگم فرحت پرویز حسن | ۱٫۰۰ |
| بچوں کی ذہنی صلاحیتیں | اسرار صدیقی | ۲٫۵۰ |
| ٹیلیفون کیسے کام کرتا ہے؟ | شفیق ابراہیم خلیق | ۲٫۰۰ |
| گھریلو مشینیں | خلیق ابراہیم خلیق و محمد سعید | ۵٫۰۰ |
| زمانہ قدیم کے جانور | مولانا صلاح الدین احمد | ۱٫۳۰ |
| ہمارے جانے پہچانے جانور | " " " | ۱٫۵۰ |
| برق | " " " | ۱٫۵۰ |
| حرارت | " " " | ۱٫۵۰ |
| روشنی | " " " | ۱٫۵۰ |
| زندہ اشیاء | " " " | ۱٫۵۰ |

موسسہ مطبوعات فرینکلن پوسٹ بکس ۳۶۹ — لاہور

| اردو کتاب | مترجم | قیمت |
|---|---|---|
| کشش ثقل | مولانا صلاح الدین | ۱٫۵۰ |
| آواز | ״ ״ ״ | ۱٫۵۰ |
| کیڑوں کی سماجی زندگی | ״ ״ ״ | ۱٫۵۰ |
| مٹی | ״ ״ ״ | ۱٫۵۰ |
| مقناطیس | ״ ״ | ۱٫۵۰ |
| مشینیں | ״ ״ ״ | ۱٫۵۰ |
| ستاروں سے آگے | ״ ״ ״ | ۱٫۵۰ |
| موسم | ״ ״ ״ | ۱٫۵۰ |
| پھول پھل اور بیج | ״ ״ ״ | ۱٫۵۰ |
| پرندے | ״ ״ ״ | ۱٫۵۰ |
| چاند | ״ ״ ״ | ۱٫۵۰ |
| توہمات یا سائنس | ״ ״ ״ | ۱٫۵۰ |
| بادل، بارش اور برف | ״ ״ ״ | ۱٫۵۰ |
| زندگی منزل بہ منزل | ״ ״ ״ | ۱٫۵۰ |
| زمین کی بدلتی ہوئی سطح | ״ ״ ״ | ۱٫۵۰ |
| پودوں کے کارخانے | ״ ״ ״ | ۱٫۵۰ |
| سائنسدان اور اس کے آلات | ״ ״ ״ | ۱٫۵۰ |
| مادہ، سالمے اور جوہر | [مولانا صلاح الدین و پروفیسر عبدالواحد] | ۱٫۵۰ |
| صنعتی مشین | مولانا صلاح الدین | ۱٫۵۰ |
| پھولوں کی دنیا | پروفیسر محمود احمد خاں | ۱٫۵۰ |
| خلا میں سفر کی پہلی کتاب | مولانا غلام رسول مہر | ۲٫۰۰ |
| طیاروں کی پہلی کتاب | ״ ״ ״ | ۲٫۵۰ |
| موٹروں کی پہلی کتاب | ״ ״ ״ | ۲٫۵۰ |

| اردو کتاب | مترجم | قیمت |
|---|---|---|
| بجلی کی پہلی کتاب | سید علی ناصر زیدی | ۲٫۵۰ |
| ریڈیو اور ٹیلی ویژن | زبیدہ سلطانہ بخاری | ۴٫۵۰ |
| انجن | محمد سعید | ۲٫۵۰ |
| بچے کی تندرستی آپ کی ذمہ داری ہے | ״ ״ | ۱٫۵۰ |
| اپنے معذور بچے کی مدد کیجئے | ״ ״ | ۱٫۵۰ |
| بچوں کو نظم و ضبط کا خوگر بنائیے | سید عابد علی عابد | ۱٫۵۰ |
| بن ماں یا باپ کا کنبہ | ״ ״ ״ | ۱٫۵۰ |
| کیسے پتہ چلے کہ آپ کا بچہ غیر معمولی طور پر ذہین ہے | ڈاکٹر عبدالسلام خورشید | ۱٫۵۰ |
| ذہنی ادارہ و صحت | سید اسرار زیدی | ۱٫۰۰ |
| ازدواجی زندگی کی تعمیر | نثیر محمد اختر | ۱٫۵۰ |
| بین الانسانی تعلقات: معاشرتی خدمت کا تقاضا | (مظہر انصاری دہلوی) | ۱٫۵۰ |
| بچے کا احساس ذمہ داری | ״ ״ | ۱٫۵۰ |
| آپ کے بچے کی سلامتی | پروفیسر سید وقار عظیم | ۱٫۵۰ |
| تین سے چھ سال کی عمر تک آپ کا بچہ مدرسہ جاتا ہے | ( ״ ״ ״ ) | ۱٫۵۰ |
| جینے کے سلیقے | سید رئیس احمد جعفری | ۵٫۵۰ |
| بچہ ایک سے تین برس تک | سید قاسم محمود | ۱٫۵۰ |
| پختہ عمر افراد کے لیے غذائی نسخے | پروفیسر محمد عثمان | ۱٫۰۰ |
| قوت حافظہ کو بہتر بنانے کے طریقے | عبدالحمید صدیقی | ۵٫۰۰ |
| پر مسرت ازدواجی زندگی | لطف اللہ خان نظمی | ۱٫۵۰ |
| ادھیڑ عمر | ابوالحسن نغمی | ۱٫۵۰ |
| شرمیلا بچہ | نثیر محمد اختر | ۱٫۵۰ |
| آپ کا حافظہ | ״ ״ | ۵٫۰۰ |
| دوسروں سے نباہ | اشفاق احمد | ۲٫۰۰ |

(فہرست کتب مفت طلب فرمائیے)

امجد کُنڈیانی

# اقبال کے ہاں "خونِ جگر" کی اصطلاح

اقبال کے نظریۂ فن کے بارے میں بہت کچھ اظہارِ خیال کیا گیا ہے جس میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور عزیز احمد کے مقالات زیادہ قابلِ توجہ ہیں۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے "روحِ اقبال" میں اگرچہ نہایت عمدگی سے اقبال کے نظریۂ فن کی وضاحت کی ہے۔ لیکن وہ نظریئے کے دیگر پہلوؤں کی تفصیل میں اس قدر دُور چلے گئے ہیں کہ اس سارے نظریے کی اساس جس لفظ پر ہے یعنی "خونِ جگر" اس کی تشریح کما حقہٗ نہیں ہو سکی۔ خونِ جگر کو وہ صرف "خلوص" کی علامت سمجھتے ہیں اور بس ــــ لکھتے ہیں:۔

"شاعر کی ایک بڑی خصوصیت اُس کا خلوص ہے۔ یہ خلوص عقلی بھی ہو سکتا ہے اور جذباتی بھی۔ اقبال کے ہاں جذباتی رنگ حاوی ہے۔ اور بعض جگہ ان دونوں کا جمالیاتی امتزاج بڑی خوبی سے کیا ہے۔ لیکن پھر بھی جذبے کی پُر اسرار کیفیت نمایاں ہے۔ جذبہ چاہتا ہے کہ زندگی کے دوسرے سب محرکوں کو اس کی خاطر قربان کر دیا جائے اور بس وہی باقی رہے۔ وہ ہر اُس چیز کو فنا کر دینا چاہتا ہے جو وہ خود نہیں۔ اس کے اخلاص کو کسی کی شرکت گوارہ نہیں۔ غیر مخلص شاعر، شاعر نہیں نقّال ہے۔ شعر یہ کیا منحصر، کوئی فن سوز اور خلوص کے بغیر اپنے اظہار میں مکمل اور کامیاب نہیں ہو سکتا۔ شاعر خلوتِ دوست میں اپنے نالوں ہی کے ذریعے حدیثِ شوق بیان کر سکتا ہے جو آلائشِ نفس سے پاک ہوتے ہیں ؎

حدیثِ شوق ادا می تواں بخلوتِ دوست　　بنالۂ کہ ز آلائشِ نفس پاک است

اقبال نے جس چیز کو خونِ جگر کہا ہے وہ یہی خلوص ہے جس کی پرورش جذبے کی آغوش میں ہوئی ہو۔ اپنی نظم "مسجدِ قرطبہ" میں وہ کہتا ہے کہ معجزہ ہائے ہنر آنی اور فانی ہیں سوائے اُن کے جن کی تہہ میں جذبہ و خلوص کار فرما ہوں

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت　　معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود
قطرۂ خونِ جگر سِل کو بناتا ہے دل　　خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود
نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر　　نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

لیکن غور کا مقام تو یہ ہے کہ اگر صرف خلوص ہی کی بات ہے تو لکھنؤ اور رام پور کے ہزارہا شاعر جو اپنے اپنے ذہنی، جذباتی اور حسیّ تجربات کا نہایت خلوص کے ساتھ شعر میں اظہار کیا کرتے تھے اور بو فن کے بارے میں اتنے مخلص تھے کہ ایک

ایک لفظ و ترکیب کے در و بست کی خاطر کئی کئی روز تک پریشان رہا کرتے تھے وہ کیوں معجزۂ فن کی تخلیق سے قاصر رہے؟ اگر محض خلوصِ سادہ ہی فنکار کی عظمت کا ضامن ہے اور معجزۂ فن کی اس سے نمود ہے اور یہ سہل کو دل بناتا ہے تو آخر بات کیا ہوئی؟ کم از کم اقبال کے جیسے فنکار کی بات اتنی سادہ اور سطحی نہیں ہو سکتی۔ اس کا فلسفیانہ عمق، اس کی شخصیت کی گمبھیرتا، اور ایک طرح کی رومانی پُر اسراریت جو اس کے جذبے کے انتہائی والہانہ پن کی پیدا کردہ ہے اس کے ہر ہر نظریے اور خیال میں بھی پائی جاتی ہے وہ نقّاد نہ سہی، مگر بہت بڑے نقّادوں سے بھی زیادہ ژرف نگاہ تھا۔ اور خونِ جگر کی اصطلاح کے ذریعہ وہ یقیناً بہت کچھ ہی کہنا چاہتا تھا۔ یوسف حسین خاں نے اس اصطلاح کے مفہوم کو اتنا سادہ بنا دیا ہے کہ یہ نرا سطحی سا خلوص ہو کر رہ گیا ہے۔

عزیز احمد نے اپنی قابلِ قدر تصنیف: "اقبال —— نئی تشکیل" کے علاوہ اقبالیات میں ایک اور پُر مغز اور مبسوط مقالہ "اقبال کا نظریۂ فن" کے نام سے بھی لکھا ہے، جو سہ ماہی "اردو" کراچی میں دو قسطوں میں یعنی جولائی ۱۹۴۹ء اور اکتوبر ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے خونِ جگر کی جو تشریح کی ہے وہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی تشریح سے کچھ زیادہ قابلِ قبول ہے۔ مگر اس اصطلاح کی مکمل اور صحیح ترین تشریح یہاں بھی نہیں ہو سکی۔ لکھتے ہیں:

"جگر کے سوز کی تکمیل یا جگر کا خون ہو جانا انسان میں عشق کی تکمیل ہے یہ وہ منزل ہے جہاں وہ عشق کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ جگر ناوکِ مژگاں سے، ناوکِ غم سے، ناوکِ دردِ عشق سے چھلنی ہو جاتا ہے۔ اس شکست میں ایک فتح ہے۔ یہ خودی کا مٹنا نہیں بلکہ وہ منزل ہے جب قدر آفریں خودی عشق کے اثر میں ڈوب کے تخلیق کا کام شروع کرتی ہے۔ جگرِ سوختہ کے لئے بڑے ظرف کی ضرورت ہے۔ غالب اس مقام پہ اقبال سے ایسے زیادہ دور نہیں تھے ؎

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ — اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے؟

اور اس جگرِ سوختہ، خونِ جگر کی علامت کی تشریح اقبال نے جاوید نامہ میں غالب سے چاہی ہے۔ غالب کا جواب یہ ہے کہ سوزِ جگر سے جو نالہ (تخلیقی اور مؤثر عمل) نکلتا ہے، اس کی کئی تاثیریں ہوتی ہیں۔ قمری اس کی تاثیر سے خاک ہو جاتی ہے۔ بلبل کئی طرح کا رنگ جمع کرتی ہے۔ یہ نالۂ عشق جو جگر کے خون ہو جانے کے بعد نکلتا ہے۔ کہیں زندگی ہے اور کہیں موت، ہر ایک کو اس کے ظرف اور اس کی تپش کے مطابق حصّہ ملتا ہے۔ کسی کو فنا کا مقام ملتا ہے، کسی کو بقا کا۔ تو بھی یا تو رنگ (دلبری یا قاہری) حاصل کر یا بے رنگ (دلبری بے قاہری) کے عالم میں گذر جا۔ یہ دونوں خونِ جگر (تکمیلِ عشق) ہی کی نشانیاں ہیں۔

جگر کا دردِ عشق سے خون ہو جانا، انسان کے عشق کی تکمیل ہے۔ اس کے بعد قدر آفریں خودی تخلیق کا کام شروع کرتی ہے جس میں فنی تخلیق کا کام بھی شامل ہے۔

جگر کا خون ہو جانا عشق کے عملِ تسخیر کی تکمیل ہے۔ اس لئے "خونِ جگر" بحیثیت علامت و اصطلاح تسخیرِ عشق کے بعد انسان کا تخلیقی جذبہ ہے "خونِ جگر" کی اصطلاح میں فنکار کے تخلیقی جذبے کی پوری کلیّت شامل ہے۔

اس کی اندرونی تپش، اس کا سوز و گداز، اس کی اعلیٰ ترین تصوریت اور سخت ترین محنت، دوسرے الفاظ میں جوشِ حرکتِ حیات جب عشق کو فنکار کی تخلیق کا محرک بناتا ہے تو اس کا جذبۂ تخلیق خونِ جگر کہا جا سکتا ہے۔"

مختصر ترین الفاظ میں عزیز احمد کے بقول خونِ جگر سے مراد "فنکار کا جذبۂ تخلیق" ہے مگر جذبۂ تخلیق کیا ہے؟ (۱)، وہ جذبہ جو فنکار کو تخلیق پر ابھارتا ہے؟ یعنی محرکِ تخلیق جذبہ تو اس صورت میں جذبۂ تخلیق خونِ جگر کا کیونکر مترادف بن سکتا ہے۔ کیا امام بخش ناسخ اور نوح ناروی کو کوئی جذبہ شعر کہنے پر نہیں اکساتا تھا۔ کیا وہ فقط کسی خود کار مشین کی طرح شعر کہتے چلے جاتے تھے۔ پھر کیا شہرت طلبی کوئی جذبہ نہیں جو تخلیق کا اکسا دیتی ہے؟ اگر یہ سب لوگ بھی کسی نہ کسی جذبے سے مجبور ہو کر ہی شعر کہتے تھے تو ان کی تخلیق کیوں نہ عظیم تخلیق یا معجزۂ فن بن سکی اور یہ کیوں فقط تدوینِ خیالات و جذبات ہی ہو کر رہ گئی۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں فقط تخلیق پر ابھارنے والا تخلیق کی تحریک کرنے والا جذبہ ہی خونِ جگر کا مترادف نہیں ہو سکتا۔

(۲)، دوسری ممکن صورت کے مطابق اگر جذبۂ تخلیق سے مراد وہ جذبہ ہے جو تخلیق کا مواد بنتا ہے یعنی وہ جذبہ جو شعر میں صورتِ اظہار پاتا ہے تو اس حقیقت کی وضاحت عزیز احمد نے نہیں کی کہ آخر کس مفہوم کے پیشِ نظر وہ خونِ جگر کا مترادف بن سکتا ہے۔ پھر یہ بھی غور طلب بات ہے۔ کیا جوشِ حرکتِ حیات جو عشق کو تخلیق کا محرک بناتا ہے، عشق سے مختلف کوئی چیز ہے۔ اور کیا عشق اور تخلیقی جذبہ دو مختلف چیزیں ہیں۔ اگر تخلیقی جذبہ کوئی ایسی چیز ہے جسے عشق تحریک دیتا ہے تو کیا عشق بذاتِ خود کوئی جذبہ نہیں اور یہ تخلیق کا موضوع کبھی نہیں بنتا؟ اور ان ساری باتوں سے قطع نظر اگر جذبۂ تخلیق ہی خونِ جگر ہے اور یہ خونِ جگر کی تخلیق کی روحِ رواں ہے اور اس تخلیق کو عشق تحریک دیتا ہے تو گویا مفہوم یہ ہوا کہ عشق سے معجزۂ فن کی نمود ہے۔ تو گراں بار تراکیب اور اصطلاحات کے بوجھ تلے دبا ہوا سطحی نقطۂ نظر سامنے آ جاتا ہے۔ اگر بات صرف اتنی سی ہے کہ عشق خونِ جگر ہے عشق تخلیق ہے تو یہ اقبالیات کی بڑی پامال شدہ سی بات ہے عشق جگر کا خون کر سکتا ہے۔ عشق شخصیت کو عظمت عطا کر سکتا ہے۔ مگر ہر عظیم عاشق (عشق کا لفظ خاص اقبال کے مفہوم میں) کیوں نہ ایک عظیم فنکار بھی ہوا؟

خونِ جگر کی اصطلاح کو ان معنوں میں محدود کرنا تو کسی طرح بھی مستحسن نہیں معلوم ہوتا۔ یہاں تک عزیز احمد کی تشریح کافی بے مایہ رہتی ہے۔ البتہ ایک جملہ ہے: "اس کی اندرونی تپش، اس کا سوز و گداز اس کی اعلیٰ ترین تصوریت اور سخت ترین محنت ....." اس میں کچھ زیادہ عمیق نکات سامنے لائے ہیں۔ اندرونی تپش اور سوز و گداز سے مراد فنکار کی شخصیت کا سوز و گداز ہے۔ تصوریت سے مراد غالباً تخیل ہے اور سخت ترین محنت کے الفاظ مبہم ہیں۔ خونِ جگر کا جو مفہوم ہے اس کے عناصرِ ترکیبی میں سے دو ضروری سوز اور تخیل ہیں۔ مگر کیا فقط سوز اور تخیل ہی کسی فنکار کے جگر کو خون کر ڈالتے ہیں۔ اور خون کر بھی ڈالیں تو کیا یہی خونِ جگر معجزۂ فن کی نمود کا ضامن ہوگا۔ ایسا شاید نہیں ہے۔

درحقیقت خونِ جگر کی اصطلاح اس سے کہیں زیادہ تہ دار، عمیق، صد پہلو، پیچیدہ اور عظیم ہے۔ اس کے مفہوم میں بہت کچھ شامل ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کے عناصرِ ترکیبی کیا ہیں؟ سب سے پہلی سطح پر تو خونِ جگر سے مراد شاعر یا

فنکار کا کربِ تخلیق (CREATIVE AGONY) ہے۔ کربِ تخلیق شاعر کی پوری فنّی شخصیت کو محیط ہے۔ ایک عظیم فنکار کے لئے سب سے پہلے تو یہ لازمی ہے کہ وہ زندگی کے ساتھ مخلص ہو یعنی وہ اپنے احاطۂ جاں میں زندگی کے بارے میں ایک زاویۂ نگاہ رکھتا ہو۔ اس سے مراد یہ نہیں کہ وہ بہت عملی انسان ہو یا صحت مند اصلاحی نظریات رکھتا ہو۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ اس کے برعکس وہ حد درجہ دروں بیں (INTROVERT) اور فراری ESCAPIST بھی ہو سکتا ہے۔ ضروری فقط یہ ہے کہ وہ زندگی کا پورا اور مخلصانہ شعور رکھتا ہو اور اس کے بارے میں ایک ذاتی زاویۂ نگاہ رکھتا ہو۔ ایک ایسا زاویۂ نگاہ جو اُس کے نظامِ جذبات، اُس کے طرزِ فکر اور اُس کے طرزِ احساس کو شدید طور پر متاثر کرے اور اُس کی زندگی کو ہلا کر رکھ دے۔ بلکہ اس کی شخصیت کا ڈھب اسی زاویۂ نگاہ سے عبارت ہو۔ اور یہ زاویۂ نگاہ اس کے باطن کا سالار اور حکمران ہو۔

پھر دوسری بات یہ ہے کہ اس باطنی پس منظر کے ساتھ اُس پر جو تجربات، واردات اور کوائف گزرتے ہیں اور لاشعور کے نہاں خانے میں محفوظ ہوتے رہتے ہیں اُن کا وہ صحیح شعری عرفان حاصل کر سکے۔ گو وہ عقلی طور پر اُن کا مکمل اور قطعی ادراک تو نہیں کر سکتا اور نہ اس بات کی ایک عظیم فن کار کو ضرورت ہے لیکن بہرحال اُس کا احساس اور اس کا وجدان ان سارے باطنی تجربات کا خواہ کتنے ہی مبہم اور رفیع اور لطیف اور پیچیدہ ہوں شعری عرفان حاصل کر لیتا ہے اور انہیں اُسی ابہام اور لطافت کے ساتھ صورتِ شعر میں مصوّر کر دیتا ہے۔ بہرحال شاعر کو اپنے باطن بلکہ اپنے جملہ بطون کا صحیح شعری عرفان ہونا ضروری ہے۔ (علمی ادراک نہیں)

تیسری بات اس سے بھی بڑھ کر زیادہ ضروری یہ ہے کہ وہ اپنے نفسی کوائف کا عرفان حاصل کرنے کے بعد اُن سے فنّی اظہار سے مخلص رہے یعنی فن میں انہی کا بلا کم و کاست اظہار کرے اور ایسی باتیں زینتِ شعر بنانے کی کوشش قطعاً نہ کرے جو اُس کے شعری تجربات کا حصّہ نہیں ہیں اور فقط ذہن کی تخلیق یا لکھنوی اصطلاح میں نازک خیالیاں ہیں۔ یہیں پر عام اخلاقی اور پنچایتی قسم کی شاعری کا راستہ عظیم شاعری سے جدا ہو جاتا ہے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ ایک عظیم فنکار اپنے جذبات کو مدّت العمر اپنے دامانِ جاں میں پالتا ہے جب کبھی کوئی شعری تجربہ پختہ ہوتا ہے تبھی وہ اُس کو فن میں ظاہر کرتا ہے۔ جب کوئی جذبہ اُس پر طاری ہوتا ہے تو وہ فی الفور اس کا اظہار نہیں کرنا چاہتا۔ کاتا اور لے دوڑے والے شاعر زندگی کی مختلف سطحی کیفیات کو تو شاید اچھے طریقے سے نظم کر سکتے ہوں مگر زندگی کے بنیادی اور کائنات کے ابدی حقائق سے وہ ہمیشہ ناآشنا رہتے ہیں۔ ایک بلند پایہ فنکار جب بھی کسی جذبے کو طویل عرصہ تک اپنے درون میں پرورش کرتا ہے تو یہ طویل، کربناک اور جان لیوا تخلیقی عمل اُس کے جگر کا خون کر ڈالتا ہے۔ اور جب وہ اپنی فریاد کو نغمے کی صورت میں ڈھالتا ہے تو یہ نغمہ ؎

آتشے در خونِ دل حل کردہ

پانچویں بات یہ ہے کہ شاعر اپنے جذبات کو لطیف تر اور رفیع تر بنانے کی سکت رکھتا ہے اس کی شخصیت اتنی گمبھیر اور بھرپور ہوتی ہے کہ وہ ہر نفسی تجربے کو زیادہ SUBLIME کر کے ہی شعر میں پیش کرتا ہے۔ جب بھی

کوئی جذبہ یا احساس یا خیال شاعر کے دل و دماغ میں جاگزیں ہوتا ہے تو ہمیشہ اُس کی ابتدائی صورت ناصاف اور کھُردری ہوتی ہے وُہ خام، بدہیئت اور فنی جمال سے عاری ہوتا ہے۔ عظیم شاعر کی شخصیت میں کچھ ایسے پوشیدہ عناصر ہوتے ہیں جو جذبہ یا خیال یا احساس کی تہذیب کر کے، زائد اجزا کو خارج کر کے اور پستیوں کو رفعتیں بنا کر اور خامی کو مستحکم پختگی بنا کر زمین سے آسمان پر پہنچا دیتی ہے

ریختہ کا ہے کو تھا اس رتبہ عالی میں میرؔ　　جو زمیں نکلی اُسے تا آسماں میں لے گیا

اور چھٹا پہلو یہ ہے کہ شاعر کا تخیل اتنا قوی ہو کہ وہ مختلف اور بے ربط باطنی تجربات کو موم کی طرح پگھلا کر یکجان کر دینے اور ایک اکائی بنا دینے کی سکت رکھتا ہو۔ اور شاعر کے سرمایۂ لاشعور کی خلاقانہ ترتیب نو قائم کر کے اُسے کچھ سے کچھ بنا دے۔

ساتویں چیز شاعر کی قوتِ شعری ہے۔ قوتِ شعری سے مراد شاعر کی شخصیت کی وہ جملہ صلاحیتیں ہیں جو اُس کے شعری تجربات کو بہترین طریقے سے فن کے سانچے میں ڈھالتی ہیں۔ قدرت کلام پوری قوتِ شعری کا محض ایک جزو ہے جو زبان اور انتخاب و ترتیبِ الفاظ اور تعمیر تراکیب وغیرہ قسم کی چیزوں سے سروکار رکھتی ہے۔ قوتِ شعری میں شاعر کی وہ پوشیدہ صلاحیتیں بھی شامل ہیں جو اُس کی شخصیت کے سوز و گداز کو اور اُس کے درونی تجربات کی لطافتوں اور عظمتوں کو ذرا بھر مجروح کئے بغیر جوں کا توں شعر میں منتقل کر دیتی ہیں۔

آٹھویں خصوصیت شاعر کی پُرسوز شخصیت ہے۔ اس کی شخصیت اتنی گمبھیر، اتنی بھرپور، گھیردار، تہہ بہ تہہ اور انتہا درجہ پُرسوز و گداز ہوتی ہے کہ حیات و کائنات کے ان گنت پوشیدہ اسرار و رموز کو محیّر العقول طریقے پر اپنے اندر نامیاتی طور سے جذب کر کے بارِ دگر اُسے فن کی صورتوں میں نمودار کرتی ہے۔

اور اس سلسلہ کی سب سے آخری بات یہ ہے کہ عظیم فنکار ایک عظیم روح کا مالک ہوتا ہے۔ کیونکہ میرے نزدیک شاعری کی تعریف یہ ہے

"شاعری نہاں خانۂ جاں کے ابلاغ کا نام ہے"

اور جب شاعر کی روح عظیم ہوگی تبھی اُس کا فن عظیم ہوگا۔ یہ عظیم روح اتنی گرانمایہ ہوتی ہے کہ اسکے بوجھ سے جگر کا خون رِس پڑتا ہے۔ حد درجہ حساس اور نہایت بلند بال اور عظیم خواب دیکھنے والی اور ہمالہ سے بلند اڑنے اور آنِ واحد میں چہار دانگ عالم کا احاطہ کر لینے والی اور چشم زدن میں کائنات کے آخری گوشوں پر محیط ہو جانے والی اور گاہ اپنی پشت پا سے بے خبر۔

عظیم فنکار کا علم بھی عظیم ہوتا ہے۔ وہ ساری انسانی تاریخ سے نہیں تو کم از کم انسانی نفسیات اور فطرت کے عمیق ترین اور پیچیدہ ترین حقائق کا گہرا شعور ضرور رکھتا ہے۔ تہذیبوں کے اتار چڑھاؤ اور قوموں کے عروج و زوال سے بھی آگاہ ہو تو اور بہتر ہے۔

اور یہ ساری کد و کاوش اور یہ ساری عرق ریزی اور یہ سارا کربِ عظیم اُس کے دروں میں ہر لحظہ برپا رہتا ہے۔ جو آخر اُس کے جگر کو لہو کر کے چھوڑتا ہے۔ اس باطنی پیکار کا عمل اتنا پُراسرار اور پیچیدہ اور زیرِ داماں ہوتا ہے اور اس کی زد فنکار کے دل و جگر پہ اتنی صد پہلو اور موسلادھار ہوتی ہے کہ معلوم نہیں ہوتا کدھر سے چوٹ پڑی ہے ؎

ڈوبا لہو میں پڑا تھا ہمکا پیکر میرؔ　　یہ نہ جانا کہ لگی ظلم کی تلوار کہاں

شاعر اس ساری باطنی پیکار کو شاعری بناتے وقت ابلاغ کے مسئلہ سے بھی دوچار ہوتا ہے اور یہاں وہ بارہا الفاظ کے لغوی مفہوم کا ساتھ چھوڑ کر ان گنت مفاہیم شعر کے بین السطور میں پنہاں کر دیتا ہے۔ اور ؎

نگاہ می رسد از نغمۂ دل افروزے　　بہ معنی کہ بہ او جامۂ سخن تنگ است

سلیم اختر

# اقبال اور آرٹ

مرتب کا مضمون نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

فلسفۂ افلاطون کی ناپسندیدگی کے باوجود اقبال کو کم از کم اس لحاظ سے تو افلاطون سے مشابہ قرار دیا جا سکتا ہے کہ افلاطون ہی کی مانند اقبال نے بھی ایک نظامِ فکر مرتب کرنے کے بعد مسائلِ زیست اور مظاہرِ حیات کا اس کی روشنی میں جائزہ لیا۔ اقبال کے فلسفیانہ نظام میں خودی کو وہی مقام حاصل ہے جو نظامِ شمسی میں سورج کو اور جس طرح دیگر تمام سیارے سورج کے گرد گردش کرتے ہوئے اس سے کسبِ نور کرتے ہوئے اپنی انفرادیت کا اظہار کرتے ہیں اسی طرح عشق، مردِ مومن، عقل کی تکذیب وغیرہ خودی سے ہی رنگ مستعار لیتے ہیں۔

زندگی کے دیگر شعبوں کی مانند اقبال نے آرٹ پر بھی اظہارِ خیال کیا لیکن "مسجدِ قرطبہ" ایسی نظم یا مرقع چغتائی کا (انگریزی) پیش لفظ پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ اقبال نے جن قومی اور سیاسی مسائل کے لئے اپنا فکر اور قلم وقف کر رکھا تھا ان کی خصوصی اہمیت کی بنا پر اس نے آرٹ کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی۔ خاص توجہ سے میری یہ مراد ہے کہ آرٹ سے وابستہ کئی مسائل ایسے ہیں جن پر خصوصیت سے اظہارِ خیال نہیں کیا گیا۔ آرٹ کن تخلیقی عوامل کا مرہونِ منت ہے؟ ابتدائی سوال ہے لیکن نہ تو اس کے بارے میں اقبال ہماری راہنمائی کرتا ہے اور نہ اس نوعیت کے دیگر سوالات کے تشفی بخش جوابات ملتے ہیں۔

آرٹ کے سلسلہ میں اقبال کے خیالات کے دو پہلو نمایاں ترحیثیت میں ہمارے سامنے آتے ہیں ایک تو آرٹ کا مقصد اور دوسرے بعض عمومی رجحانات پر نکتہ چینی!

مرقع چغتائی کے پیش لفظ میں جب اقبال نے آرٹ کے مقاصد کا تعین کیا تو اسے انسانی شخصیت اور مقاصدِ حیات کے تابع قرار دیتے ہوئے اس امر پر زور دیا کہ صرف تخلیق ہی سے انسان تمام امکانی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر اپنی انفرادیت کا ثبوت دیتا اور خدا کا ہم پلہ ہو کر یہ کہہ سکتا ہے:

تو شب آفریدی چراغ آفریدم

گو یہ نظم انسانی فطرت میں سعیٔ مسلسل اور جگر کاوی کی اہمیت اجاگر کرتے ہوئے مقاصدِ جلیل کے لئے ایک اشاریہ کی صورت اختیار کر لیتی ہے لیکن فنی تخلیق کے بارے میں بھی اقبال کے خیالات ایسے ہی ہیں۔ بقول اس کے:۔

"انسان اور خدا دونوں ہی کا وجود تخلیق سے عبارت ہے۔ انسانیت کے لئے

مبدائے فیض بننے والا فن کار زندگی کی چیرہ دستیوں کے خلاف سینہ سپر ہوتا ہے۔ اس ..... وہ خدا کا ہم نفس ہو جاتا ہے اور یوں وہ ابدیت اور زمانہ کو اپنی روح میں سمویا ہوا محسوس کرتا ہے"!

یہ تخلیق کا وہ ارفع تصور اور آرٹ کی وہ اعلیٰ منزل ہے جہاں فن کار معمولی انسان نہیں رہتا بلکہ مردِ مومن بن کر ہر تخلیق کے ساتھ صورت خورشید جیتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ فن کار اس منزل تک کیسے پہنچ سکتا ہے اور یہ سوال اس وقت اور بھی اہمیت اختیار کر جاتا ہے جب ہم یہ پڑھتے ہیں:

آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر　　　کارِ جہاں بے ثبات! کارِ جہاں بے ثبات!!

اس کا جواب اقبال نے یوں دیا ہے:

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام　　　جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام

اور وہ اس لئے کہ:

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ

اعلیٰ فن کارانہ تخلیق کے لئے مردِ مومن کو عشق کی "تقویم" اور "مستی" کے علاوہ اس جگر کاوی کی بھی ضرورت ہے جسے اقبال نے "خونِ جگر" سے تعبیر کیا اور اس کے بقول:

رنگ ہو یا سنگ و خشت چنگ ہو یا حرف و صوت　　　معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

قطرۂ خونِ جگر سل کو بناتا ہے دل　　　خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود

اقبال نے بعض اور نظموں میں بھی آرٹ کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے لیکن "مسجد قرطبہ" کے یہ اشعار بہ حیثیت مجموعی اس کے نظریۂ آرٹ کی ترجمانی کرتے ہیں۔ مگر کیا تخلیق کے تمام عمل کو محض "خونِ جگر" ہی سے واضح کیا جا سکتا ہے؟ واضح رہے کہ خونِ جگر ایک شاعرانہ ترکیب ہے کوئی فنی یا تکنیکی اصطلاح نہیں۔ فن کار کے شعور کی تخلیق میں کئی ایسے سماجی، نفسیاتی اور تاریخی عوامل کار فرما ہوتے ہیں جن کی وجہ سے تخلیق کا عمل بے حد پیچیدہ صورت اختیار کر لیتا ہے۔ فن کار اپنے آرٹ سے قطرہ کو گوہر تو بنا سکتا ہے لیکن اس تمام عمل کو محض خونِ جگر کی خوبصورت، اور شاعرانہ ترکیب سے واضح نہیں کیا جا سکتا۔ ایک کاریگر کے ہنر اور فن کار کے "معجزہ ہائے ہنر" میں محض خونِ جگر ہی سے امتیاز نہیں کیا جا سکتا۔ مہارت کے ساتھ ساتھ ایک خاص طرح کی ذہنی ساخت کا جب اشتراک ہو تو پھر کاریگر فن کار بنتا ہے اور ایک کا ہنر دوسرے کا معجزہ قرار پاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ فن کار کا تخلیقی کرب کسی اور کرب سے کم نہیں۔ اسی طرح اس کی محنت، خصوصیت سے حصولِ کمال کے لئے سعی اور خوب سے خوب تر کی جستجو میں سعی مسلسل — ان سب کو خونِ جگر سے تعبیر کہا جا سکتا ہے لیکن خونِ جگر آرٹ کی بنیاد نہیں اور نہ ہی تخلیقی شعور کی جوت!

اس موقع پر اقبال پرستی سے کام لیتے ہوئے یہ جواز پیش کیا جا سکتا ہے کہ اقبال آرٹ پر مستقل کتاب نہ لکھ رہے تھے اس لئے ان سے آرٹ سے وابستہ تمام مسائل پر سیر حاصل تبصرہ کی توقع ہی بے جا ہے لیکن ایسا

جوازیوں بے سُود ہے کہ اقبالؔ ایسا فلاسفر جب زندگی اور اس کے مسائل کے بارے میں ایک باضابطہ نظامِ فکر کی تشکیل کرتا ہو تو پھر اس سے کم ازکم اس امر کی توقع غلط نہ ہوگی کہ وہ جن مسائل پر اظہارِ خیال کرے ان میں تشنگی کا احساس نہ ہونا چاہیئے ۔

اقبالؔ نے بقائے فن کے لئے فن کار کے "مردِ خدا" ہونے کے ساتھ ساتھ صاحبِ عشق ہونا بھی لازمی قرار دیا۔ مردِ مؤمن اور عشق پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ ان کی مزید تشریح لاحاصل ہوگی لیکن اتنا ضرور ہے کہ آرٹ کے لئے مردِ مومن اور عشق کو اس لئے لازم قرار دیا گیا کہ اقبال آرٹ برائے اسلام کا حامی ہے۔ مرقعِ چغتائی کے پیش لفظ میں اپنے اس نظریہ پر تفصیلی روشنی ڈالنے کے بعد اپنے عہد کے تمام آرٹ سے اسی بنا پر بیزاری کا اظہار کیا :

"۔۔۔ اور جہاں تک اسلام کی ثقافتی تاریخ کا تعلق ہے، میرا یہ عقیدہ ہے کہ صرف فنِ تعمیر کی واحد استثنائی مثال سے قطع نظر اسلام کے آرٹ (موسیقی، مصوری بلکہ شاعری تک) کو ابھی جنم لینا ہے۔ یہ وہی آرٹ ہے جو خدائی صفات کو انسانی روح میں جذب کرنے کے مقصدِ جلیل کا حامل ہوتا ہے۔ اور اس سے تخلقوا باخلاق اللہ اجرِ غیر ممنون اور لازوال تخلیقی وجدان حاصل ہوتا ہے جس سے بالآخر انسان کو اس زمین پہ خدا کی نیابت کا منصب حاصل ہوتا ہے۔"

یہ باتیں تو بہت اعلیٰ ہیں لیکن ان کی روشنی میں کیا ہم اپنے آرٹ اور ادب کی تاریخ کی تشکیلِ نو کر سکتے ہیں؟

فن برائے اسلام کا نعرہ خواہ کتنا ہی دل خوش کن کیوں نہ محسوس ہو لیکن اس کی بنیاد ہی تضاد پر استوار ہوئی ہے۔ غالباً تمام مذاہبِ عالم میں اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جس نے فنونِ لطیفہ کی مختلف صورتوں کو حرام قرار دیا۔ مصوری اور سنگ تراشی کفر اور شرک کی طرف لے جانے والی ہیں، شاعری جھوٹ ہے اور موسیقی جذبات میں اشتعال پیدا کرنے والی۔ اس لئے ان سب کو عوام نے اگر کلی طور سے ممنوع نہ بھی سمجھا تو کم ازکم مشکوک ضرور ہی جانا!

اسلام کے برعکس جتنے بھی اساطیری یا دیگر مذاہب ہیں ان سب سے آرٹ کو فروغ ہی نہ ہوا بلکہ بت پرستی وغیرہ کی وجہ سے مجسمہ سازی اور مصوری کو مذہبی اہمیت حاصل رہی۔ شاعری چونکہ بھجن اور مناجات کے کام آسکتی تھی اس لئے وہ بھی قابلِ قدر رہی۔ بلکہ یونان اور ہندوستان میں تو اساطیری واقعات کی تمثیلوں کے باعث ڈراما کو بھی مذہبی اہمیت ملی خصوصاً یونان میں۔ جہاں المیہ اور طربیہ دونوں طرح کے ڈرامے، دیوتاؤں کے سالانہ تہواروں کے مواقع پر انعامی مقابلوں کی صورت میں پیش کئے جاتے تھے۔

اس کے برعکس اسلام نے جو ضابطۂ حیات دیا اس میں فنونِ لطیفہ کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ یورپ میں فنونِ لطیفہ کی تاریخ سے اگر مذہبی عناصر نکال دیں تو نصف سے زائد شاہکاروں سے ہاتھ دھونا پڑے گا لیکن ہمارے ہاں ابھی تک صوفیاء میں یہ مسئلہ ہی نہیں طے ہو سکا کہ سماع جائز ہے یا ناجائز! مصوری ناپسندیدہ تھی اس لئے فن کارانہ وجدان کی تسکین کے لئے خوش نویسی ہی کو ایک فن بنا لیا گیا۔

علاوہ ازیں فن میں ایک خاص طرح کی "لامذہبیت" بھی ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے فن کار خدا اور تقدیر تک کو اپنا

ہدف بنا سکتا ہے۔ اسی سے اس میں وہ آفاقیت جنم لیتی ہے جس کی بنا پر ایک فن پارہ ہر نسل اور ہر عہد کے انسان کو اپنا معلوم ہوتا ہے لیونارڈو کی "مونا لیزا" سے ہر انسان لطف اندوز ہو سکتا ہے لیکن اس کی LAST SUPER صرف ایک عیسائی کے لیے کشش رکھے گی۔ لوکا سلی کی "ایپی" کا جمال ہمیں آج بھی مسحور کر سکتا ہے لیکن اس کی مذہبی موضوعات پر تصاویر سے ہمیں کوئی حظ حاصل نہ ہوگا ——— وہ فن پارے جنھیں اپنی مذہبیت کی بنا پر مقبول عام اور شہرت دوام نصیب ہوئی ان کی سب سے اہم خصوصیت مذہب نہیں بلکہ کمالِ فن ہوتا ہے یا بالکل اسی طرح سے جیسے انسانی زندگی کی کامیاب مصوری کی بنا پر "جنگ اور امن" ایسا تاریخی ناول غیر روسی قارئین کو بھی متاثر کر سکتا ہے۔

ادب اور اخلاق کی بحث (اس کے محرک) افلاطون اتنی ہی قدیم ہے اور صدیوں کی بحث کے بعد جو نتائج مرتب ہوئے ہیں ان کی بنا پر بآسانی ادب اور اخلاق کے نظریے کو مسترد کیا جا سکتا ہے۔ اخلاق تو پھر بھی ایک ہمہ گیر قسم کی چیز ہے اور غیر مذہبی افراد بھی بعض بنیادی قسم کی اخلاقی اقدار کو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن آرٹ برائے مذہب کا نظریہ اس دائرہ کو اور بھی محدود کر کے آرٹ یا ادب کو بالکل ہی محبوس کر دینے کے مترادف ہوگا۔ مذہب کی خوبیاں اپنی جگہ پر لیکن فنونِ لطیفہ کو ان کے پرچار کا مستقل ذریعہ نہیں بنایا جا سکتا۔ مذہبی موضوعات آرٹ سے خارج نہیں کئے جا سکتے کیونکہ مذہب بھی زندگی کی کل کا ایک جزو ہے لیکن صرف مذہب ہی کو تخلیقی شعور کا سرچشمہ قرار دینے سے تکرار و تواردکی بنا پر ادب، ادب نہ رہے گا جمعہ کا خطبہ بن جائے گا، موسیقی موسیقی نہ رہے گی سماع بن جائے گی، ——— شاید اسی لئے اقبال کو یہ شکایت ہے کہ اسلامی آرٹ ابھی پیدا نہیں ہوا۔ میرے خیال میں اس کے نہ پیدا ہونے ہی میں آرٹ کی بہتری ہے۔

---

ڈاکٹر محمد دین تاثیر مرحوم

# کلامِ اقبال

جن دنوں ڈاکٹر محمد دین تاثیر مرحوم سری پرتاپ کالج سرینگر (کشمیر) کے پرنسپل تھے۔ انھوں نے کالج میں اُردو سبھا قائم کی اور اپنے علم اور تجربے سے اسے اُردو کے لیے ایک زبردست طاقت بنا دیا۔ ۱۹۴۲ء میں ان کی تجویز سے اُردو سبھا نے ایسے مضامین کا ایک مجموعہ مرتب کیا جو طلبا کے لیے نظم و نثر کا نہایت عمدہ نمونہ تھے۔ اس میں ایک جدت یہ بھی کی کہ کلام اقبال پر چند مروجہ اعتراضات مشہور ادیبوں کی خدمت میں بھیج کر ان سے جوابات طلب کئے۔ ڈاکٹر تاثیر مرحوم نے خود بھی بعض سوالات کے جواب لکھے، جو ان کی یادگار کے طور پر یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

(محمد عبداللہ قریشی)

(۱) کیا اقبال کی اسلامیت نے ان کی شاعری کو محدود کر دیا ہے؟

یہ سوال پہلو دار ہے اور درحقیقت کئی سوالوں سے مرکب ہے۔

وہ لوگ جو ادب برائے ادب کے بہت سختی سے پیروکار ہیں، ان کے نزدیک "اسلامیت" محض نظریۂ حیات ہونے کی وجہ سے غیر شاعرانہ ہے۔ وہ اقبال کی شاعری کو محدود نہیں بلکہ مفقود سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہر منظم خیال، ہر پیغام، ہر دعوت عمل مردود ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ موضوع سخن کو غیر متعلق اور طرز سخن کو اصل شاعری قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں چوکین اور بیرانمس کی شاعری ہم پایہ ہے۔ یہ لوگ شاعری کو فن شاعری تک محدود سمجھتے ہیں۔ ان کا یہ اختلاف شاعری کے لفظ کی تعریف پر مبنی ہے۔ اگر شاعری سے مراد محض اصواتِ الفاظ ہے، تو پھر ان کے مطابق فقط بے معنی الفاظ کا مجموعہ ہی پوری شاعری ہے اور جہاں معانی کو شاعری میں شامل کیا گیا تو معانی کے ساتھ مضمون اور موضوع سخن کو بھی اہمیت حاصل ہو گئی اور جب یہ ہوا تو پھر "اسلامیت" بذاتِ خود غیر شاعرانہ نہ رہی۔

کچھ لوگ ایسے ہیں جو محض جذبات ہی کو شاعری کے لئے مخصوص سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک فکر و خیال شاعری کے منافی ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ خاص نظامِ خیال و فکر سے بھی جذبات وابستہ ہو سکتے ہیں۔ دراصل یہ لوگ پچھلے علم نفسیات سے گمراہ ہو کر خیالات اور جذبات کو دو متضاد ذہنی حالات تصور کرتے ہیں۔

بعض ادب برائے زندگی کے حامی اسلامیت کو ایک غلط نظریۂ حیات سمجھ کر اقبال کی شاعری کو رجعتی قرار دیتے ہیں۔ یہ غیر شاعرانہ معیار ہے۔ بعض ہندوستانی قومیت کے حامی "اسلامیت" کو ایک مخصوص نظریہ سمجھ کر اقبال کی شاعری کو محدود گردانتے ہیں۔ یہ معیار غیر شاعرانہ بھی ہے اور غیر منطقی بھی۔ قومیت بھی تو ایک محدود نظریۂ حیات ہے اور قومیت کی حد بندی جغرافیائی حدود کی پابند ہے۔ اسلامیت کے پیرو کار تمام ہندوستان کی آبادی سے کہیں زیادہ ہیں۔ افغانستان کے قوم پرست محض مٹھی بھر ہیں، تو پھر اسلامیت کس طرح قومیت سے زیادہ محدود ہوئی۔ کیا عاشقانہ شاعری جس میں ایک عاشق اور ایک محبوب کے معاملات کا اظہار ہوتا ہے بہت محدود ہے؟ اور جب کسی نظم میں ایک کردار کے تاثرات کا اظہار کیا جائے تو وہ اس سے بھی محدود تر ہوگی۔ کیا شاعری بھی مردم شماری کی پابند ہے؟ کہا جا سکتا ہے کہ عشق فطرت انسانی کا خاصہ ہے، تو کیا مذہبیت بھی عام ذہن انسانی کی ایک حالت نہیں؟

نہ جانے یہ اسلامیت کو شاعری کے منافی قرار دینے والے حضرات کیوں بھول جاتے ہیں کہ دنیا کے بڑے بڑے شاعر ہومر، یونانی تمثیل نگار، ڈانٹے، کالیداس، ملٹن وغیرہ صنمیات، عیسائیت اور ہندومت کے عقاید کو اپنی شاعری میں شامل کرتے تھے اور ڈانٹے تو اپنی نظموں میں اس قدر متعصب ہے کہ اس نے دوسرے مذاہب کے لوگوں کو گالیاں دی ہیں۔ اقبال کی اسلامیت تعصب سے بہت دور ہے۔ لوئیس ڈکنسن کے ایک اعتراض کے جواب میں اقبال لکھتا ہے:-

"میں تمام انسانوں کو اخوت اور انسانیت کا سبق دیتا ہوں۔ مجھے اسلامی سماج میں چند ایسے خواص نظر آئے جو میرے نظریۂ حیات کے عین مطابق تھے۔ اس لئے میں نے اس بنے بنائے سماج کو اپنا مخاطب اوّل قرار دیا ہے کیونکہ ان کو اپنے ساتھ ملانا میرے لئے زیادہ آسان تھا۔ اسلامی سماج وطن، رنگ اور نسل کے تعصب سے آزاد ہے۔ اس میں اخوت انسانی زیادہ نمایاں ہے"۔

تو گویا اقبال تمام بنی نوع انسان کو ایک کرنا چاہتا ہے۔ ان کو محدود گروہوں سے نکال کر عالمگیر برادری میں شامل کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ جاوید نامہ میں اس نے قدیم ہند و بزرگوں کو بھی وہی درجہ دیا ہے جو رومی اور دیگر فلاسفۂ اسلام کو دیا ہے۔ اس نظم میں اس نے ہندوستان کی غلامی کی تصویر نہایت دردناک طریقے سے کھینچی ہے اور غداران وطن کی مذمت کی ہے اور جعفر اور صادق کو کوستے ہوئے انہیں محض "ننگ دیں" ہی نہیں کہا "ننگ آدم" اور "ننگ وطن" بھی قرار دیا ہے۔ وہ وطن کی آزادی کا مخالف نہیں "وطنیت" کا مخالف ہے۔ اس وطنیت کا مخالف ہے جس نے گذشتہ سالوں میں اس قدر خونریز جنگوں کو تقویت دی ہے جو انسان کو انسان سے لڑا رہی ہے۔

(۲) اقبال کی شاعری میں موسیقیت نہیں!

معترض نے موسیقیت کے لفظ کو چند مخصوص اور محدود معنوں میں استعمال کیا ہے۔ کیا موسیقیت سے مراد فقط ایسے الفاظ کا استعمال ہے جن میں ہیم ترنّم کا عنصر پایا جائے؟ مثلاً داغ کا یہ مصرع

"کس قیامت کے یہ نامے مرے نام آتے ہیں"

جیسے کوئی نامۂ محبوب کو چوم رہا ہو۔

ظاہر ہے کہ اگر موضوع اس قسم کا ہو تو الفاظ کی اصوات بھی اسی طرح کی ہونی چاہئیں۔ اگر اقبال کی شاعری میں پھوہاچاپن نہیں تو اس کے الفاظ کی اصوات بھی اس قسم کی نہیں ہوں گی۔

مگر دیکھنا یہ ہے کہ کیا موسیقیت اسی ذہنی حالت تک محدود ہے؟ کیا رجزیہ موسیقی اور رجزیہ شاعری کم درجے کا آرٹ ہے؟

شاعری میں موسیقیت سے مراد الفاظ کی اصوات اور الفاظ کے معانی کی مناسبت ہے۔

یہ درست ہے کہ اقبال کی شاعری میں رجزیہ جوش کی فراوانی ہے اور اس کے الفاظ بھی اسی قسم کے ہیں۔ گوئٹے، ملٹن، ڈانٹے، ہومر اور فردوسی کی موسیقیت بھی اسی طرح کی ہے۔

مگر جب کبھی اقبال سناتا ہے تو میٹھی میٹھی لوریاں بھی سناتا ہے۔ آہنگ اصوات و معانی کے نمونے ملاحظہ ہوں ؎

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے　　　مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

اسی کا دوسرا شعر ہے۔ پہلے مصرع میں ہنگامۂ ناؤنوش کا ذکر ہے۔ اس لئے الفاظ کی اصوات میں بھی اسی قسم کا کھردراپن ہے۔ دوسرے مصرع میں آرام طلبی ہے۔ اس لئے اصوات میں بھی حروف علت اور لام میم نون کا پے بہ پے استعمال ہے ؎

تمام رات تری ہنگامہ گستری میں کٹی　　　سحر قریب ہے اللہ کا نام لے ساقی

"تھام لے ساقی" اور "نام لے ساقی" یعنی قافیہ ردیف کا ٹکڑا مصرع کی رفتار میں لغزش پا کا سا اثر پیدا کرتا ہے۔ خود ردیف میں تین ٹکڑے ہیں لے اور سا اور قی۔ عروضی انہیں سبب خفیف کہتے ہیں اور قافیہ میں کشیدہ الف اور دو ساکن حروف کا پے بہ پے آنا اور میم کی ملائمت جس کے بعد ردیف میں لام کی نرم آواز اور کشیدہ ہائے اور آخر میں پھر کشیدہ الف اور کشیدہ ہائے تا۔ لے۔ سا۔ قی:۔ ل۔ م:۔ ان تمام اصوات کے آہنگ سے جو کیفیات مرتب ہوتی ہیں۔ وہ الفاظ کے معانی کے اظہار میں مددگار ہیں۔

شاعری میں موسیقیت اسی کو کہتے ہیں۔ ٹھمری ٹپے کی موسیقیت اور شے ہے۔ "دریائے نیکر کا خرام" والی نظم شاعرانہ موسیقیت کے لئے مشہور ہے۔

## ایک شام

(دریائے نیکر (ہائیڈل برگ) کے کنارے پر)

خاموش ہے چاندنی قمر کی　　　شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی
وادی کے نوا فروش خاموش　　　کہسار کے سبز پوش خاموش
فطرت بے ہوش ہو گئی ہے　　　آغوش میں شب کے سو گئی ہے

کچھ ایسا سکوت کا فسوں ہے نیکر کا خرام بھی سکوں ہے
تاروں کا خموش کارواں ہے یہ قافلہ بے درا رواں ہے
خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا قدرت ہے مراقبے میں گویا
اے دل! تو بھی خموش ہو جا
آغوش میں غم کو لے کے سو جا

اور بال جبریل کی وہ نظمیہ غزل تو ہر کسی کی زبان پر ہے جس کا ایک مصرع ہے
"اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن"

(۳) اقبال کی شاعری میں منظر کشی مفقود ہے۔

یہ اعتراض بھی پہلے اعتراض کی قبیل سے ہے یعنی یہ کہ اقبال اقبال ہے۔ کوئی اور شاعر نہیں اور یہ کہ شاعری معترض کے ذہن کی طرح محدود ہونی چاہیئے۔ چند مفروضات کی حامل ہونی چاہیئے۔ یہ درست ہے کہ اقبال پتھروں درختوں اور دریاؤں کا پجاری نہیں۔ انہیں جاندار نہیں سمجھتا۔ خدائی طاقت مجسم نہیں مانتا۔ مناظر قدرت کو پس منظر کی حیثیت دیتا ہے۔ اس کے نزدیک انسان کے خیالات اور جذبات زیادہ اہم اور قابل توجہ ہیں۔

اگر انسانیت شاعری کے منافی ہے اور شجر حجر پرستی ہی شاعری ہے تو پھر اقبال مجرم ہے مگر خود ساختہ مفروضات کی بنا پر شاعری کو جانچنا تنقید کے بنیادی اصولوں سے ناواقفیت کا ثبوت دینا ہے۔

اقبال کی شاعری انسانی عظمت کی آئینہ دار ہے۔ وہ انسان کو اشجار ہی سے نہیں بلکہ مشیت کردگار سے بھی زیادہ بلند سمجھتا ہے ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

ایسی شاعری فرزندارِ گیاعام روایتی مذہبیت سے بھی بالاتر ہے۔

جوئے کہستاں

فضا نیلی نیلی ہوا میں سرور ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور
وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی اٹکتی لچکتی سرکتی ہوئی
اچھلتی پھسلتی سنبھلتی ہوئی بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی
رکے جب تو سل چیر دیتی ہے یہ پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ
ذرا دیکھ اے ساقیٔ لالہ فام
سناتی ہے یہ زندگی کا پیام (ساقی نامہ)

(۴) اقبال غرور سکھاتا ہے، سختی اور وحشتی سکھاتا ہے، رحم کے جذبات سے نفرت سکھاتا ہے۔

یہ اعتراض غالباً اقبال کے چند ناشناس مداحوں کی تحریروں پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ اقبال کے کلام کا مطالعہ کیا جائے شاید یہ شکایت باقی نہ رہے۔

(مندرجہ ذیل اشعار سب کے سب اقبال کی ایک کتاب "بالِ جبریل" سے منقول ہیں۔ مختلف کتابوں سے محض مطلب کے اشعار ل نہیں کئے گئے)

اقبال نے اپنی دانست میں اس دنیا میں "زندگی بسر کرنے" کا بہترین طریقہ بتایا ہے۔ اس لئے کسی مداح اقبال کا یہ ا کہ وہ دین و دنیا، ملک و ملت سب سے بالا ہے محض پریشان گوئی ہے اور کسی مخالف کا اس کے عام اشعار سے قطع نظر ے چند اشعار پر زور دینا اور اسے تنگ دل ثابت کرنا ادبی بددیانتی ہے۔

اقبال غرور بھی سکھاتا ہے اور انکسار و حلم بھی۔ سختی بھی سکھاتا ہے اور رحم و دل گدازی بھی۔ یہ دنیا ہی عالم اضداد ہ۔ وہ بار بار کہتا ہے کہ بزم کا رنگ اور ہے، رزم کا رنگ اور ہے۔ پہاڑوں میں دریا شور مچاتا ہوا تند رفتار ہوتا ہے اور دان میں شیریں نوا و نرم رفتار اور بہترین انسان کی یہی فضیلت ہونی چاہیئے:

نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو — رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل — اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دلنواز

ں جنگ و جدل کا انداز ؎

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

جس کا دل نرم نہیں، جس کی آنکھوں میں آنسو نہیں، وہ انسان نہیں ؎

وہ آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن
پُرکار و سخن ساز ہے، نمناک نہیں ہے

محض نرم دلی ہی نہیں بلکہ مروّت اور دلنوازی انسانیت کے لئے لازمی ہیں ؎

مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دلنوازی کا
مروّت حسنِ عالمگیر ہے مردانِ غازی کا

اور خودی بددماغی کا نام نہیں ؎

خودی کی شوخی و تندی میں کبر و ناز نہیں
جو ناز ہو بھی تو بے لذتِ نیاز نہیں

اس کے چمن میں پھول اور کانٹے، اس کے کردار میں خودی اور بے خودی، اس کے مزاج میں عزتِ نفس اور نیازمندی سب ناسب دخل ہے اور یہ محض میرا اپنا اندازہ نہیں۔ اقبال خود کہتا ہے ؎

فطرت مری مانندِ نسیمِ سحری ہے — رفتار ہے میری کبھی آہستہ کبھی تیز
پہناتا ہوں اطلس کی قبا لالہ و گل کو — کرتا ہوں سرِ خار کو سوزن کی طرح تیز

اب اگر کسی یک چشم کو سرِ خار ہی نظر آئے یا اطلسِ گل ہی تو یہ اقبال کے چمن زار کا نہیں نظر کا قصور ہے۔

سید حمنا

# اقبال اور تصوف

عام طور پر علامہ اقبال کے لئے دو باتیں کہی جاتی ہیں۔

۱۔ وُہ صُوفی نہ تھے۔

۲۔ بالفرض اگر صوفی تھے بھی تو صوفیائے کرام کی عام روش سے ہٹ کر نظریۂ وحدت الوجود کے سخت مخالف اور نظریۂ وحدت الشہود کے حامیوں میں سے تھے۔

پہلی بات کے لئے تو پورے وثوق، یقین اور اعتماد سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ بات غلط ہے اور سراسر غلط فہمی پر مبنی ہے۔ علامہ ایک حقیقی شاعر اور ترجمان فطرت ہونے کے لحاظ سے بھی صوفی تھے۔ پیر رومی سے والہانہ عقیدت بھی اس بات کی غماز ہے کہ وہ صوفی تھے۔ پھر جو شخص کلام الہٰی سن کر زار و قطار روئے۔ جس پر حضور نبیٔ کریم کا اسم مبارک سن کر رقت طاری ہو جائے جو گوتم بدھ کی عظمت کا قائل ہو۔ وہ شخص صوفی نہ ہو یہ کیسے ممکن ہے۔

شاعر ہونے کے لحاظ سے ان کے کلام میں جو وجد آفریں کیفیت ہے۔ جو اہتزاز ہے جو شعریت ہے وہ خود اس بات کی زبردست شہادت ہے کہ وہ صوفی تھے۔ دل جب تک "حسن محض" کی محبت میں سرشار نہ ہو۔ آنکھ جب تک اس کے جلوؤں سے آشنا نہ ہو طالب روحانی لحاظ سے جب تک مقام فنا پر فائز نہ ہو تب تک یہ کیفیت پیدا ہی نہیں ہو سکتی کہ جدھر نظر اٹھے وہی وہ نظر آئے۔ ہر موجود چیز پہ دوست کا گمان ہو حد یہ کہ خود اپنی ہستی بھی اسی کی ذات کی آئینہ دار بن جائے۔ بقول کسے ؎

موبہ مویم دوست شد ترسم ز استیلائے عشق

جو شاعر صوفی نہ ہو وہ یہ شعر کیسے کہہ سکتا ہے ؎

تو ہے محیط بیکراں میں ہوں ذرا سی آبجو\
یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بے کنار کر

ذوق حضور در جہاں رسم صنم گری نہاد\
عشق فریب مید ہد جان امیدوار را\
عقل است چراغ تو در راہگذارے بنہ

عشق است ایاغ تو بابت. ہ محرم زن

ع علم مقام صفات عشق تماشائے ذات

ع مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے

فلسفۂ عجم میں انھوں نے قرآن کریم کی آیات سے حکمت اور باطنی تعلیم کے متعلق صوفیانہ نظریات کی تائید کرتے ہوئے لکھا ہے:

"میرے خیال میں یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ قرآن کریم اور صحیح احادیث میں صوفیانہ نظریات کی طرف اشارات موجود تھے لیکن وہ عربوں کی خالص علمی ذہانت کی وجہ سے نشوونما پا کر بار آور نہ ہو سکے جب ان کو غیر ممالک میں موزوں حالات میسر آ گئے تو وہ ایک جداگانہ نظریئے کی صورت میں جلوہ گر ہو گئے۔" [1]

اقبال کے صوفی ہونے یا نہ ہونے کی بحث ان کی زندگی ہی میں چھڑ گئی تھی۔ اور اس سلسلے میں انہیں اپنی پوزیشن صاف کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ لکھتے ہیں "مگر ذرا دامن بچا کر 'اسلامی تصوف' کا میں کیونکر مخالف ہو سکتا ہوں کہ خود سلسلۂ عالیہ قادریہ سے تعلق رکھتا ہوں۔" [2]

اس کے بعد بھی اگر یہ کہا جائے کہ اقبال صوفی نہ تھے تو ان پر ظلم ہے۔ رہ گئی دوسری بات یعنی نظریۂ وحدت الوجود اور نظریہ وحدت الشہود۔ تو ظاہر ہے یہ ایک نظریاتی بحث ہے۔ نظریہ کا تعلق زیادہ تر عقل سے ہوتا ہے۔ اور تصوف جس کا دوسرا نام مذہب عشق یا معرفت الٰہی ہے وہ سراسر واردات قلبی ہے۔ ایک صوفی حالت جذب و کیف میں جو کچھ کہتا یا کرتا ہے۔ اس سے نظریات کی بنیاد پڑتی ہے یا اگر نظریئے پہلے سے موجود ہوں تو ان میں کسی ایک کی تائید یا تردید ہوتی ہے۔ ایک صوفی شاعر جب یہ کہتا ہے ؎

حسن ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے
انسان میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے

تو اس سے حکماء اور عقلاء اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ وہ نظریۂ وحدت الوجود کا قائل ہے۔ جہاں تک اقبال کا تعلق ہے۔ اسرارِ خودی کی اشاعت سے پہلے وہ اعلانیہ ہمہ اوست کے قائل تھے اور حضرت حافظ سے ان کا اختلاف نہ تھا۔ [3] ان کی شعری زندگی کا پہلا دور جس کا تعلق ان کے نظریۂ حسن سے ہے ۱۹۰۸ء کے قریب ختم ہو گیا [4] اس دور میں اقبال صرف نوافلاطونی ہی نہ

---

[1] Meta Physics of Persia

[2] نیرنگ خیال لاہور جنوری ۱۹۲۷ء

[3] نیرنگ خیال لاہور جنوری ۱۹۲۷ء

[4] (فلسفۂ اقبال) جمالیات اقبال کی تشکیل

تھے بلکہ وحدت الوجود پر کامل یقین رکھتے تھے ؎

تارے میں وہ قمر میں وہ جلوہ گہہ سحر میں وہ
چشم نظارہ میں نہ تو سُرمۂ امتیاز دے

ان کو (اقبال کو) اس بات کا پورا شعور ہے کہ وہ خطرناک راہ طے کر رہے ہیں اس لئے انھوں نے اپنی ایک صوفیانہ نظم کا جو وحدۃ الوجودی مسلک کا اظہار کرتی ہے انجام یوں کیا ہے ؎

شریعت کیوں گریباں گیر ہو ذوقِ تکلّم کی — چھپا جاتا ہوں اپنے دل کا مطلب استعارے میں
جو ہے بیدار انساں میں وہ گہری نیند سوتا ہے — شجر میں پھول میں حیواں میں پتھر میں ستارے میں

لہذا انھوں نے ابتدا میں تو افلاطونی روایات کی تقلید میں حسن کو قدیم بھی مانا اور اسے ہر قسم کی طلب، حرکت اور عشق کی علّتِ اولیٰ اور علّتِ فاعلہ بھی قرار دیا۔ بعد ازاں ان کے خیالات میں تغیر رونما ہوا" [1] ان کا عقیدہ ہے کہ ظواہر کی کثرت ایک ایسی وحدت سے ظہور پذیر ہوئی ہے جس نے اپنے آپ کو اپنے مشتملات پر تقسیم کر دیا ہے، عامل و معمول، علت و معلول، ایک ہی وجود کی تقابلات ہیں جو کسی وقت ایک شکل میں ظاہر ہوتا ہے کسی وقت دوسری میں اس ذاتِ اصلی کے یہ متعدد اور متخالف رخ دراصل ان چنگاریوں کی مثال ہیں جن میں شعلہ اپنے کو منقسم کر دیتا ہے [2]

اسی خیال کو ویدانتا فلاسفی میں (جو ایک خیال کے مطابق دُنیا کی قدیم ترین فلاسفی ہے اور سراسر عقیدہ وحدت الوجود پر مبنی ہے) یوں ظاہر کیا گیا ہے۔

The Lord of all creatures, who gives life and strength to all that exists, from whose body emanate the individual souls like sparks from fire. (3)

The all pervading, Omnipotent and formless Spirit, manifests Himself in various forms under different names to fulfil the desire of His worshippers (4)

اقبال اس بات کو بھی مانتے ہیں کہ حُسن ہر شے میں جاری و ساری اور ہر چیز پر حاوی ہے [5] یہ تو افلاطونی نظریہ ہے جو خدا کو "حسنِ محض" اور "محرکِ طلب و عشق" گردانتا ہے اور ویدانتا کا فلسفہ بھی اس کا مدعی ہے کہ

As this infinite Being pervades the Universe and interpenetrates every project of matter giving existence

[1] (فلسفۂ اقبال) [2] (فلسفۂ اقبال) اقبال کا تصور ارتقا۔

(3) Vedanta Philosophy P 91 by Swami Abhedananda 1905
(4) " " P 60 " " "

[5] فلسفۂ اقبال ص۲۱

of everything so the light of his Knowledge pervades the universe (1)

اس موقع پر ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ باستثنائے چند تمام مسلم صوفیائے کرام کا ما نوٹ اللہ نور السموٰت والارض ہے۔ مصلحتِ وقت کے اعتبار سے چاہے ان کے خیالات میں کتنا بھی تغیر رونما ہوا ہو۔ اس شعور کے باوجود کہ وہ خطرناک راہ طے کر رہے ہیں اور ول کا مطلب استعارے میں چھپانے کی ضرورت پیش آ رہی ہے۔ افلاطون کو گمراہ قرار دینے اور خیام و حافظ کی مخالفت کے باوجود یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے۔

اگر آپ (مولانا حسن نظامی) کو یا قاری سلیمان شاہ صاحب کو یہ ثابت کرنا ہو کہ وحدت الوجود یعنی تصوف کا اصل مسئلہ قرآن کی آیات سے نکل آتا ہے تو کون کون سی آیات پیش کر سکتے ہیں اور ان کی کیا تفسیر کرتے ہیں'۔ ؎۲

ان بزرگوں نے اس کا جو کچھ بھی جواب دیا ہو بہرحال صوفیائے کرام کے نزدیک اکثر آیات کریمہ ایسی ہیں جن میں وحدت الوجود کی طرف صاف اشارہ پایا جاتا ہے۔ مثلاً

هو الاول هو الاخره الظاهر هو الباطن

اینما تولوا فثم وجه الله

وهو بكل شيئ محيط

نحن اقرب عليه من حبل الوريد

مشہور پنجابی صوفی شاعر حضرت بلھے شاہ فرماتے ہیں ؎

مجھ وچ رانجھا میں رانجھے وچ ہور خیال نہ کوئی
میں ناہیں او آپے ہے آپ اپنی کرے دلجوئی

علامہ نے اس خیال کو یوں ظاہر کیا تھا ؎

کمال وحدت عیاں ہے ایسا کہ نوک نشتر سے تو جو چھیڑے
یقین ہے مجھ کو گرے رگ گل سے قطرہ انسان کے لہو کا

یہی خیال ویدانتا فلاسفی میں اس طرح پیش کیا گیا ہے۔

The whole universe is in God and God is in it. I am in Him and He is in me. (3)

---

Vadanta Philosophy P 20,21 by Sawami Abhedananda. 1905 ؎۱

؎۲ اتالیق خطوط نویسی

Vadanta Philosophy P 47. by Sawami Abhednanda. ؎۳

ان مثالوں سے میرا مطلب اسلامی تصوّف کو ویدانتا فلاسفی سے تطبیق دینا ہرگز نہیں ہاں یہ ضرور ہے کہ ہر زمانے اور ہر مذہب میں کچھ لوگ ایسے ضرور گذرے ہیں جنھوں نے روح و دل کی پوری صلاحیتوں کے ساتھ خدا سے محبت کی ہے اور اُس کی صفات و ذات کے بارے میں غور و فکر سے کام لیا ہے اور ان لوگوں کے خیالات میں اگر پوری پوری نہیں تو کم و بیش مطابقت ضرور پائی جاتی ہے۔ محققین کی اکثریت اس طرف گئی ہے کہ تصوّف کا صرف ایک ہی بنیادی اور قدیمی نظریہ ہے جسے عربی میں وحدت الوجود کہتے ہیں۔ جس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ حیّ و قائم صرف ایک ہی وجود ہے باقی تمام کائنات اس کے مظاہر ہیں۔ جس کی سب سے بہتر مثال سمندر اور موج سے دی جا سکتی ہے۔ موج کو سمندر نہیں کہہ سکتے۔ موج۔ موج ہے۔ سمندر۔ سمندر تاہم موج سمندر سے جدا نہیں ہے۔ سمندر کا وجود موجوں کی رستخیز سے ہے اور موجوں کی رستخیز سمندر کے وجود سے، موجیں بے شمار ہیں لیکن ان کی اصل ایک ہے۔ فلسفۂ غم میں علامہ اقبال نے اس نظریے کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے ؎

ایک اصلیت میں ہے موجِ روانِ زندگی — گر کے رفعت سے ہجومِ نوعِ انساں بن گئی
ہجرانِ قطروں کو لیکن وصل کی تعلیم ہے — دو قدم پر پھر وہی جو مثلِ نام سیم ہے۔

ابن دہقان نے اس مذہب۔ (مسلک) کی ترجمانی میں یوں کہا ہے کہ

"وحدت کی مثال رنگوں کی سی ہے حکماء کے نزدیک ان کے وجود کے لئے ضو (شعاع) کا وجود شرط ہے اگر ضو وجود میں نہ آئے تو الوان وجود میں نہیں آ سکتے۔" [1] جس اسلامی تصوّف کے حامی ہونے کا علامہ اقرار کرتے ہیں اسے شرعی اصطلاح میں روح احسان یا مقام احسان سے موسوم کیا جاتا ہے وہ بھی کسی قدر ترمیم کے ساتھ انہیں نظریات کی تائید کرتا ہے۔ مقامِ احسان یہ ہے کہ آدمی خدا کے ہونے کا محض ایک تصور باندھ کر نہ رہ جائے بلکہ وہ اسے اپنے روبرو محسوس کرے اپنے ساتھ ساتھ پائے۔ اور اس کے دستِ قدرت کو چاروں طرف تصرف کرتے ہوئے متحرک دیکھے۔ اور اس کی آیاتِ انفس و آفاق کے آئینہ میں اس کی صفات کا عکس اخذ کرے اور پھر صفات کے پردوں میں اس کے نورِ ذات نور السمٰوٰت والارض جانتے ہوئے اس سے خیال و اعمال کو مستنیر کرے۔ [2]

پھر محققین کی اکثریت کا اس امر پر بھی اجماع ہے کہ تصوّف کا دراصل ایک ہی نظریہ ہے جو بنیادی بھی ہے اور قدیم بھی اور وہ ہے نظریۂ وحدت الوجود۔ علامہ اقبال ابتدائی دور میں اس نظریئے کے علی الاعلان حامی رہے اور تو اور خود نظریۂ وحدت الشہود کے بانی حضرت مجدد الف ثانی رح بھی ابتدا میں اس کے قائل تھے نہ صرف اس کے قائل تھے بلکہ انھوں نے مراحل تصوّف میں وحدت الوجود کو ایک مستقل مرحلہ قرار دیا ہے جس تک ہر صوفی بہرحال پہنچتا ہے لیکن ان کے خیال میں تصوف کی آخری منزل جیسا کہ عام صوفیہ کا عقیدہ ہے وحدت الوجود نہیں بلکہ اس سے بھی آگے ایک اور منزل

---

[1] مقدمہ ابن خلدون اُردو ترجمہ صفحہ ۴۹۰ تا ۴۹۱

[2] (کشف المحجوب پر ایک تعارف) نعیم صدیقی۔ ماہنامہ سیارہ لاہور دسمبر ۱۹۶۶ء صفحہ ۸۰۔۸۱

ہے جہاں پہنچ کر سالک پر یہ عیاں ہو جاتا ہے کہ وہ ایک بندہ محض ہے[1] چنانچہ عقیدہ وحدت الوجود کے سب سے بڑے شارح اور حامی ابن عربی کے اس قول میں کہ ممکنات کے حقائق اسی وجود منبسط کے نام اور صفات ہیں اور حضرت مجدد کے اس قول میں کہ ممکنات کے حقائق وہ عدمات ہیں جن پر اس وجود منبسط کے اسماء و صفات کے انوار کا عکس پڑتا ہے کوئی فرق نہیں۔ بس تعبیرات کا معمولی سا فرق ہے[2] ہم آئینہ میں منعکس سورج کے عکس کو سورج کہتے ہیں۔ یہ وحدت الوجود کی عینیت کا تصور ہے۔ کبھی اسے اصل آفتاب کا عکس قرار دیتے ہیں جو بہت دور اور بعید الحصول ہے یہ وحدت الوجود کی ورائیت کا تصور ہے۔ سامی ذہن ذات باری کو منزہ اور مجرد مانتا ہے اور بظاہر فطرت سے باہر تصور کرتا ہے آریائی ذہن اس کے وجود کو کسی مظہر میں دیکھنے کا قائل ہے اور مظاہر فطرت میں ذات باری کو جلوہ افروز سمجھتا ہے ذات باری کا تعلق بظاہر کائنات کے ساتھ وہی ہے جو روح کا جسم سے ہے۔[3]

امام ربانی رح کے نزدیک وحدت الوجود کا تجربہ محض شخصی، ذاتی، نیز غیر حقیقی ہے۔ دراصل وحدت الشہود ہی وہ تجربہ ہے جسے ایک صوفی اور عارف سمجھتا اور محسوس کرتا ہے۔ گویا وہ جو کچھ اس منزل میں دیکھتا ہے وہ فی الواقعہ اصل حقیقت کا پرتو ہوتا ہے جبکہ اصل حقیقت اس سے کہیں دور ہوتی ہے۔ ہو سبحانہٗ وراء الوراء ثمہ وراء الوراء ثمہ وراء الوراء[4] گویا مولانا جامی کے الفاظ میں ؎

کل مافی الکون وہم او خیال  او عکوس فی المرایا او ظلال

شارحین کے خیال میں اس اختلاف کی بنیاد یوں پڑی کہ شیخ اکبر کے بعض شارحین اس عقیدے کی تشریح اس طور پر کرتے ہیں کہ اس سے وحدت الوجود عینی کا مضمون پیدا ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ غلط ہے کیونکہ شیخ اکبر وحدت الوجود ظلی کے قائل تھے۔ اس صورت میں اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ محض لفظی نزاع ہے[5]

ان تشریحات اور تعبیرات کے پیش نظر عقیدہ وحدت الوجود کے حامیوں کا دعویٰ ہے کہ وحدت الوجود اور اقبال فلسفہ دونوں حقیقت کے روحانی اور ایک ہونے کے قائل ہیں دونوں ذات باری کو واجب الوجود تسلیم کرتے ہیں دونوں کے درمیان روحانی وحدت کا تصور مشترک ہے لیکن فلسفۂ وحدت الوجود روحانی وحدت MONISM پر زیادہ زور دیتا ہے کثرت اس کی نظر میں اعتباری ہے حقیقی نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اعتبارات کی دنیا بھی اپنی جگہ معتبر ہے لیکن حقیقت بہرحال ایک ہی ہستی کی محمول نہیں بن سکتی۔ اور جہاں تک اخلاقی مسئلہ کا تعلق ہے فلسفۂ اقبال اور فلسفۂ

---

[1] اقبال ریویو جولائی ۱۹۶۶ء وحدت الوجود اور فلسفۂ خودی۔ ڈاکٹر ابو سعید نور الدین صفحہ ۱
[2] مکتوب مدنی۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیم۔
[3] شاہ ولی اللہ کی تعلیم۔ صفحہ ۱۳۷۔ ۱۳۸
[4] مکتوبات امام ربانی جلد اول مکتوب ۲۶
[5] شاہ ولی اللہ کی تعلیم صفحہ ۱۳۵

وحدت الوجود اپنے عملی اعتبار سے یکساں ہیں اور دونوں میں کوئی بنیادی تنازعہ موجود نہیں اور جہاں تک جبر و قدر کی مابعد الطبیعات کا سوال ہے اس میں بھی بیان اور الفاظ کے فرق کے علاوہ دونوں بڑی حد تک مماثل ہیں[1] لہذا اگر کوئی شخص یہ کہے کہ افلاطون عینیت کے لبادے میں اقبال اور اقبال فعلیت کے لبادے میں افلاطون ہے تو بات کچھ زیادہ غلط نہ ہوگی[2] اس دعوے کو تقویت یوں بھی ملتی ہے کہ علامہ نے حافظ کے خلاف اشعار آخر میں واپس لے لئے تھے ۔ اور یوں بھی کہ علامہ ابتدا سے انتہا تک پیر رومی کے مرید رہے ؎

نے مہرہ باقی نے مہرہ بازی　　جیتا ہے رومی ہارا ہے رازی

اور لطف یہ ہے کہ پیر رومی کی مشہور عالم مثنوی جس کے لئے یہاں تک کہہ دیا گیا ہے کہ ع

ہست قرآں در زبان پہلوی

اس کے اکثر حصوں کی وحدت الوجودی تعبیر ہو سکتی ہے ۔ ملاحظہ ہو ۔

صورت دھمی بہ ہستی منہم واریم ما　　چوں حباب آئینۂ بر طاق عدم داریم ما
آب در بحر بیکراں آب است　　در کنی در سبو ہمہ آب است
لیک غیر خدائے عز و جلال　　نیست موجود نزدِ اہل کمال
ہستی کہ بود ذاتِ خدا وند عزیز　　اشیا ہمہ در وے اندو وے در ہمہ نیز[3]

اب سوال یہ ہے کہ ان کے خیالات میں تغیر کیوں رونما ہوا کیوں ان کے متعلق لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ وہ صوفی نہ تھے یا مسلک تصوف کے سراسر خلاف تھے ۔ اور کن حالات کے زیر اثر وہ اس اعتراف پر مجبور ہوئے کہ میں عرصہ تک ایسے عقائد اور مسائل کا قائل رہا جو بعض صوفیا کے ساتھ خاص ہیں اور جو بعد میں قرآن شریف پر تدبر کرنے کے بعد قطعاً غیر اسلامی ثابت ہوئے ۔ مثلاً شیخ محی الدین ابن عربی کا مسئلہ قدم ارواح ۔ مسئلہ وحدت الوجود یا مسئلہ تنزلات ستہ یا دیگر مسائل جن میں بعض کا ذکر عبد الکریم الجیلی نے اپنی کتاب انسانِ کامل میں کیا ہے[4] اور پھر ایسا کیوں ہوا کہ اس قدر واضح اعتراف کے بعد انھوں نے آخر میں حافظ کے خلاف اپنے اشعار واپس لے لئے ۔ شروع سے آخر تک پیر رومی کے غیر مشروط طور پر مرید رہے کہیں یہ وضاحت نہیں کی کہ انھیں ان کے کن خیالات سے اتفاق اور کن سے اختلاف ہے ؟ صوفیانہ اصطلاح میں اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ متاخرین صوفیا میں سے محققین اس کے قائل ہیں کہ سالک اپنے مقامات میں سے ایک مقام محو پر بھی پہنچتا ہے جہاں پہنچ کر اس کو وحدت مطلقہ کا خیال

---

[1] اقبال ریویو جولائی ۱۹۷۰ صفحہ ۹۶ تا ۱۱۰

[2] جمالیاتِ اقبال کی تشکیل صفحہ ۳۰ ـ ۳۱

[3] Metaphysics of Rumi by Dr. Khalifa Abdul Hakim 1959.

[4] اسرارِ خودی اور تصوف ـ در اخبار وکیل امرتسر بتاریخ ۱۰ جنوری ۱۹۱۶ء

پیدا ہوتا ہے۔ (علامہ کے ۱۹۰۸ تک کے خیالات اسی روشنی میں پڑھے جا سکتے ہیں) پھر یہاں سے ترقی کر کے آگے بڑھتا ہے تو مقامِ فرق پر پہنچتا ہے جہاں وہ موجودات میں تمیز کرتا ہے[۱] گویا ۱۹۰۸ کے بعد اقبال کچھ عرصہ مقامِ فرق میں رہے لیکن اس کے بعد جب مقامِ فنا آیا تو من و تو کا فرق مٹ گیا۔ اور علامہ نے حافظ یا نظریۂ وحدت الوجود کے خلاف اپنے خیالات واپس لے لیے۔

لیکن تاریخی حقائق کی روشنی میں اس کا جواب کچھ اور ہوگا۔ اقبال کا زمانہ کشمکش، انقلاب اور بیداری کا زمانہ تھا۔ براؤننگ جوش اور قوت کے فلسفے کا پرچار کر رہا تھا۔ کارلائل اور فریڈرک FREDERICK اپنی تصانیف میں دنیا کے اولوالعزم انسانوں کو خراجِ تحسین پیش کر رہے تھے۔ لائڈ مارگن کی تصنیف The Emergent Evolution اور میکڈوگل کی تصنیف Outlines of Psycology اور Social Psycology بطلی توانائی کو قوت روح حیات قرار دے کر عزتِ نفس اور احساسِ انا کو انسانی شخصیت کی کنہ بتا رہے تھے ــــ ادھر H. G. Wells کا تخیل انسانوں کو اس بات پر ابھار رہا تھا کہ وہ تسخیرِ زمان و مکاں میں منہمک ہوں Neitzsche کا فلسفہ ارادۂ قوت جرمنوں کے ذہنوں پر سوار تھا ادھر فرانس Bergson کے فلسفۂ جوشِ حیات و حرکت انقلاب کے زیرِ اثر آ گیا تھا اور Adler نے ایغو توانائی کا ارادہ برتری سے تشخص کر دیا تھا۔ اس رستخیز کے عالم میں صرف ایک مسلمان قوم ایسی تھی جو Lotus Eaters کی طرح اپنے گرد و پیش سے غافل ہو کر تصوف کے مراحل طے کرنے میں مصروف تھی اور تصوف بھی وہ جو انحطاط کے انتہائی مراحل میں تھا۔ خدا کی معرفت، روح کی بلندی، قرب و حضور اور فنائے ذات اسلامی تصوف کے اصل اصول تھے۔ عملی نمونہ صرف اور صرف نبی کریم کی ذاتِ بابرکات تھی اور ہے۔ اور آخری رسول نے جہاں ترکِ رہبانیت کا درس دیا اور خود اپنے ہاتھوں ریاست کا نظام چلایا اور میدانِ جہاد میں معرکہ آرا ہو کر سیاست کو دائرہ دین میں داخل فرمایا وہاں مسلکِ تقویٰ کے ساتھ ساتھ ایک روحِ احسان بھی اُمت کو تفویض کی۔ اس مسلک احسان یا تصوف کا نمونہ حضور نبی کریمؐ کی ذات اور خلفاء راشدین کی شخصیتیں تھیں۔ بعد ازاں بادشاہت کے جبری دور میں جب جب دنیا اور حبِ جاہ عام ہونے لگی تو بعض بزرگوں نے مصلحتاً صوفیانہ بیعت کے تجربے شروع کیے تاکہ کم از کم کچھ لوگوں کو تو بھی خدا پرستی پر قائم رکھا جائے لیکن کچھ عرصہ بعد اس میں بھی کئی خرابیاں شامل ہو گئیں اور یہ تحریک بھی نام و نمود کا ذریعہ بن کر رہ گئی۔[۲] مقریزی نے اس حالت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

*Now the state of affairs of the sufis and their Shaykhs has come to such a low ebb that they have become a heap of rubbish,*

---

[۱] مقدمہ ابن خلدون اردو ترجمہ صفحہ ۴۹۰، ۴۹۱

[۲] سیارہ لاہور دسمبر ۶۶ (کشف المحجوب پر ایک تعارف) صفحہ ۸۰، ۸۱

*and have nothing to do with science or piety.* [1]

یہ درست ہے کہ ان میں بعض لوگ مخلص بھی تھے جو خلوصِ دل سے معرفت الٰہی حاصل کرنے میں مصروف تھے لیکن خرابی یہ تھی کہ انھوں نے بھی دین کے ایک ہی حصّہ پر قناعت کرلی تھی اور دوسرے حصّہ کو فراموش کر بیٹھے تھے۔ اقبال نے اس خرابی کا ذمہ دار اسلامی تصوّف کے غلط تصوّر پیش کرنے والوں اور شعراء کو گردانا۔ کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ یورپ کی گرمیِ حیات شعراء اور اہلِ قلم حضرات کی رہینِ منت ہے۔ اس لئے انھیں خیام پسند نہ آیا کیونکہ وہ ہر آن اپنی زوال پذیر شاعری کے ذریعہ قارئین کو ترک دنیا، فنائے ذات، اور تقدیر کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے غلط متصوفانہ تصورات سے آشنا کرکے موت کی نیند سلا دینے پر تیار نظر آتا ہے۔ حافظ کی میٹھی راگنی موت کی لوری تھی یہ حسین شے کی تباہی، انسانی مساعی کی بے ثمری، کوششوں کی بے حاصلی اور خواب کی دنیا میں رہنے کی تمنا۔ انھوں نے ایرانی تصوّف کے اس انحطاطی پہلو کے خلاف بغاوت کی جو ان کے نزدیک اور درحقیقت اصولِ اسلام کے خلاف تھا۔[2] ضربِ کلیم میں اس وقت یہ حقیقت بہت ابھر کر سامنے آتی ہے جب وہ پیرِ رومی سے سوال کرتے ہیں ؎

کاروبارِ خسروی یا راہبی　　　کیا ہے آخر غایتِ دینِ نبیؐ

اور اس کا جواب ان کی توقع کے عین مطابق ملتا ہے ؎

مصلحت در دین ما جنگ و شکوہ　　　مصلحت در دینِ عیسیٰ غار و کوہ[3]

وہ خود بھی شاعر تھے اور یورپین شعراء کی روحِ حیات سے متاثر ہو کر انھوں نے بھی اپنی قوم کے تنِ مردہ میں روحِ حیات، روحِ عمل پھونکنے کی کوشش کی جذبے کی صداقت نے مصلحتِ وقت نے انھیں تصوف کی ظاہری صورت سے ہی نہیں اس کے بنیادی نظریے سے بھی دور کر دیا۔ کیونکہ تصوّف کی ظاہری صورت متصوفین کے یہاں اس قدر مستحکم ہو چکی تھی کہ اقبال اگر چاہتے بھی تو رد عمل نہیں کر سکتے تھے۔ قوم جو مقام فنا سے گذر رہی تھی اسے احساسِ ذات صرف اس صورت میں دلایا جا سکتا تھا کہ سب سے اس سرچشمہ کو ہی بند کر دیا جاتا۔ جس کے پانی میں شراب کا سا نشہ تھا۔ اس شخص کے لئے جو مسلمانوں کے تنِ مردہ میں جان ڈالنا چاہے، یہ امر لازم تھا کہ وہ تصوّف کی ماورائیت کی جگہ ایک ایسا فلسفہ پیش کرے جو قوت، توانائی، حرکت اور فوق الانسانی مساعی کی تلقین کرے۔ افراد اور اقوام کی زندگی اور ان کے خیالات میں تغیر رونما کرنے میں بعض تاریخی عوامل بھی کارفرما ہوتے ہیں اور انھیں عوامل کا تقاضا تھا کہ اقبال ذہن سے وحدت الوجود کو نکال باہر کریں اور اپنے افکار کو ایک نئے سانچے میں ڈھالیں۔[4]

---

[1] *Al-Maqrizi, Khitat, IV 272 From Some Glimpses of the Religious life in Egypt during the later Mamluk period. P 378*

[2] فلسفۂ اقبال عابد علی عابد صفحہ ۲۸۷

[3] نظم تصوف۔ ضربِ کلیم صفحہ ۲۹

[4] جمالیات اقبال کی تشکیل صفحہ ۲۱ تا ۲۴

وہ تصوف کو مسلمانوں کی راہ میں ایک رکاوٹ تصور کرتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ تصوف جمود اور بے عملی کا بہانہ ہے[۱]
قدیم تصورات کا ڈھانچہ بہت مضبوط تھا اسے توڑنے کے لئے طاقت اور شدت کی ضرورت تھی۔ علامہ نے اس ڈھانچے پر
پہلی ضرب افلاطون کے متعلق یہ کہہ کر لگائی ؎

گوسفندے در لباس آدم است    حکم او بر جان صوفی محکم است

پھر شیخ اکبر کی مخالفت کی۔ حافظ کو نشانہ بنایا۔ غرض دل کی آواز دبا کر وقت کا ساتھ دیا اور خوب دیا اگر وہ اپنے
ابتدائی نظریات پر قائم رہتے اور ۱۹۰۸ کے بعد ان کے خیالات میں تغیر رونما نہ ہوتا تو شاید آج پاکستان کا وجود بھی
خیال و خواب ہوتا خود فرماتے ہیں ؎

اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو    لاہور سے تا خاک بخارا و سمرقند

تاریخی حقائق کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقبال نے بیرونی عناصر سے پاک کرکے صحیح اسلامی تصوف سے مسلمانوں
کو ایکبار پھر روشناس کرایا اور ان کو وہ جذبہ دیا جو حضور اور صحابہ کرام کے زمانے میں مسلمانوں کے دلوں میں موجزن تھا،
اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ علا رصوفی نہ تھے بلکہ ان میں تصوف یا مسلک احسان کی وہ صحیح اور سچی اسپرٹ تھی جس کی
بدولت مسلمان فاتح عالم بنے ان کے عقیدے میں فنا کے معنی فنا فی احکام اللہ تھی[۲] اور قرآن کریم میں جا بجا تسخیر کائنات پر
زور دیا گیا ہے۔ اقبال نے اس کی طرف مسلم قوم کو پرزور دعوت دی، فرمایا ؎

اسی قرآں میں ہے اب ترک جہاں کی تعلیم    جس نے مومن کو بنایا مہ و پروین کا امیر

رہ گیا جھگڑا وحدت الوجود اور وحدت الشہود کا تو کچھ لوگوں کے نزدیک اور ان میں شاہ ولی اللہؒ بھی شامل ہیں
حضرت مجدد اور ابن عربی کے نظریات میں چونکہ کوئی تضاد موجود نہیں اور بظاہر جو فرق ہے۔ اس کی بھی تعبیرات ممکن ہیں
اس لئے اقبال کا فلسفۂ خودی ان دونوں کے درمیان اسی قسم کا ایک تعبیراتی امتزاج ہے کیونکہ جہاں دوسرے صوفیا
خدا کی معرفت حاصل کرنے کی غرض سے اپنی خودی کو بحر وحدت میں گم کر دینے کے قائل ہیں وہاں علامہ اقبال اپنی خودی کو ایک
مستقل حیثیت میں برقرار رکھ کر حیات جاودانی حاصل کرنی چاہتے ہیں۔ صوفیاء کے عام عقیدے کے برخلاف خدا میں
جذب ہونے کی بجائے خود خدا کو اپنے اندر جذب کرنے کے قائل ہیں[۳] بات وہی ہوئی۔

او درمن و من در وے دریا بہ حباب اندر

آں ہم بہارے۔ ایں ہم بہارے

---

[۱] اقبال ریویو جولائی ۱۹۶۰ صفحہ ۹۶ تا ۱۱۰
[۲]
[۳] اقبال ریویو۔ جولائی ۱۹۶۶ صفحہ ۱۱۰

نعیم صدیقی

# خودی اور عصیاں

اقبال کے کلام میں جا بجا عمیق معنویت نے ایسے مشکل مقامات پیش کئے ہیں کہ کلام سے لطف اندوز ہوتے ہوئے آدمی محسوس کرتا ہے جیسے اس کے ذوق کا سبک رواں بجرا بھنور میں آ گیا ہے۔ اقبال کی شاعری چونکہ محض تاثراتی اور جذباتی نہیں ہے بلکہ فکر انگیز بھی ہے۔ وہ حرفِ نیش دار بھی پیش کرتا ہے اور حرفِ پیچا پیچ بھی سامنے لاتا ہے۔ وہاں "نالہ مستانہ از تارِ چنگ" کا انداز بھی ہے، مگر ساتھ ہی "حرفِ تہ دار سے بہ اندازِ فرنگ" کی بھی کمی نہیں۔ اس کے فن کا ایک سرا ذکر ہے تو دوسرا فکر۔ یہی ذکر و فکر، یا نالہ مستانہ اور حرفِ تہ دار، اس کے کلام میں بھنور پیدا کرتے ہیں۔ اور اقبال کی خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ ہے کہ اس کی شاعری کے سمندر میں سبک خرام لہریں بھی ہیں" اور کہیں کہیں موجہائے بلند خیز اور ہوائے تند و تیز کا تصادم گرداب بھی پیدا کرتا ہے۔ فنِ اقبال کا بحرِ بیکراں نہ تو بحرِ منجمد کی طرح یخ بستہ ہے، نہ بحرِ اکاہل کی طرح موجوں کی انگڑائیوں سے خالی اور پُرسکون، اور نہ بحرِ اوقیانوس کی طرح ہمہ تن طوفانی — بلکہ یہ ساری کیفیتیں اس میں اچھے تناسب سے پائی جاتی ہیں۔ البتہ کیفیتِ سکون سے کیفیتِ حرکت کا تناسب زیادہ ہے۔

ہاں تو کلامِ اقبال کے گرداب ہی وہ مشکل مقامات سامنے لاتے ہیں، جنھیں اقبال کا طالب علم بہ یک نگاہ گرفت میں نہیں لے سکتا اور ایسے ہی مقامات کو شارحینِ اقبال نے اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے۔ مشکلاتِ اقبال میں سے ایک مسئلہ خودی اور عصیاں کے تعلق کا ہے۔ ذرا یہ مصرع ملاحظہ ہو:–

زراہِ بے عصیاں خودی نایدبدست

یعنی خودی تک پہنچنے کا راستہ عصیاں کا راستہ ہے۔ اب آپ کے ذہن میں گونجے گا کہ اسرار و رموز میں تو حکیم امت "خودی" کا مرحلۂ اوّل طاعت کو قرار دیتے ہیں۔ جی ہاں بجا، مگر ہر طاعت کسی دوسری جانب کے لئے عصیاں ہوتی ہے۔ ایمان باللہ، کفر بالطاغوت کو مستلزم ہے۔

مگر آئیے، ذرا پہلے اقبال کے اس حرفِ راز کو ماحولِ کلام میں رکھ کر دیکھیں۔ یہ جاوید نامہ کا اہم ترین باب اور سفرِ زندہ رود کا آخری مرحلہ ہے۔ "آنسوئے افلاک" کے اس باب میں حکیم المانوی نطشہ، شرف النساء، سید علی ہمدانی، ملا طاہر غنی کاشمیری، شاہِ ہمداں، نادر شاہ، شاہ ابدالی، سلطان شہید ٹیپو، ناصر خسرو علوی جیسی شخصیتیں جلوہ گر ہوتی ہیں اور بے حد اہم رموز سے پردہ کشائی ہوتی ہے۔ آخر میں حورانِ بہشتی کی ایک جھلک دکھائی دیتی ہے اور پھر

"مقامِ حضور" آ جاتا ہے جو انسانیت کا آخری منتہا ہے۔

یوں تو اقبال کی شاعری من حیث المجموع قوت کا پیغام اور تصادم (برائے حق) کی نفیر ہے۔ مگر یہ آنسوئے افلاک والا پورا باب رموزِ قوت و سطوت اور اسرارِ جہد و پیکار پر مشتمل ہے۔

یہ شروع ہی اس مصرع سے ہوتا ہے کہ ؎

ہر کجا استیزۂ بود و نبود

اور ؎ ہر کجا مرگ آورد پیغامِ زیست

پھر ہم قصرِ شرف النساء پر ایک نگاہ ڈالتے ہیں جس کا مقام یہ ہے کہ "ہیچ مادر این چنیں دختر نہ زاد" اور خاکِ لاہور کو اس کے مزار کا شرف آسماں مقام بنا دیتا ہے۔ وہ حاکمِ پنجاب کی چشم و چراغ اور دودۂ عبدالصمد کی رونق جب تک زندہ رہی تو اس شان سے کہ ؎

در کمر تیغ دو رُو قرآں بدست | تن بدن، ہوش و حواس اللہ مست
خلوت و شمشیر و قرآن و نماز | اے خوش آں عمرے کہ رفت اندر نیاز

اور جب انتقال کیا تو ماں سے بڑی عاجزی کے ساتھ بطور وصیت یہ التجا کی کہ اس کی قبر پر شمشیر و قرآں رکھے جائیں۔ اسی باب میں شاہ ہمداں کہتے ہیں کہ "خویش را بر اہرمن باید زدن" اور ضرب کو ضربِ سخت بنانے کی تلقین کرتے ہیں۔ اور پھر ہم دولر کی ایک موج کا پیغام سنتے ہیں کہ ؎

زیستن اندر حدِ ساحل خطاست | ساحلِ ما سنگے اندر راہِ ماست
با کراں در ساختن مرگِ دوام | گرچہ اندر عجز غلطی صبح و شام
زندگی جولاں میانِ کوہ و دشت | اے خنک موجے کہ از ساحل گذشت

اور

باش تا بینی کہ بے آوازِ صور | ملتے برخیزد از خاکِ قبور

پھر یہی بات ہے جس پر اقبال کی انتہائی اہم اور مشہور غزل آتی ہے:۔

با نشۂ درویشی درساز و دمادم زن | چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن
گفتند جہانِ ما، آیا بہ تو می سازد | گفتم کہ نمی سازد، گفتند کہ برہم زن

اس غزل میں شاعر نے یہ شکایت بھی کی ہے کہ مختلف پیکروں میں کہیں شائستہ حریف نہیں ملا۔ اور اسی میں "چاک در پیکرِ عالم زن" کا پیغام بھی ہے۔

آنسوئے افلاک میں بھرتری ہری سے دوبارہ ملاقات ہوتی ہے اور وہ "لذت اندر جستجو" کا نکتہ بیان کرتا ہے۔

جاوید نامہ کے اس اہم تکمیلی باب میں ایشیا کے زوال کا قصہ چھڑتا ہے اور اسی سلسلے میں فرنگی تہذیب کے تسلط اور تقلیدِ غرب کے روگ کا تذکرہ بڑی تفصیل سے آتا ہے۔ ترکوں، ایرانیوں، افغانستانیوں اور ہندیوں میں سے ایک ایک کی

ذہنی غلامی کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ ابدالی بتاتا ہے کہ ؎

قوتِ مغرب نہ از چنگ و رباب      نے ز رقصِ دخترانِ بے حجاب
نے ز سحرِ ساحرانِ لالہ روست      نے ز عریاں ساق و نے از قطعِ موست
محکمی او را نہ از لادینی است      نے فروغش از خطِ لاطینی است

بلکہ —— "قوتِ افرنگ از علم و فن است"

جلوہ ہائش خانماں ہا سوختہ      شاخ و برگ و آشیانہا سوختہ

اور ابدالی علاج اس کا بیان کرتے ہوئے اپنے نسخہ کا جزوِ اعظم یہ بتاتا ہے کہ ؏

"تکیہ جز برخویش کردن کافری ست"

یہاں پہنچ کہ ہندوستان (برصغیر) کا حال زار بیان ہوتا ہے کہ ؎

آنکہ اندر مسجدش ہنگامہ مُرد      آنکہ اندر دیر او آتش فسُرد

اور زندہ رود اپنا تاثر یہ بیان کرتا ہے کہ اہلِ ہند قانونِ فرنگ کو دل سے قبول نہیں کرتے بلکہ ؏

روح را بار گراں آئینِ غیر

اب وہ موقع آتا ہے جہاں سلطان شہید (ٹیپو) کلام فرماتے ہیں کہ ؎

چوں بہ دید آدم از مشتِ گلے      با دلے، با آرزوئے در دلے
لذتِ عصیاں چشیدن کارِ اوست      غیرِ خود چیزے ندیدن کارِ اوست
زانکہ بے عصیاں خودی ناید بدست      تا خودی ناید بدست آید شکست

آپ جب یہ بات سنتے ہیں کہ خودی بغیر عصیاں دستیاب نہیں ہوتی تو اگر ماحولِ کلام سامنے نہ ہو تو چونک جائیں گے مگر یہاں فی الحقیقت عصیاں سے مراد معصیت یا گناہ نہیں ہے بلکہ مجرد انکار و تصادم ہے اور وہ بھی "آئینِ غیر" کے خلاف۔ یعنی موضوعِ فکر تحریک آزادی ہے۔ جس میں سول نافرمانی بھی شامل ہے بلکہ ایک مرتبہ میں نے ایک دوست کے استفسار پر اسے بھی بتایا تھا کہ یہاں عصیاں سے سول نافرمانی مراد ہے۔ اگرچہ اس کی آخری منزل بغاوت بھی ہوتی ہے۔ عصیاں مطلوب ہے مگر نظامِ باطل کے خلاف جو انسان کو انسان کی غلامی میں ڈال دے۔ بغاوت مطلوب ہے مگر ایسے جہانِ ناپسندیدہ کے خلاف جس کے ساتھ انسان کی روح سازگاری نہ کر سکے۔ اس کے لئے اقبال کا دیا ہوا پیغام "برہم زن" کا ہے۔

خود قرآن نے باطل کے خلاف اس عصیاں کا درس دیا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ طاغوت (غیر اللہ) سے کفر کیا جائے، ہر جبارِ عنید کے اتباع سے انکار کیا جائے۔ وہ چاہتا ہے کہ مستضعفین اربابِ استکبار کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ چاہے اس کا ابتدائی نتیجہ "اتہ وچوب وصلیب" ہی کی شکل میں کیوں نہ ملے جو نگاہِ عشق میں عید سے کم نہیں۔

اقبال کے ہاں حق کی صفت ضعف نہیں، بلکہ ؏

## توانائی صداقت تو آم است

صداقت ——— اور کلام کی صداقت وہ ہے جو جھوٹ اور باطل کو اول تو قوتِ بازو سے تبدیل کر دے، ورنہ قوتِ کلام سے اس پہ حملہ آور ہو، یہ بھی نہیں تو آخری درجہ یہ ہے کہ صاحبِ صداقت کسی جھوٹ اور باطل کو دل سے قبول کرنے اور اس کا ساتھ دینے پر تیار نہ ہو۔ حدیث رسولؐ کے مطابق صداقت کی توانائی کی آخری حد ہے۔ یہ باقی نہ رہے تو پھر ایمان کی نفی ہے۔

اس مقام پہ غور کرتے کرتے ایک بار یہ نکتہ بھی میرے سامنے آیا کہ خود دین میں نشو و نما پانے کے لئے قدمِ اول پہ عصیاں بسا اوقات وہ کام کرتا ہے جو راہرو کے لئے ٹھوکر کرتی ہے۔ ٹھوکر کھانے والا راہگیر اور زیادہ چوکنا ہو جاتا ہے اور اچھی طرح سنبھل کر چلتا ہے

یہ خیال اس وجہ سے پیدا ہوا کہ سلطان شہید کے بقول جب آدم ——— وہ آدمِ اوّل ہو، یا اولادِ آدم ——— وہ انفرادی ہستی ہو یا اجتماعی ہیئت ——— دل سے آراستہ ہو کر نمود پاتا ہے اور اس کے دل میں آرزو چل چل مچاتی ہے تو اس کے لئے "لذتِ عصیاں چشیدن" کے سوا کوئی چارۂ کار ہی نہیں۔ نت نئے مرحلوں کا سامنے آنا، نت نئے فیصلے کرنا، نت نئے اقدام کرنا، خطرات مول لینا، گرنا اور اٹھنا، چوٹ کھانا اور پھر سنبھلنا، یہ انسانی زندگی کا لازمہ ہے۔ آدمِ اول کی جو داستان قرآن میں بیان ہوئی ہے وہ بڑی سبق آموز اور نکتہ آفرین ہے۔ جہاں شعور و ارادہ پایا جائے گا وہاں نئے نئے تجربات کا سلسلہ چلے گا۔ وہ خیر و شر میں کشاکش ہوگی اور اس کشاکش میں کبھی نہ کبھی پانسہ الٹا بھی پڑے گا۔ "لا تقربا هٰذه الشجرة" کی پکار تنہا نہیں آتی، بلکہ وہ شجر بھی اپنی طرف بلاتا ہے، پیغمبرِ عصیاں اس کی طرف بلاتا ہے اور اس کے پھل کی خوبیاں اور لذات بیان کر کے طبائع کو للچا دیتا ہے۔ یہاں تک کہ غلطی کے درخت کا پھل کھا کر جب آدمی اس کی تلخیوں سے دو چار ہوتا ہے تو پھر اس کی اپنی طبیعت اندر سے ہادیٔ خیر بن جاتی ہے۔ پھر وہ اپنا بہترین ہادی خود ہوتا ہے۔ یہ "ٹرائل اور ایرر" کا سلسلہ بالکل ناگزیر ہے۔ پہلے جو ہدایت باہر سے سنائی دیتی تھی اور پرائی معلوم ہوتی تھی، وہ اب اپنے اندر سے اپنی بن کر سنائی دینے لگتی ہے۔ خودی اسی طرح کی ٹھوکروں اور چوٹوں سے نشو و نما پاتی ہے۔

جو لوگ "گناہ" کا مزہ چکھنے سے محروم رہ جاتے ہیں اور اس کے ساتھ "توبہ" کی لذت سے بے خبر رہتے ہیں، وہ نیک اور شریف ہو سکتے ہیں، مگر نہایت کمزور قسم کے۔ ان کی زندگی میں ایک طرف خوف اور جھجک کا میلان ہوتا ہے اور دوسری طرف نیم جان سی حسرتِ گناہ ساتھ ساتھ لگی رہتی ہے جو عملی گناہ سے بدتر ہوتی ہے۔ اور گھن کی طرح ضمیر اور روح کی خوبیوں کو کھا جاتی ہے۔ ناکردہ گناہ بسا اوقات کردہ گناہوں سے زیادہ سخت بلائے جان اور فتنۂ ایمان ہوتے ہیں۔ اس سے اگر کسی کو استثنیٰ حاصل ہے تو صرف انبیاء علیہم السلام کو جو تجلیات اللہ سے بہرہ مند کئے جاتے ہیں اور جن کی تربیت کا ایسا غیر معمولی انتظام ہوتا ہے کہ وہ خیر و شر کو ان کے نتائج سمیت خوب اچھی طرح جانتے ہیں۔ ان کی عصمت میں حسرتِ گناہ کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا۔

اس موقع پہ اگر وہ حدیث رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وسلم) سامنے رہے تو مدعا اور زیادہ واضح ہو جائے گا

جس میں حضور ؐ نے ایک مثال دے کر گناہ اور توبہ کی حقیقت کو واضح کیا ہے ۔ فرمایا کہ جیسے کسی صحرائی مسافر کی اونٹنی عین صحرا میں اس سے بچھڑ جاتی جس پر کھانا اور پانی بھی لدا ہو اور وہ عالم اضطراب میں اس کا سراغ لگانے کے درپے ہو، یہاں تک کہ کامل مایوسی اس پر طاری ہو جائے اور اس کا زندہ رہنا مشتبہ ہو جائے اور اس عالم میں یکایک وہ اونٹنی اس کے پاس آ کھڑی ہو تو جو لامحدود خوشی اسے حاصل ہوتی ہے، ویسی ہی خوشی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس بندے کے لئے منائی جاتی ہے جو گناہ کی وادیوں میں بھٹک گیا ہو اور پھر کچھ وقفے کے بعد توبہ اسے واپس مالک کے پاس لے آئے ۔ چنانچہ محض نیکی کرنے والوں سے بسا اوقات گناہ کر کے نیکی کی راہ اختیار کرنے والوں کا درجہ بلند تر ہو جاتا ہے

یہ حقیقت تو واضح ہے کہ کوئی آقا یہ نہیں چاہتا کہ اس کا خادم تہی دماغ، محروم فکر، کور ذوق، آئین گر اور تصیدہ خواں قسم ہو ۔ وہ خود سوچنے والا نہ ہو، نئے راستے نہ نکال سکے، تجربات کی جرأت نہ کر سکے ۔ محض اس خوف سے کوئی بڑا کارنامہ انجام نہ دے سکے کہ کہیں کوئی غلطی نہ ہو جائے ۔ ایسے خادم کی طاعت منفی، جامد اور بے جان قسم کی طاعت ہوتی ہے ۔ لیکن سوچنے سمجھنے والا، بیدار مغز، متحرک، فعال اور صاحب استدلال خادم دس غلطیاں بھی ضرور کرے گا مگر ان کے بالمقابل وہ شاندار کارنامے بھی ایسے انجام دے گا جو اس کی زندگی میں سنگ میل بن جائیں اور دوسروں کے لئے مثال ہوں ۔

مثال کے طور پر آپ حضرت عمر رضؓ کی شخصیت کو لیں جو دور جاہلی میں ایک عیش پسند نوجوان تھے ۔ شراب خانوں کے چکر لگانے اور لونڈیوں کے گانے سننے کا انہیں شوق تھا اور نبی پاک ؐ کی تحریک فلاح کے ایسے کٹر دشمن تھے کہ حضور کے پیروؤں پر ظلم و ستم ڈھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ۔ مگر جب ذہن پلٹا تو پھر آسمان ملت کے درخشندہ آفتاب بن کر چمکے ۔ اسی طرح ماعز اور غامدیہ کی مثالیں دیکھئے کہ ان سے اگر گناہ سرزد ہوا تو کسی دوسرے کی رپورٹ اور شہادت کے بغیر خود اپنے آپ کو حضور رسالتمآب کے سامنے انتہائی سنگین سزا کے لئے پیش کر دیا ۔ کیا ہی مقام بلند ان کو حاصل ہوا ۔

ان مثالوں سے بظاہر کیا مطلوب ہے کہ عصیاں کو اگر ہم دینی معنوں میں بھی گناہ قرار دیں اور اس کی مثال اولین آدم اوّل کے ہاں سے لیں کہ انھوں نے شجر ممنوعہ کا پھل کھا لیا تھا، تو اس صورت میں بھی گناہ سے چل کر توبہ کی سیڑھی طے کر کے جو بلندیاں انسانوں نے حاصل کی ہیں وہ بہترین زریں مثالیں ہیں ۔ ارتقائے انسانیت اور نشو و نمائے خودی کی !

بہرحال زندگی ایک ایسا راستہ نہیں ہے جو بالکل ہموار بنا دیا گیا ہو، اس میں پیچ و خم ہیں، خارزار ہیں، پتھر اور چٹانیں ہیں، گھاٹیاں اور ٹیلے ہیں، اور ہر چند کہ جا بجا الہامی ہدایات کے سنگ و میل اور نشانات نصب ہیں، اور عقل و تمیز کا چراغ بھی انسان کو دیا گیا ہے، مگر اس راستے پر غول بیابان اور نہایت خوبصورت رہزن بھی ہیں جو ہمیشہ خیرخواہ رہنما بن کے آتے ہیں، اس راستے کے آس پاس رقص و سرود کی محفلیں بھی ہیں، سایہ دار کنجوں میں جام لنڈھانے والے حلقے بھی ملتے ہیں، کہیں کہیں ایسی سرائیں بھی آتی ہیں جہاں اپسرائیں ترانہ ہائے خیر مقدم گاتی راہگیر کو گلے لگا

رگا دیتی ہیں اور مے سفرِ خودی سے ہٹائے جاتی ہیں۔ سوچئے کہ ایسے راستے کے کتنے مسافر اپنے آپ کو ان مرحلوں سے بچا سکیں گے اور کہاں تک بچا سکیں گے۔ عصیاں کی خوشنما کشش کبھی نہ کبھی انسان کو کھینچ لے جاتی ہے، مگر پھر جب جامِ عصیاں کی تلخی کا خمیازہ پیش آتا ہے تو پست فطرت لوگ اس کا ازالہ کرنے کے لئے مزید جام طلب کرتے ہیں اور پھر اس چکر سے کبھی نکل نہیں سکتے، یہاں تک کہ ان کی خودی مر جاتی ہے اور وہ محض گوشت کا ایک مجسمہ رہ جاتے ہیں۔ اونچے لوگ وہ ہوتے ہیں جو جامِ عصیاں کی لذت کے بعد خمیازہ بھگتتے ہی سازِ خودی پا لیتے ہیں۔ یہی لوگ انبوہِ زندگی کا حاصل ہیں۔

اب پڑھئے اقبال کے وہ اشعار ؎

چوں بروید آدم از مشتِ گلے ۔۔۔۔ با دلے، با آرزوے در دلے
لذتِ عصیاں چشیدن کارِ اوست ۔۔۔۔ غیرِ خود چیزے ندیدن کارِ اوست
زانکہ بے عصیاں خودی ناید بدست ۔۔۔۔ تا خودی ناید بدست آید شکست

اور ان اشعار کے ورد کے بعد پورے عہدِ حاضر سے بغاوت و عصیاں کرنے کے لئے ذیل کے شعر کو وظیفہ بنا لیجئے ؎

تا نہ خیزد بانگِ حق از عالمے ۔۔۔۔ گر مسلمانی نیاسائی دمے

---

# جاوید نامہ کا نیا انگریزی ترجمہ

پروفیسر آرتھر آربری نے سر محمد اقبال کی تصنیف "جاوید نامہ" کا نیا انگریزی ترجمہ پچھلے سال جولائی ۱۹۶۶ء میں شائع کر دیا۔ کیمبرج یونیورسٹی کی جانب سے اسلامی علوم کے باب میں یہ ایک تازہ ترین اضافہ ہے۔

ترجمے کا کام یونیسکو کے شعبۂ پاکستان کی سفارش پر دو سال قبل تفویض کیا گیا تھا۔ یہ کام ایک منصوبے کے تحت ہوا ہے جس کا مقصد ممبر ممالک کے بہترین ادب کو ترجمے کے ذریعے بین الاقوامی قارئین تک پہنچانا ہے۔

پروفیسر آربری نے، جو ۱۹۴۷ء سے کیمبرج میں عربی کے پروفیسر اور یورپ کے ایک ممتاز اسلامی سکالر ہیں، پچھلے دنوں انڈین پریس سروس سے اقبال اور ان کی تصنیف کے بارے میں بات چیت کی۔ آپ نے فرمایا:۔

"سر محمد اقبال، جن کی وفات ۱۹۳۸ء میں ہوئی، ایک سیاست دان اور فلسفی تھے۔ انہیں جدید پاکستان کا "مفکر" اور ہندوستان میں ایک جداگانہ اسلامی مملکت کی تشکیل کا پہلا بے باک ترجمان بھی کہا جاتا ہے، لیکن ان سب حیثیتوں سے بڑھ کر وہ ایک شاعر تھے۔ "جاوید نامہ" ان کی آخری اور غالباً بہترین مطبوعہ تصنیف ہے۔ ڈانٹے کی طرز پر لکھی ہوئی یہ ایک رزمیہ نظم ان کے سیاسی فلسفے کی سب سے بڑی تفسیر ہے۔ نطشے کی طرح اس میں انسان کو خدا کے رفیق کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔

"جاوید نامہ" کلاسیکی فارسی میں لکھا گیا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک مسلم ہندوستان کی ادبی زبان یہی تھی۔ اس کتاب کی زبان اور اسلوب کی تعریف فارسی اسکالروں نے بھی کی ہے۔ یہ اس کتاب کا دوسرا انگریزی ترجمہ ہے، لیکن میں نے کوشش کی ہے کہ شعریت اور مفہوم کو برقرار رکھوں"۔

پروفیسر آربری اقبال کی فارسی شاعری پر سند کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے مترجم کلام کے اب تک تین مجموعے شائع کر چکے ہیں: "لالۂ سینا" (ٹیولپس آف سینائی ۱۹۴۷ء) "زبور عجم" (پرشین سامز ۱۹۴۹ء) اور "رموز بیخودی" (مسٹریز آف سیلف لیس نیس ۱۹۵۸ء)

پروفیسر آربری نے، جو شاعر کی زندگی اور ان کی شاعری سے بخوبی واقف ہیں،
بتایا کہ سر محمد اقبال اور کیمبرج یونیورسٹی کے مابین گہرے روابط پہلے سے موجود ہیں:۔

"۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۸ء کے مابین اقبال جب ٹرینٹی کالج میں طالب علم تھے تو کالج کے ماسٹر، موجودہ ماسٹر لارڈ بٹلر کے پردادا مانٹیگو بٹلر تھے۔ مزید براں لارڈ بٹلر کے والد سر مانٹیگو بٹلر کچھ عرصہ ہندوستان میں صوبائی گورنر رہے اور وہ اقبال سے اچھی طرح واقف تھے۔ درحقیقت انھوں نے ہی "سر" کے خطاب کے لئے اقبال کا نام پیش کیا تھا اور جب وہ اس کالج میں پیمبروک کے ماسٹر بننے کے لیے واپس آئے تو انھوں نے مجھے اقبال کی ایک ابتدائی کتاب "اسلام میں فلسفۂ الٰہیات کی تشکیل جدید" کا دستخط شدہ پہلا ایڈیشن ایک خط کے ساتھ دیا جس میں پہلی بار انھوں نے ہندوستان میں ایک جداگانہ اسلامی مملکت کا تصور پیش کیا تھا۔ یہ میں نے ٹرینٹی کالج کو پیش کر دیا اور اس طرح دائرہ مکمل ہو گیا۔"

عباد اللہ فاروقی

# خواجہ حافظ اور اقبال میں نصب العین کی وحدت

اقبال کا نظامِ فکر خواجہ حافظ کے نظامِ فکر سے اگرچہ کسی قدر متبائن اور متغائر ہے تاہم دونوں میں جا بجا مماثلت اور اشتراک کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ جس سے اس امر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں ایک ہی شراب کے متوالے ہیں۔ ان کے پینے کے انداز اگرچہ مختلف ہیں تاہم شراب ایک ہی ہے۔ حافظ کے تصورات اگرچہ اقبال کے مقابلے میں سکونی اور انفعالی ہیں۔ تاہم حافظ اپنے عہد کے مقتضیات کے مطابق ہمیشہ مثبت تصورات اور رجحانات کے نقیب رہے ہیں۔ اقبال نے بساطِ زندگی پر اس وقت کروٹ لی جب حالات انتہائی کشمکش اور جدوجہد کے متقاضی تھے ان حالات میں انہیں خواجہ حافظ کے عہد کی سرگرمیاں سکون اور جمود کی حامل نظر آئیں۔ اور انہوں نے خواجہ حافظ کو موردِ الزام ٹھہرایا۔ حالانکہ دونوں ایک ہی نصب العین یعنی سماجی بہبود اور قومی فلاح کے علمبردار ہیں حصولِ مقصد کی خاطر اقبال کشمکشِ حیات اور جہادِ زندگی کے ساتھ شعورِ نفس اور تقویمِ ذات کو لازم قرار دیتے ہیں اور اسی کو وہ عشق کا نام دیتے ہیں۔ حافظ اگرچہ اقبال کے اس نظریے کے خلاف نہیں تاہم وہ مختلف اجزائے ترکیبی مثلاً اخوت رواداری سرور اور لذت وغیرہ سے کام لیتے ہیں جو ان کے نزدیک عشق ہی کے اجزائے ترکیبی کا درجہ رکھتے ہیں۔ غرض اصلاحِ احوال کے لحاظ سے خواجہ حافظ کو وہ عوامل بروئے کار لانا پڑے جن کا زمانہ طلبگار تھا۔ اقبال کے عہد کے تقاضے کچھ اور تھے۔ جو بجائے امن اور آسودگی کے دعوتِ فکر و عمل دے رہے تھے۔ بہرحال یہ مسلّم ہے کہ دونوں کا مقصد زندگی اور نصب العین ایک ہی ہے۔

حافظ کا فنائے ذات کا تصور بلاشبہ انفعالی کیفیت کا حامل معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ بقائے نفس اور شعورِ ذات کے لئے شرطِ اول ہے۔ بالفاظِ دیگر اثبات کے لئے نفی کا جذبہ لازم و ملزوم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال جو اثباتِ نفس کے ترجمان اور نقیب ہیں اس حقیقت سے اعراض نہ کر سکے اور خواجہ حافظ کی مانند انہیں بھی اس تصور کو قبول کرنا پڑا۔

یہاں ہم ضمناً یہ بھی بیان کر دینا چاہتے ہیں کہ تقویمِ خودی یا شعورِ نفس کا تصور جو اقبال کے یہاں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ حافظ کے یہاں بھی موجود ہے۔ دونوں عشق ہی کو قیامِ نفس اور تعینِ ذات کا وسیلہ قرار دیتے ہیں۔

لیکن جہاں حافظ کے نزدیک عشق عبارت ہے سوزِ دوام کششِ حیات سرورِ طمانیت اور آسودگیٔ نفس سے وہاں اقبال اسے صرف کشش مکششِ حیات اور سوزِ دوام قرار دیتے ہیں۔ اس طرح حافظ کے تصورِ عشق کے بعض عناصرِ ترکیبی مثلاً سرور و استغراق دردِ عشق و وارفتگی اقبال کے حرکی نظامِ عشق میں ساقط ہو کر رہ جاتے ہیں۔ تاہم دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ طالبِ حق عشق کی بدولت نہ صرف بقائے دوام کا درجہ حاصل کرتا ہے بلکہ ہستی کے خاموش شبستانوں میں ایک غلغلہ اور شورِ محشر کی سی کیفیت برپا کرنے کا اہل بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ عشق کی حیات آفرینی اور ہنگامہ خیزی کے آرزومند ہیں۔ فرماتے ہیں۔ ؎

حاتبت منزلِ ما وادیٔ خاموشان است  حالیا غلغلہ در گنبدِ افلاک انداز

یہی تصور اقبال کے ہاں بھی ملتا ہے ؎

مرید حلقۂ رندانِ بادہ پیما باش  حذر ز بیعتِ پیرے کہ مردِ غوغا نیست

میلادِ آدم پر اقبال کی نظم اس کے تصورِ عشق کی ترجمان ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ ؎

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد  حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد

فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور  خودگرے خود شکنے خودنگرے پیدا شد

غرض حافظ کا فلسفہ عشق قریب قریب وہی ہے جس کے اقبال داعی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اقبال کے ہاں عشق کے بعض پہلو زیادہ نمایاں ہو گئے ہیں۔ حکیم الامت اور عارف شیرازی خیر (Will to Good) ہی کو عشق کا مقصود بتاتے ہیں۔ دونوں کے مقاصد میں حقیقت کے ساتھ مجازی عناصر اس طرح پیوست ہو گئے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے الگ کرنا محال ہے۔ جہاں خواجہ حافظ حقیقی اور مجازی سرور سے سرشار ہیں وہاں اقبال مجاز کو مقصود نہیں، بلکہ حقیقت کا ایک ذریعہ بتاتے ہیں۔ اس طرح اقبال کا تصورِ عشق ارتقائی درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ خواجہ حافظ اپنے تصورات کی ترجمانی کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ؎

گفتم صنم پرست مشو با صمد نشین  گفتا بکوئے او بہ ایں وہم آں کنند

اقبال عشق کا ارتقائی تصور اس طرح پیش کرتا ہے۔ ؎

چوں نظر قرار گیرد بہ نگارِ خوب روئے  تپد آں زماں دلِ من پئے خوب تر نگارے

اس میں شبہ نہیں کہ اقبال عشق کی تعبیر جا بجا عزم بالقوت (Will to Power) سے کرتے ہیں۔ جبکہ حافظ کے ہاں عشق عزم للخیر سے عبارت ہے۔

خواجہ حافظ تصورِ عشق کی ترجمانی ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ ؎

جناب عشق بلند است ہمتے حافظ  کہ عاشقاں رہِ بے ہمتاں بخود ندہند

پھر عشق کے مقاصدِ عالیہ کے لئے یوں ہمت بندھاتے ہیں ؎

در بیاباں گر بہ شوقِ کعبہ خواہی زد قدم  سرزنش ہا گر کند خارِ مغیلاں غم مخور

ذیل کے شعر میں "آتشِ عشق" "ہمتِ باطنی" کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ ؎

آتش آں نیست کہ بر شعلہ او خندد شمع　　　آتش آن است کہ بر خرمنِ پروانہ زدند

غرض ماہیت کے اعتبار سے دونوں کے تصورات عشق میں ہم آہنگی ہے۔ دونوں ملت کے اجزائے پریشان کی شیرازہ بندی کرنا چاہتے ہیں۔ حافظ نصب العین کی خاطر خیر و سلامتی کا پیغام پیش کرتے ہیں۔ ؎

مباش در پے آزار و ہر چہ خواہی کن　　　کہ در طریقتِ ما غیر ازیں گناہے نیست

اقبال بھی عشق ہی کو ذریعہ اتحادِ ملی قرار دیتے ہیں۔ ؎

نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست　　　سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

حافظ کے مذکورہ تصورات کی بنا پر ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ خواجہ حافظ کا شمار اُن صوفیا میں نہیں ہوتا جو سماجی حقائق سے روگردانی کر کے عزلت گزینی اختیار کر لیتے ہیں۔ خواجہ حافظ گوشہ نشین ہوتے ہوئے بھی حیاتِ اجتماعیہ کی تعمیر اور ملتِ اسلامیہ کی تشکیل میں ہمہ تن مصروف رہے یہ ضرور ہے کہ ان کے تصورات کی غلط تعبیر نے عوام کو مجاہدانہ زندگی سے بیگانہ کر دیا حتیٰ کہ پوری قوم جمود اور تعطل میں مبتلا ہو کر رہ گئی۔ کسے خبر تھی کہ مستقبل قریب میں فکرِ حافظ کے منفی اثرات فضا میں پھیل جائیں گے۔ جس سے عوام کو واماندگی افسردگی اور بے راہروی کا شکار ہونا پڑیگا۔ اور وہ پیغامِ محبت جس کی عالمگیر اشاعت کی خاطر عارف شیرازی نے دیر و حرم کا امتیاز بھی مٹا دیا تھا ایک دن بے کیف اور بے حقیقت ہو کر رہ جائے گا،

در عشق خانقاہ و خرابات شرط نیست　　　ہر جا کہ ہست پرتوِ روئے حبیب ہست

اس ضمن میں سجاد ظہیر کا یہ بیان کسقدر حقائق پر مبنی ہے۔

"حافظ عشق و محبت کو تمام کائنات کے وجود و ارتقا کا محرک اور بنیادی اصول سمجھتا ہے۔ اور نوعِ انسانی کو اس کا امین۔ اس کے نزدیک مودت کا یہ جذبہ ہی انسانی سرشت کا سب سے قیمتی اور لطیف جوہر ہے۔ جو آب و گل کی اس تعمیر میں تمام اخلاقی اور روحانی خوبیاں پیدا کرتا ہے۔ ؎

دوش دیدم کہ ملائک درِ میخانہ زدند　　　گلِ آدم بسرشتند و بہ پیمانہ زدند

انسان کی سرشت میں محبت کا وجود اللہ تعالیٰ کی ودیعت اور ایمان ہے۔ یہ ایک نعمت ہے جس کی فراوانی اور پہنائی انسان کو اس کی تمام پستیوں سے اونچا کر کے خیر و برکت کی طرف لیجاتی ہے۔

حافظ کے کلام میں صوفی درویشوں کا خرقہ یا دلق کا بار بار ذکر آتا ہے۔ اسے ہر جگہ فریب دو رنگی اور ریاکاری کی علامت بتایا گیا ہے۔ اسی طرح درویشوں کی خانقاہیں اور صومعے زندگی سے فرار کی پناہ گاہوں اور محبوب کے مرکزوں کے نشان کے طور پر پیش کئے گئے ہیں۔ صوفی کو مخاطب کر کے خواجہ حافظ فرماتے ہیں۔

در سماع آئی و زِ سر خرقہ بر انداز و برقص　　　ورنہ در گوشہ نشیں و دلق ریا در سر گیر"[۱]

---

[۱] ذکرِ حافظ مصنفہ سجاد ظہیر صفحہ ۱۴۱ مطبوعہ انجمن ترقی اردو (ہند)، علیگڑھ

واقع رہے کہ اقبال نے جو تنقید اسرارِ خودی کے پہلے ایڈیشن میں کلام حافظ پر کی اور جس پر خواجہ حسن نظامی مرحوم معترض ہوئے اس کی وجہ خواجہ حافظ کی شاہد بازی اور صہبا گساری ہرگز نہ تھی۔ اور نہ ہی کبھی وہ جمود و تعطل اور فلسفۂ عیش پسندی اور آرام طلبی کے مرتکب ہوئے جیسا کہ ان کے کلام سے ظاہر ہے۔ بات صرف اتنی تھی کہ اقبال کو حافظ دیگر صوفیا کی طرح نفیِ ذات کے نقیب اور زندگی کے حقائق سے منکر نظر آئے حالانکہ ظاہری الفاظ کے پردے میں حافظ جو پیغام پیش کر رہے ہیں وہ ان کے حکیمانہ پیغام سے متاثر نہیں۔ بلکہ پوری طرح سے ہم آہنگ ہے۔ بالفاظِ دیگر خواجہ حافظ نفیِ خودی نہیں بلکہ تقویمِ خودی اور اثباتِ نفس کا نظریہ پیش کرتے ہیں۔ جسکو اقبال بڑی وضاحت سے اپنے نظامِ فکر ہی میں مرکزی جگہ دیتے ہیں۔

اس بیان کی تائید میں بشیر مخفی فرماتے ہیں کہ "حافظ ایک خود آگاہ اور زندہ قلندر ہے جس نے اپنی آنکھوں سے کئی انقلابات دیکھے۔ وہ جمود اور تعطل کے اثرات پھیلانے کا باعث نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم غور و فکر کریں تو یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ حافظ کی فلاسفی " بے خودی " کی مستانہ کیفیتوں میں بھی " خود آگہی " اور ہمت و عمل کی آئینہ دار ہے اب اگر اس کے آرٹ اور نظریے، سے عوام کچھ اور مطلب نکالیں۔ تو حافظ کی شاعری موردِ الزام نہیں ہو سکتی۔ حافظ فطرتی جذبات اور عرفانی مشاہدات کی جھلک دکھاتا ہے۔ روحانیت کے فطری مقاصد ہر دور میں فطری تربیت کی نشوونما چاہتے ہیں۔ اور اس کے لطیف اثرات ظاہر و باطن میں یکساں ظہور میں آتے ہیں۔ اس حقیقت کا انکشاف اقبال نے قلندریت کے دور میں خوب کیا ہے[1]"

سید سلیمان ندوی بھی اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ " حافظ صرف رندِ میخوار نہ تھے حکیم بھی تھے اور ان کی شراب ہر جگہ ایک شراب نہیں " [2]

مولانا عبد المالک آروی کے بیان کے مطابق اقبال نے خواجہ حافظ کے کلام سے بھرپور اثر قبول کیا ہے "اقبال نے فارسی شعراء بالخصوص صوفیانہ فارسی شاعری سے بڑی حد تک استفادہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں سنائی، عطار، رومی اور خاقانی کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اُن کی شاعری پر زبانِ فارسی کے دیگر ہندی شعراء کا بھی اثر پڑا ہے۔ مثلاً حافظ، صائب، غالب، طالب آملی، نظیری، بیدل وغیرہ کا کلام بھی ان کے زیرِ مطالعہ رہا ہے" [3]

ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم فکرِ اقبال میں فرماتے ہیں کہ عشق کے بارے میں اقبال خاص طور سے رومی کا ہم آہنگ ہے لیکن سوال یہ ہے کہ عشق آخر ہے کیا؟

اقبال اپنے ایک مکتوب میں عشق کا مفہوم بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر نکلسن کو لکھتے ہیں:۔

"یہ لفظ عشق نہایت ہی وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے یعنی کسی شے کو اپنے اندر جذب کر لینے اور

---

۱۔ "عرفانِ اقبال" مصنفہ بشیر مخفی ص ۶ مطبوعہ کتاب منزل لاہور۔

۲۔ مکتوب ۱۲۹ مورخہ ۲۴ جون ۱۹۴۳ء مطبوعہ اعظم گڑھ۔

۳۔ اقبال کی شاعری مصنفہ عبد المالک آروی مطبوعہ طاق کستاں آرہ

جو دنیا کو اپنا لینے کی آرزو کا نام عشق ہے۔ جس کا کمال اقدار اور غایات کی تخلیق ہے۔ اور ان کے حصول و تحقیق کی سعی ہے۔ عشق کا وظیفہ تفرید ہے۔ جو عاشق و معشوق کو انفرادیت عطا کرتا ہے "۔ ۱

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم تصورِ عشق کی وضاحت یوں فرماتے ہیں۔

"عشق انسان کے اندر بصیرت اور قوت دونوں کا اضافہ کرتا ہے۔ اور ایسی حقیقت سے آشنا کرتا ہے۔ جو زمانی اور مکانی نہیں۔ عقل عالم مادی کو مسخر کرنے میں ید طولیٰ رکھتی ہے۔ عقل خارا شگاف ہے۔ مگر اس کا ماخذ روح انسانی ہے۔ جس کی باطنی قوتیں لامتناہی ہیں؟"

مے نہ داند عشق سال و ماہ را ۔۔۔ دیر و زود و دور و راہ را
عقل در کوہے شگافے مے کند ۔۔۔ یا بگرد او طوافے مے کند
کوہ پیش عشق چوں کاہے بود ۔۔۔ دل سریع السیر چوں ماہے بود
زور عشق از باد و خاک و آب نیست ۔۔۔ قوتش از سختی اعصاب نیست

مگر اکثر صوفیا کے ہاں عشق فعال اور خلاق دکھائی نہیں دیتا۔ وہاں زیادہ تر محویت اور استغراق نظر آتا ہے استغراق خلوت ہی میں حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن خالی خلوت سے یکطرفہ روحانیت اور رہبانیت پیدا ہوتی ہے جو اسلام میں ممنوع ہے۔

زندگی کا ایک ظاہر ہے ایک باطن۔ ہستی میں نفس بھی ہے اور آفاق بھی۔ اور از روئے قرآن ظاہر اور باطن ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں جن کو الگ الگ کرنے کی کوشش ناکامی کا باعث ہوتی ہے۔ ۲

خواجہ حافظ کے ہاں تمدن کی بنیاد خالص عشق کے حسین امتزاج پہ ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ مادی تعقل پرستی کا نتیجہ یقیناً مادی ترقی کی صورت میں رونما ہو سکتا ہے۔ لیکن عشق کے بغیر روحانی ترقی ہرگز ممکن نہیں۔

ڈیکارٹ نے کہا تھا "چونکہ میں فکر کرتا ہوں اسلئے میں ہوں" لیکن اسلامی تمدن کے دلدادہ فلسفی شاعر اقبال اور اس سے قبل خواجہ حافظ شیرازی نے کہا تھا۔ چونکہ میں عشق کرتا ہوں اس لئے میں ہوں۔

اقبال کے ہاں چونکہ عشق کا مفہوم زیادہ وسیع ہے اس لئے وہ کائنات کی تکوین و بقاء و ارتقا کا ضامن بھی عشق ہی کو قرار دیتے ہیں۔ ۳

جمالِ عشق و مستی نے نوازی ۔۔۔ جلالِ عشق و مستی بے نیازی
کمالِ عشق و مستی ظرفِ حیدر ۔۔۔ زوالِ عشق و مستی حرفِ رازی
کبھی تنہائی کوہ و دمن عشق ۔۔۔ کبھی سوز و سرور انجمن عشق
کبھی سرمایۂ محراب و منبر ۔۔۔ کبھی مولا علیؓ خیبر شکن عشق

---

۱ دیباچہ اسرارِ خودی ۲ فکرِ اقبال صفحہ ۲۷۳ مصنفہ خلیفہ عبدالحکیم

خواجہ حافظ عشق کی فعالی اور اخلاقی قوت کے قائل ہیں جو حسن اور کمال کے تحقق کی ضامن ہے وہ اس حقیقت کا اظہار مندرجہ ذیل اشعار میں کرتے ہیں۔

سے حسن بے پایانِ او چندانکہ عاشق میکشد  زمرۂ دیگر بہ عشق از غیب سر بر می کند

سے ہر گلِ نو کہ شد چمن آرا ،  اثرِ رنگ و بوئی صحبتِ اوست

خواجہ حافظ کے نزدیک حسن و عشق ایک ہی حقیقت کے دو مختلف پہلو ہیں۔ عشقِ حقیقی مقتضی ہے حسن ابدیت اور شباب کا۔ حافظ ان میں ایک گونہ وحدت تسلیم کرتے ہیں۔ یعنی عشق کیا ہے ؟ حسن ! حسن کیا ہے ؟ عشق ! حسن و عشق کیا ہیں ؟ شباب اور بقا ! عشق وہ نور ہے جس کی بدولت عاشق نہ صرف خود جمال حاصل کرتے ہیں۔ بلکہ ہر محبوب شے کو جمال اور حسن کی لازوال نعمتوں سے مالا مال کرنے کے اہل بن جاتے ہیں۔

سے ہر گلِ نو کہ شد چمن آرا  اثرِ رنگ و بوئے صحبتِ اوست

گلبنِ حسنت نہ تو شد دلفریب  مادم ہمت بر و بگماشتیم  (حافظ)

غرض "جمال" نام ہے عشق کی ضیا گستری کا۔ ظاہر ہے کہ عشق کے بغیر حسن اور حسن کے بغیر عشق کا گمان تک بھی نہ ہو سکتا۔ بالفاظِ دیگر اگر طالبِ حقیقی نہ ہوں تو جمالِ حقیقی کا مشاہدہ کیونکر ہو۔ ہر وہ شخص جس کا حریمِ دل حسنِ لازوال کی بدولت معمورۂ عشق بن چکا ہے تقویمِ خودی کے مرتبہ پر فائز سمجھا جاتا ہے مقتضائے عشق ہی یہ ہے کہ طالب و مطلوب حیاتِ سرمدی کی لازوال نعمتوں سے مالا مال ہوں۔ ورنہ عشق کا مفہوم ہی ساقط ہو کر رہ جائے گا۔ جیسا کہ اقبال فرماتے ہیں۔

سے پیشِ ایں نورِ ار بمانی استوار  حیّ و قائم چوں خدا خود را شمار  (جاوید نامہ)

اقبال ایک اور شعر میں "عشق اور بقا" کا مفہوم بیان فرماتے ہیں۔ سے

سے قربِ جاں با آنکہ گفت "انی قریب"  از حیاتِ جاوداں بردن نصیب

خواجہ حافظ ان مطالب کو زیادہ واضح صورت میں پیش کرتے ہیں۔

سے چوں سکندر حیات اگر طلبی  لبِ لعلِ نگار را دریاب

بر رخِ ساقی پری پیکر  موسمِ گل بنوش بادۂ ناب

سے خوبانِ پارسی گو بخشندگانِ عمر اند  ساقی بدہ بشارت پیرانِ پارسا را

خواجہ حافظ حسن اور عشق کی وحدت کو مندرجہ ذیل اشعار میں بیان فرماتے ہیں :-

سے لطیفہ ایست نہانی کہ عشق از و خیزد  کہ نامِ آن نہ لبِ لعل و خطِ زنگاری ست

سے کمالِ دلبری و حسن در نظر بازیست  بہ شیوۂ نظر از نادرانِ دوراں باش

تخلیقِ حسن و عشق کے متعلق کہتے ہیں سے

سے حسنِ بے پایانِ او چندانکہ عاشق می کشند  زمرۂ دیگر بہ عشق از غیب سر بر میکنند

سے گلبنِ حسنت نہ تو شد دلفریب  مادم ہمت بر و بگماشتیم ،

طالب و مطلوب

مستور و مست ہر دو چو از یک قبیلہ اند ما دل بہ عشوہ کہ دہیم اختیار چیست

علامہ اقبال انہیں حقائق کی ترجمانی یوں کرتے ہیں۔

اگر خواہی خدا را فاش بینی خودی را فاش تر دیدن بیاموز

خواجہ حافظ اور علامہ اقبال دونوں حُسنِ نگاہ اور فیضِ نظر کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک آنکھ ہی سرچشمۂ عشق و جمال ہے اور آنکھ ہی کے فیض سے ذہنی انقلاب رونما ہوتے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں۔

ع نہ ہو نگاہ میں شوخی تو دلبری کیا ہے

پھر فرماتے ہیں۔

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی سکھائے کس نے اسمٰعیل کو آدابِ فرزندی

مرا درسِ حکیماں دردِ سر داد کہ من پروردۂ فیضِ نگاہم

مثالِ لالہ فتادم بگوشۂ چمنے مرا ز تیرِ نگاہِ نشانہ بر جگر است

اس کے برعکس خواجہ حافظ تاثیرِ نگاہ کا اظہار مندرجہ ذیل اشعار میں فرماتے ہیں۔

صد مُلکِ دل بہ نیم نگاہی تواں خرید خوباں دریں معاملہ تقصیر می کنند

مُرادِ ما ہمہ موقوفِ یک کرشمۂ تُست ز دوستانِ قدیم ایں قدر دریغ مدار

مستی بہ چشمِ شاہدِ دلبندِ ما خوش است زانرو سپردہ اند بہ مستی زمامِ ما

بہ تنگ چشمیِ آں ترکِ لشکری نازم کہ حملہ بر منِ مسکین یک قبا آورد

سرِ ہیچ یار کہ تواں بُرد بیک گوشۂ چشم شرطِ انصاف نباشد کہ مداوا نکنی

مندرجہ ذیل اشعار میں مماثلت اور ہم آہنگی درجۂ کمال کو پہنچ گئی ہے

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند (حافظ)

ہر کس کہ دید روئے تو بوسید چشمِ من کارے کہ کرد دیدۂ من بے نظر نکرد (حافظ)

بہار برگِ پراگندہ را بہم بربست نگاہِ ماست کہ بر لالہ رنگ و آب افزود (اقبال)

دونوں کے نزدیک عشق وہ لاہوتی طاقت ہے۔ جو طالبانِ حقیقی کے وجود میں سرایت کر کے انہیں حسین و جمیل بنا دیتی ہے۔ گویا حسن و عشق ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ عاشق و معشوق میں ماہیت کے اعتبار سے کوئی امتیاز نہیں۔

خواجہ حافظ اور اقبال دونوں کے ہاں یہ تصور مرکزی حیثیت رکھتا ہے کہ انائے انسانی لقائے ربانی کے عشق سے زندگی، بقا اور جمال حاصل کرتی ہے۔ یہاں تک کہ ماہیت کے اعتبار سے دونوں میں ہم آہنگی اور مماثلت پیدا ہو جاتی ہے۔ محبوب کبھی عاشق اور شانِ محبوبی سے آراستہ نظر آتا ہے۔ کبھی عاشق کا محبوب بن جاتا ہے۔

خواجہ حافظ اس نظریہ کے ترجمان ہیں۔

عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نکرد اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست

اقبال بتاتے ہیں کہ محبوبِ حقیقی عاشقِ صادق کے روپ میں حضرت انسان کی تلاش میں سرگرداں ہے۔

ما از خدائے گم شدہ ایم اُو بہ جستجو است　　چوں ما نیازمند و گرفتارِ آرزو ست
گاہے بہ برگِ لالہ نویسد پیامِ خویش　　گاہے بہ سینۂ مرغان بہ ہا و ہوا ست ،
در نرگس آرمید کہ بیند جمالِ ما۔　　چنداں کرشمہ داں کہ نگاہش بہ گفتگو است

اب تصویر کا دوسرا رُخ ملاحظہ فرمایئے۔ انائے مطلق محبوبت کی شان سے ہمکنار ہے۔ وہ ایک عاشق کے احساسات سے اس لئے بیگانہ ہے کہ وہ ماوراء اور منزہ ہے۔ اقبال نہایت ہی فنکارانہ انداز سے اس سے خطاب کرتے ہیں۔

بہ جہانِ درد منداں تو بگو چہ کار داری　　تب و تابِ ماشناسی دلِ بے قرار داری؟
چہ بگوئمت ز جانے کہ نفس نفس شمارد　　دمِ مستعار داری؟ غمِ روزگار داری!
چہ خبر ترا ز اشکے کہ فرو چکد ز چشمے　　تو برگِ گل ز شبنم دُرِ شاہوار داری

حسنِ مطلق اگرچہ حسنِ مقید کا متلاشی اور اُس کو پا لینے کا آرزو مند ہے۔ تاہم وہ انضمام کا خواہش مند نہیں۔ خواہش اگر اس کو ہے تو اس بات کی کہ اپنی ذات کا عکس حضرت انسان میں دیکھ پائے۔ یہی خواہش مشاہدہ جمال انسان کو بھی مسلسل بے قرار اور مضطرب رکھتی ہے۔ خواجہ حافظ فرماتے ہیں۔

نظرے کرد کہ بیند بہ جہاں صورتِ خویش　　خیمہ در آب و گل مزرعہ آدم زد

دُوسری جگہ رویتِ جمالِ حقیقی کی شہادت پیش کرتے ہیں۔

ما در پیالہ عکسِ رُخِ یار دیدہ ایم　　اے بے خبر ز لذتِ شربِ مدامِ ما

علامہ اقبال اسی حقیقت کی ترجمانی اس طرح کرتے ہیں۔

ذاتِ ما آئینۂ ذاتِ حق است　　ہستیِ مسلم ز آیاتِ حق است

دونوں جلوۂ حقیقت کے لئے صفائی قلب اور ہمتِ عالی کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ خواجہ حافظ اس ضمن میں فرماتے ہیں۔

گوہرِ پاک بباید کہ شود قابلِ فیض　　ورنہ ہر سنگ و گلے لؤلؤ و مرجان نہ شود
ذرّہ را تا نبود ہمّتِ عالی حافظؔ ،　　طالبِ چشمۂ خورشیدِ درخشاں نہ شود

یہی تصورات ہیں جو اقبال کے ہاں کسی نہ کسی صورت میں موجود ہیں۔ مثلاً

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے　　یزداں بہ کمند آور اے ہمّتِ مردانہ
شادم کہ عاشقاں را سوزِ دوام دادی　　درماں نیافریدی آزارِ جستجو را ،

اقبال عشق کا ارتقائی تصور پیش کرتے ہیں۔ جس میں مادیت اور روحانیت کا حسین امتزاج ملتا ہے وہ عشق کے ابتدائی مراحل میں عزم للقوت اور آخر میں عزم للخیر کے قائل نظر آتے ہیں۔ اسرارِ خودی میں فرماتے ہیں۔

ہر کہ در آفاق گردد بو تراب　　باز گرداند ز مغرب آفتاب

ؔ از نگاہِ عشق خارا شق شود عشقِ حق آخر سراپا حق شود
پنجۂ او پنجۂ حق می شود ماہ از انگشتِ او شق می شود

مذکورہ بالا سطور سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے کہ اقبال اور خواجہ حافظ کے نظریات میں یگانگت اور مماثلت پائی جاتی ہے۔ اس سے خواجہ حافظ کو عافیت جو سکون طلب اور سُست کوش کہنا ہرگز بجا نہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ خواجہ حافظ کے تصورِ عشق پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ

"حافظ کا عشق راحت، عمل، ترقی اور کمال کی کیفیتوں کا ترجمان اور نمائندہ ہے۔ حافظ کے عشق کی بہت سی کیفیتیں اقبال کے شوق سے مماثلت رکھتی ہیں۔ اقبال نے جو علامتیں اور اسالیب حافظ سے لئے ہیں وہ بھی اس بات کا ثبوت پیش کرتے ہیں کہ عشق کی بعض منزلوں کے متعلق ان دونوں حکیموں کا رویہ یکساں تھا۔ دونوں میں اگر کچھ فرق ہے تو یہ کہ اقبال کے یہاں عشق خود شعوری اور توانائی کا سرچشمہ ہے۔ اور حافظ کے یہاں اُمید لطافت اور سرور کا۔ عشق کے مقابلے میں عقل کے ناقص ہونے کے عقیدے میں بھی دونوں متفق ہیں۔ یوں معتدل لمحات میں حافظ کے یہاں "فکرِ معقول" کی بڑی اہمیت ملتی ہے۔ وہ عقل کی مدد سے زندگی کا تجربہ بھی کرتے ہیں۔ مگر عقل کی کامیاب رہنمائی کے متعلق اِن کو بھی شک ہے۔ البتہ دنیاوی زندگی میں وہ صحتِ عقل کی راہنمائی کے قائل معلوم ہوتے ہیں۔" ۱؎

ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کا یہ خیال کہ اقبال کے یہاں عشق خود شعوری اور توانائی کا سرچشمہ ہے اور حافظ کے یہاں اُمید لطافت اور سرور، محلِ نظر ہے۔ اصل یہ ہے کہ تنہا اقبال نہیں بلکہ دونوں اسبات پر متفق ہیں کہ عشق خود شعوری اور توانائی کا سرچشمہ ہے۔ جب صاحبِ عشق جستجوئے الٰہی کی آخری منزل تک پہنچ کر اپنے شعور کی گہرائیوں میں خدا کا ادراک کرتا ہے۔ اس وقت محدود خودی خودیٔ بسیط سے ربط میں آتی ہے۔ اور انسان ایک لامتناہی قوت سے کم لوٹتا ہے اس طرح توانائی کا ایک لامتناہی سرچشمہ انسان کے اندر پھوٹ نکلتا ہے۔

## نظریۂ ہجر و وصال

ؔ از وجود را بہ بدن فطرتِ ماست تپیدن نارسیدن فطرتِ ماست
جدائی خاک را بخشد نگا ہے، دہد سرمہ کو ہے بہ کا ہے،
جدائی عشق را آئینہ دار است جدائی عاشقاں را سازگار است،

اقبال کے نزدیک عشق کی انتہا وصل نہیں بلکہ سوزِ دوام ہے۔ خودی اور عشق ایک ہی شے ہیں جس کا مقصود دائم یا وصل نہیں بلکہ مسلسل فراق ہے یا کسی شے کو اپنے اندر جذب کر لینے کی آرزو کا نام ہے ؎

شادم کہ عاشقاں را سوزِ دوام دادی درماں نیافریدی آزارِ جستجو را،

---

۱؎ مقاماتِ اقبال ص ۷۵ مصنفہ ڈاکٹر سید عبداللہ مطبوعہ لاہور

عالمِ سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق     وصل میں مرگِ آرزو ہجر میں لذتِ طلب

خواجہ حافظ کے نزدیک بھی عشقِ حقیقی طالب و مطلوب کو انفرادیت عطا کرنے کے عمل کا نام ہے۔ تاہم حافظ اسکے مدعی ہیں کہ عشق ایک ربانی توانائی ہے جو عاشق میں قلبِ ماہیت پیدا کر کے اُسے سراپا حسن اور عشق بنا دیتی ہے۔

در کارِ گلاب و گل حکمِ ازلی این بود     کان شاہدِ بازاری وین پردہ نشین باشد

واضح رہے کہ خواجہ حافظؒ کی مخصوص اصطلاحات ہیں "فراق" اور "وصل" کا مفہوم ہرگز وہ نہیں جو اقبال کے یہاں ہے۔ البتہ دونوں دائمی وصل کے خواہشمند نہیں۔ خواجہ حافظ فرماتے ہیں۔

در بزمِ دور یک دو قدح درکش و برو     یعنی طمع مدار وصالِ دوام را

یہاں تک تو دونوں کا فکر ایک دوسرے سے ملتا جلتا ہے لیکن آگے چل کر راہیں کسیقدر متفاوت ہو جاتی ہیں اقبال لقائے خودی کا رازمسلسل کشمکش اور جدوجہد میں تلاش کرتے ہیں۔ لیکن حافظ جنتؔ میں پہنچ کر لذاتِ عشق اور مشاہدۂ جمال کی خوشگوار اور روحانی فضا میں کھو جانا چاہتے ہیں۔ اقبال بہشت سے لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن اسے اپنا مستقر نہیں بناتے۔ ان کا تصورِ عشق ارتقائی ہے وہ قطعِ منازل کے بعد حقیقت کو پا لینے کے متمنی ہیں۔

اسی وجہ سے جنت کی پُرسکون فضا، کو پسند نہیں کرتے بلکہ نصب العین کیطرف رواں دواں بڑھنا چاہتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

دلِ عاشقاں بمیرد بہ بہشتِ جاودانے     نہ نوائے دردمندے نہ غمے نہ غمگسارے

اس کے برعکس خواجہ حافظ جنت کی روحانی فضا کو ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ؎

نصیب ماست بہشت اے خداشناس برو     کہ مستحقِ کرامت گناہگارانند

فردا اگر نہ روضۂ رضواں بما دہند     غلماں ز غرفہ حور ز جنتؔ بدر کشیم

حافظ کیفیتِ عشق و مستی و سرورِ سرمدی کو کبھی "جمال" اور کبھی "شباب" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسیطرح فقدانِ عشق کو کبھی "ہجر" کبھی "غصہؔ" یا "پیری" سے تعبیر کرتے ہیں۔ گویا اِن کے نزدیک ہجر و فراق غصہؔ و پیری تمام ہم معنی اصطلاحات ہیں بعینہٖ "حسن"، "عشق"، "شباب"۔ و بقا ہم معنی اصطلاحات سمجھی گئی ہیں جن کا بے تکلف استعمال حافظؔ مندرجہ ذیل اشعار میں کرتے ہیں۔

دوش وقتِ سحر از غصہؔ نجاتم دادند     واندران ظلمتِ شب آبِ حیاتم دادند

روز و شب "غصہؔ" و خون مے خورم و چون نخورم     چون ز دیدارِ تو دورم بہ چہ باشد دلشاد

یاد رم نیست ز بدعہدی ایامِ ہنوز     قصۂ "غصہؔ" کہ در دولتِ یار آخر شد

کجاست ہمنفسے تا کہ شرحِ "غصہؔ" دہم     کہ دلِ چہ میکشد از روزگارِ ہجرانش

دی شب ندا ز غیب بگوشِ دلم رسید     حافظ تو غصہؔ کم خور و بنشیں دمے بنوش

# پیری بمعنی فراق

گرچہ "پیرم" تو مرا تنگ در آغوشم گیر — تا سحرگہ ز کنارِ تو جواں برخیزم
من "پیر" سال و ماہ نیم یار بیوفاست — بر من چو عمر می گذرد پیر ازاں شدم
خوبانِ پارسی گو بخشندگانِ عمر اند — ساقی بدہ بشارت پیرانِ پارسا را
در غریبی و فراق و غمِ دل پیر شدم — ساغرِ مے ز کفِ تازہ جوانے بمن آر

اقبال بھی "پیری" اور شباب کی اصطلاحات حافظ سے مستعار لیتے ہیں گویا حافظ کے میخانہ سے چھپ چھپ کر شراب پی رہے ہیں۔

؎ میانِ لالہ و گل آشیاں گیرد — ز مرغِ نغمہ خواں درسِ نغاں گیرد
اگر از ناتوانی گشتہ "پیر" — نصیبے از "شباب" ایں جہاں گیر

لیکن اقبال کے ہاں چونکہ عشق کا مفہوم لذت و سرور کے بجائے زیادہ تر حقائق سے برد آزما ہونے اور نصب العین کی طرف بڑھنے کے ہیں۔ اس لئے ان کے ہاں ان اصطلاحات کا مفہوم بھی بدل جاتا ہے۔ اقبال کے نزدیک "پیر" وہ ہے جو کشمکشِ حیات کے قابل نہ رہا ہو۔ شباب سے وہی ہمکنار ہو سکتا ہے جو سوزِ دوام اور کشاکشِ زندگی کی نعمتوں سے مالا مال ہو۔ اسی شخص کو بقا ملتی ہے۔ واضح رہے کہ اقبال کے ہاں بھی "شباب" اور بقا ہم معنی اصطلاحات ہیں۔

حافظ کے نزدیک حسنِ مطلق ایک موضوعی شے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حسنِ مطلق مقید کے لئے اور حسنِ مقید حسنِ مطلق کے لئے جاذب بن جاتے ہیں۔ حافظ اس حقیقت کی ترجمانی کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

؎ لطیفہ ایست نہانی کہ عشق ازو خیزد — کہ نامِ آں نہ لبِ لعل و خطِ زنگاری ست

اقبال کا یہ شعر خواجہ حافظؒ ہی کی آوازِ بازگشت ہے :۔

ہست معشوقِ نہاں اندر دلت — چشم اگر داری بیا بنمائمت

اقبال اور حافظ دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ خودی عشق ہی کا دوسرا نام ہے خودی اگرچہ مخلوق اور فانی ہے تاہم وہ وجود سے خالی نہیں۔ ایسے عشقِ حقیقی اور عملِ پیہم سے وجود عطا ہوتا ہے۔ اقبال اس عملِ پیہم کو عشق سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک سچا مسلمان وہی ہے جس کا دل عشقِ حقیقی سے منور ہو۔ فرماتے ہیں۔

طبعِ مسلم از محبت قاہر است — مسلم ار عاشق نباشد کافر است
تابعِ حق دیدنش نادیدنش — خوردنش نوشیدنش خوابیدنش

سچے مسلمان کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ اللہ کے رنگ میں رنگا ہوا ہوتا ہے۔ جب انسان کے دل پہ اللہ کا رنگ چڑھ جاتا ہے تو وہ اس کی ذات کے لئے آئینہ بن جاتا ہے۔ اقبال اس کو مقامِ خودی سے تعبیر کرتے ہیں

چنانچہ فرماتے ہیں۔

؎ قلب را از صبغۃ اللہ رنگ دہ　　عشق را ناموس و نام و ننگ دہ

ذاتِ ما آئینۂ ذاتِ حق است　　ہستیِ مسلم ز آیاتِ حق است

خواجہ حافظ مختلف پیرایہ میں انہی خیالات کا اظہار مندرجہ ذیل اشعار میں فرماتے ہیں۔

ساقی بنورِ بادۂ برافروز جامِ ما　　مطرب بگو کہ کارِ جہاں شد بکامِ ما

حافظ اور اقبال دونوں اس بات کے قائل ہیں کہ جب عشق منتہائے کمال کو پہنچ جاتا ہے تو عاشق کی خودی لازوال ہو جاتی ہے اور وہ حی و قائم کہلانے کا سزاوار بن جاتا ہے۔ علامہ فرماتے ہیں۔

پیشِ ایں نور ار بمانی اُستوار　　حیّ و قائم چوں خدا را خود شمار

خواجہ حافظ اگرچہ اس بات کے قائل ہیں کہ عشق کی بدولت عاشقِ حقیقی کو حیاتِ جاوداں نصیب ہوتی ہے۔ جیسا کہ اس شعر میں اس کا اظہار کرتے ہیں۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق　　ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

تاہم ان کے نزدیک خودی کا کمال کتنا ہی کیوں نہ ہو وہ "رویتِ محبوب" کے بعد اپنے آپ کو اُستوار نہیں رکھ سکتی۔ جلوۂ حقیقت کی تاب نہ لاتے ہوئے اس کا ختم ہو جانا ناگزیر ہے۔ اس کا اظہار وہ اپنے اس شعر میں کرتے ہیں۔

ایں جانِ عاریت کہ بحافظ سپرد دوست　　روزے رُخش ببینم و تسلیم وے کنم

اقبال اور حافظ دونوں کو تسلیم ہے کہ انفرادی خودی کا مسلسل ظہور مجردِ خودی سے ہو رہا ہے یہ ظہور عشق کی بدولت ہے۔ عشق کبھی سوز و ساز ہے اور کبھی پیہم عمل لیکن حافظ اسے بالعموم سوز و ساز ہی کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک تسخیرِ کائنات بھی عشق ہے اور تعیّنِ ذات بھی۔ خودیاں یا کائیاں عشق کی بدولت وجود میں آتی ہیں اور دوام حاصل کر جاتی ہیں اقبال فرماتے ہیں۔

سازد از خود پیکرِ اغیار را　　تا فزاید لذّتِ پیکار را

حافظ انہی خیالات کی ترجمانی اس طرح فرماتے ہیں۔

حسنِ بے پایانِ اُو چندانکہ عاشق میکشد　　زمرۂ دیگر بعشق از غیب سر بر میکند

فنائے ذات کا تصور دونوں کے ہاں موجود ہے۔ احساسِ خودی صوفیاء کے نزدیک شرکِ خفی ہے جس کی سرحدیں شرکِ جلی سے جا ملتی ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ حقیقی وجود فقط اللہ تعالیٰ ہی کا سمجھا جائے۔ اقبال فرماتے ہیں ؎

؎ خودی کا سرِّ نہاں لا الٰہ الا اللہ　　خودی ہے تیغِ فساں لا الٰہ الا اللہ

مقامِ ضرب ہائے پے بہ پے ——— ایں عمود را عداست نے آوازِ نے
ضرب او ہر بود را سازِ نمود ——— تا بروں آئی ز گردابِ وجود
ایں کہ می بینی نیرزد با دو جو ——— از جلالِ لا الٰہ آگاہ شو
ہر کہ اندر دستِ او شمشیرِ لاست ——— جملہ موجودات را فرمانرواست

(پس چہ باید کرد)

خواجہ حافظ کے نزدیک بھی فنائے ذات کے بغیر عرفانِ حقیقت محال ہے۔ تاوقتیکہ اقرار کرنے والا اپنی ہستی کو کلیت خدائے واحد میں فنا نہ کر دے۔ مقام دوئی میں خدائے واحد کا اقرار دراصل اپنے وجود کا اقرار ہے اقرار کرنے والا بھی وجود رکھتا ہے۔ اس لئے یہ شرک فی الوجود ہے۔ اس لئے خواجہ حافظ فرماتے ہیں۔

؎ میانِ عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست ——— تو خود حجابِ خودی حافظ از میاں برخیز

دونوں اسبات پر متفق ہیں کہ مظاہر عالم خودی مطلق کا ظہور ہیں۔ خودی مطلق نے اپنے آپ کو تقسیم کر کے لذتِ عمل کی خاطر اپنا غیر فرض کر لیا ہے۔ جس طرح شعلہ خود کو بے شمار شراروں میں تقسیم کر لیتا ہے۔ وجود ایک ہی ہے۔ خودی مطلق نمود کی خاطر کئی روپ دھار کر جلوہ فگن ہوتی ہے۔ کبھی صحرا کبھی گلزار اور کبھی پہاڑوں کی شکل میں ہوتی ہے جب اس طرح بھی اسے سکون حاصل نہیں ہوتا۔ تو دریاؤں اور سمندر کے روپ دھار کر سامنے آتی ہے۔ اقبال اس حقیقت کا اظہار مندرجہ ذیل الفاظ میں کرتے ہیں۔

؎ شعلہ خود در شرر تقسیم کرد ——— جز پرستی عقل را تعلیم کرد
خود شکن گردید و اجزا آفرید ——— اندکے آشفت و صحرا آفرید
باز از آشفتگی بیزار شد ——— وز بہم پیوستگی کہسار شد
وانمودن خویش را خوئے خودی ست ——— خفتہ در ہر ذرّہ نیروئے خودی است

اشعار ذیل میں خواجہ حافظ بھی اسی حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ حقیقت مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہے۔

؎ ندیم و مطرب و ساقی ہمہ اوست ——— خیالِ آب و گل در رہ بہانہ
در کارِ گلاب و گل حکمِ ازلی ایں بود ——— کاں شاہدِ بازاری ویں پردہ نشیں باشد

حاصل یہ ہے کہ واجب وجود ہی حق ہے خلق کا وجود ذاتِ باری تعالیٰ کے ظہور یا تجلی و تمثل کے بغیر ممکن نہیں اس لئے کہ یہ ممکنات کے درجے میں ہیں تاہم دونوں کا وجود ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہے۔ بقول اقبال۔

؎ نہ او را بے نمودِ ما کشودے ——— نہ ما را بے کشودِ او نمودے

## سیاسی اور سماجی پس منظر

ڈاکٹر سید عبد اللہ صاحب حافظ اور اقبال کے محاکمے کے سلسلہ میں یوں رقمطراز ہیں۔

"اقبال حافظ سے صدیوں بعد ظہور پذیر ہوئے۔ ان میں سے ہر ایک کا سماجی تمدنی اور سیاسی ماحول اتنا مختلف ہے کہ اُن کے افکار کے الگ الگ سماجی محرکات کو سمجھنا بے حد ضروری ہے۔ اقبال انیسویں صدی کی تحریک احیائے اسلام کے مفکر ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر اجتماعی ہی نہیں سراپا ملّی بھی ہے۔ اس صدی میں اسلام سے مغرب کی جو سیاسی اور فکری آویزش نظر آتی ہے علامہ اقبال کے افکار میں اس کے گہرے نقوش ملتے ہیں۔ حافظ کے زمانے میں یہ بین الاقوامی اور بین الملّی آویزش بالکل موجود نہیں تھی۔ ان کے زمانے کی آویزش زیادہ سے زیادہ قبائلی علاقائی اور مقامی نوعیت کی تھیں اسلام کی غالبیت کے اعتقاد کو ٹھیس نہیں لگی تھی اور کسی طرف سے یہ چیلنج نہیں ہوا تھا کہ اسلام بھی کبھی مغلوب ہو سکتا ہے۔ اس لئے ان کے ہاں اسلام سے آویزش کی کوئی صورت نہ تھی۔ فتنۂ تاتار کی آگ مشتعل ہو کر اپنی ہی راکھ میں ختم ہو گئی تھی۔ اس لئے حافظ کے یہاں یہ آویزش نہیں بلکہ انسان کی انسان کے ساتھ آویزش ہے۔ قدرت کی انسان سے آویزش ہے۔ یا پھر وہ رُوحانی کرب ہے جو اجتماعی زندگی سے ماورا قلب انسانی کو محسوس ہوتا رہتا ہے۔ شاید حافظ کی شاعری میں سیاسی تمدنی نوعیت کا کوئی پیغام نہیں۔ اجتماعی مقاصد کے لئے فرد کے جو فرائض ہیں تمدّنی اور قومی آرزوں کے سلسلے میں فرد کو جو محسوس کرنا چاہیئے ان کے متعلق بھی یہاں کچھ نہیں۔ مگر اس روحانی جستجو اور باطنی غم کیلئے جس کا بار فرد اور صرف فرد کے قلب کو اُٹھانا پڑتا ہے اس کا براہِ راست مداوا حافظ کے یہاں مؤثر صورت میں موجود ہے۔ اقبال ایک جہانِ نو کے معمار ہیں۔ حافظ کے تخیّل نے شاید اس مسئلے کو سوچنے کی زحمت نہیں کی وہ تو فرصتِ زندگی کو سمجھنے اور اس میں زندہ رہنے کے قابل بنانے کی حکمت بتاتے ہیں۔ کل کیا ہوگا؟ انہوں نے اس راز کی نقاب کشائی کی تکلیف نہیں اُٹھائی وہ تو آج کے شاعر تھے اور آج ہی کے امکانات عزیز کو پالینے کے خیال میں اُلجھے رہتے مگر کیا آج! وہ آج جو ہر صبح طلوع ہوتا ہے۔ اس روز بھی طلوع ہوگا جب انسان کوئی ایسی نئی دنیا تخلیق کرے گا جس میں فوق انسان ہستیاں مکین ہوں گی" [1]

## علمی پس منظر

ابتداء میں حافظ علومِ عقلیہ یعنی منطق وفلسفہ سے گہری دلچسپی رکھتے تھے، لیکن حوادثِ زمانہ نے ان کا رجحان یکسر بدل دیا۔ سکاکی کی مشہور کتاب "مفتاح" جو معانی اور بیان پر ہے ہمیشہ ان کے زیرِ مطالعہ رہتی۔ محمد گلندام جو خواجہ حافظ مولانا شمس الدین عبداللہ کے درس میں شریک ہوا کرتے تھے لکھتے ہیں کہ خواجہ حافظ تفسیر کشاف مصنفہ مولانا جاراللہ زمخشری (جو معتزلہ کے رنگ میں لکھی گئی ہے) پر بڑے ذوق وشوق سے حاشیہ لکھا کرتے تھے افسوس ہے کہ یہ حاشیہ امتدادِ زمانہ کیوجہ سے مفقود ہو چکا ہے۔ ایک شعر میں یوں فرماتے ہیں کہ "موسمِ بہار ہے۔ تختۂ گلزار رشکِ ریاضِ رضواں بنا ہوا ہے اُٹھو صحرا کا راستہ لو۔ اب کشاف پڑھنے کا وقت نہیں" اس کے علاوہ "مصباح"

---

[1] مقاماتِ اقبال صفحہ ۸۷ و ۸۸

پر بھی حافظ نے حاشیہ آرائی کی۔ لیکن حافظ بہت جلد صوفیا کی صف میں داخل ہو گئے۔ اور پھر تمام عمر تصوف کی اشاعت کرتے رہے ان کے برعکس اقبال ابتدا ہی میں صوفی تھے۔ فلسفی بعد میں بنے۔ سفر یورپ کے بعد ان پر فلسفہ کا رنگ پوری طرح سے چڑھنے لگا۔ اور وہ یورپ کی مادی ترقی سے بھی بے حد متاثر ہوئے۔ حسن اعرابی لکھتے ہیں کہ "اقبال نے یورپ جاکر ایسی ایسی دُنیا دیکھی جو اس کے لئے بالکل نئی تھی۔ یورپ والوں کی تہذیب اور تمدن میں انہیں بہت سی خوبیاں نظر آئیں۔ اور بے شمار بُرائیاں بھی۔ اُنھوں نے یورپ کی زندگی اور اپنے وطن کی زندگی کا مقابلہ کیا تو ان کا جی اور بھی کُڑھنے لگا۔ یورپ میں انہیں حرکت ہی حرکت نظر آئی اور اپنے مُلک اسلامی دنیا اور ایشیا میں جمود ہی جمود۔ وہاں ہر لحظہ دگرگوں تھا۔ اور یہاں زمانہ بدلنے کا نام نہ لیتا تھا۔" [1]

مذہبی حالات حافظ کے دور میں سیاسی حالات سے کہیں زیادہ نازک تھے۔ اسلام رہبانیت میں بدل چکا تھا۔ یا فقہا اور علمائے ظاہری کے ہاتھوں میں ایک کھلونا بنا ہوا تھا۔ علما کی ایک کثیر جماعت خلقِ خدا کو گمراہ کرنے میں سرگرمِ عمل تھی۔ حافظ عماد فقیہ کی چال بازیوں اور فریب کاریوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

صوفی بہ جلوہ آمد و آغازِ ناز کرد      بنیاد مکر با فلکِ حُقہ باز کرد
اے کبکِ خوش خرام کہ خوش مے روی بناز      غرّہ مشو کہ گربۂ عابد نماز کرد

حافظ اپنے عہد کے صوفیوں اور ملّاؤں کو اس لئے طعن کرتے ہیں کہ وہ بے راہ روی اختیار کر چکے ہیں وہ بار بار لوگوں کو ان کے مکر و فریب سے آگاہ کرتے ہیں۔

محتسب در قفائے رنداں است      غافل از صوفیانِ شاہد باز
حافظا مے خور و رندی کن و خوش باش ولے      دامِ تزویر مکن چوں دگراں قرآن را
گر مسلمانی ہمیں است کہ واعظ دارد      وائے گر از پسِ امروز بود فردائے
واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند      چوں بخلوت می روند آں کارِ دیگر می کنند

اقبال بھی اپنے عہد کے صوفیا اور ملّاؤں کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں کہ انھوں نے گوشہ گیری قناعت پسندی اور تقدیر پرستی کی غلط تاویل کر کے لوگوں کو گمراہ کر دیا ہے۔

دلِ ملّا گرفتارِ غمے نیست      نگاہِ ہست بر چشمش نمے نیست
ازاں بگریختم از مکتبِ او      کہ در ریگِ حجازش زمزمے نیست

سر منبر کلامش نیشدار است      کہ اُو را صد کتاب اندر کنار است
حضورِ تو من از خجلت نگفتم      ز خود پنہاں و بر ما آشکار است

---

[1] ڈاکٹر اقبال مصنفہ حسن اعرابی ص ۳۰ پنجاب بکڈپو لاہور

نہ با مُلّا نہ با صوفی نشینم ‏ تو میدانی کہ من آنم نہ اینم
نویس اللہ بہ لوحِ دلِ من، ‏ کہ ہم خود را ہم اُو را فاش بینم

## حافظ اور اقبال کا دبستانِ شعری

حافظ اور اقبال کے اندازِ بیان، اسلوب، لہجے اور آہنگ میں قریبی مماثلت ہے۔ شاعری میں حافظ کا تعلق دبستانِ عراقی سے ہے۔ حافظ کے اشعار نہایت فصیح اور بلیغ ہیں۔ کلام میں معنوی خوبیوں کیساتھ صنائع و بدائع تشبیہ و استعارہ ایہام و محاکات و صوتی تاثرات کا التزام بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ۔

"اقبال فارسی شاعری کے متعارف شعری دبستانوں میں سے کسی ایک دبستان کے پابند معلوم نہیں ہوتے بلکہ وہ اس معاملے میں انتخاب کے قائل نظر آتے ہیں۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ خراسانی یا ترکستانی دبستانِ شعر سے بہت دُور ہونے کے باوجود بعض بعض موقعوں پر وہ اس دبستان کے بعض پیرایہ ہائے بیان کی پیروی بھی کرتے ہیں۔ البتہ عراقی دبستان کا رنگ ایک اسالیب میں نسبتاً زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ زبان و بیان کے معاملے میں وہ حافظ اور عہدِ مغلیہ کے فارسی شاعروں سے اتنے زیادہ فیضیاب اور متاثر ہوئے ہیں کہ ہم بنیادی طور پر انہیں اس عراقی ہندی روایات کا شاعر کہنے اور سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جو حافظ سے شروع ہو کر بابا فغانی اور ان کے متبعین تازہ گویانِ ہند کے ذریعہ بیدل اور غالب تک پہنچی ہے"۔ [1]

سید محمد اکرم بہ حوالہ ڈاکٹر حسین خطیبی لکھتے ہیں کہ "ان شعراء میں مرحوم اقبال نے جیسے اپنے زمان و مکان کے تقاضوں کے مطابق چاہیے تھا کہ اسی انداز میں فارسی شاعری کو جاری کھتا۔ کثرتِ مطالعہ اور اُس مہارت کی وجہ سے جو اسے اپنے پُرانے ایرانی شعراء کے اشعار میں حاصل تھی۔ کافی حد تک سبکِ ہندی سے انحراف کیا اور اپنے اکثر اشعار قدیم اسلوبوں کی تقلید میں کہے۔ اس نے نہ صرف پیچیدہ مضامین سُست الفاظ اور مبہم تراکیب سے اجتناب کیا۔ بلکہ چند مواقع چھوڑتے ہوئے لفظی اعتبار سے بھی اپنے سبک کو قدیم اسالیب کی بنیاد پر استوار کیا"۔ [2]

کلامِ اقبال کے بغور مطالعہ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اقبال کا تعلق واضح طور پر "دبستانِ ہندی ایرانی" کے ساتھ ہے۔ سبک ہندی جو مبالغہ خیال بندی اور خیال بافی کے اجزائے ترکیبی سے مرکب ہے۔ اقبال کو متاثر نہ کر سکا۔ چنانچہ اقبال نے شاعری کی قدیم روایات کی طرف توجہ کی۔ اور قدیم اسلوب اور انداز کی پیروی اختیار کی یہی وجہ ہے کہ اقبال کا کلام نہایت ہی پرمعنی اور ظاہری محاسن سے آراستہ ہے تشبیہ و استعارہ محاکات لفظ و صوت کی ہم آہنگی نیز تراکیب کی ندرت و الفاظ کی شوکت یہ جملہ خوبیاں ان کے کلام میں موجود ہیں۔

---

[1] "مقاماتِ اقبال" مصنفہ ڈاکٹر سید عبداللہ صفحہ ۹۴، ۹۵

[2] اقبال اکتوبر ۱۹۶۵ء بہ حوالہ مجلہ دانش کدہ ادبیات ج ۱ تہران ۱۳۳۲ ص ۵۹، ۶۰

محمد رفیق خاور کلامِ اقبال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ " اقبال کے اشعار کی خوبصورتی ہمیں یونانی مجسموں کی یاد دلاتی ہے جس طرح ان کی تراش ان صناعوں کے کمالِ فن کی شاہد ہے اس طرح اقبال کی نظمیں حسنِ ترکیب کی نادر مثالیں پیش کرتی ہیں۔ ہمیں ان کے مطالعے سے گوئٹے۔ حافظ اور ہوریس کی یاد آتی ہے جس کے اشعار نہایت خوش اسلوبی سے ترشی ہوئی مورتوں سے کم نظر فریب نہیں۔ اقبال کے ہاں قواعدِ زبان محاورہ اور فن کی رُو سے کتنی ہی لغزشیں کیوں نہ ہوں۔ برائی کس طرح بادِ نسیم کے لطیف جھونکوں کے ساتھ گرد و غبار کی آمیزش کبھی نہیں کرتے ان کے قلم سے جو شعر نکلتا ہے۔ حسن کے سانچے میں ڈھل کر نکلتا ہے۔

اقبال کے کلام میں کچھ ایسا جادو بھرا ہے کہ ہماری طبیعت اس کی دل آویزیوں سے کبھی اُکتا نہیں سکتی۔ اُن کی شاعری ہمارے تخیل کو اپنے حسن و کیف سے مسحور کر دیتی ہے۔ اُن کے کلام میں خیالات ہی کی کثرت نہیں بلکہ اس میں بہترین الفاظ اور خیالات کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ اس کا ترنم ہمیں چنگ و رباب کے ترانوں سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ اس میں زبان اور خیال اس طرح شیر و شکر ہو گئے ہیں کہ ہم ایک کا دوسرے سے امتیاز نہیں کر سکتے۔ وہ دونوں حسن قبول کا انعام حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے ہیں اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ حسنِ ظاہر ہے یا حسنِ باطن جس نے ہماری نظر اور دل کو ایک ہی وقت میں اپنے طلسمی سحر سے مسحور کر لیا ہے۔

اقبال کے میٹھے بول اُن کی موجِ نفس کی شیریں اٹھکیلیاں ہیں۔ اُن کا دہنی ذوق ان کو توجہ الفاظ اور خیالات کے نئے نئے رشتوں کی طرف منعطف کرتا ہے۔ جن سے جدت کی سحرکاری ذوقِ سلیم کے مقتضیات کے ساتھ ہمکنار ہوتی ہے۔ لیکن یہ تمام گرمیٔ اندیشہ۔ یہ مرکزی حرارت جو اُنکے کلام کے مختلف حصوں میں یکساں طور پر جاری ہے اُن کے حسنِ بیان میں ایک برقی قوت کے طور پر کام کرتے ہوئے ایسے محاطات، توانائی، تمکنت جمال اور جلال کے متنوع جوہر عطا کرتی ہے۔ ہم اقبال کی شاعری میں نہ صرف خیالات کی بلندی تنگیٔ نظر کی مذمت گہائے معانی کی فراوانی طبیعت کی کشادگی اور تخیل کے دامِ سمیں کی آفاق گیری مشاہدہ کرتے ہیں۔ بلکہ ایک ایسی شاعری کے جلوہ ہائے سینائی کا نظارہ کرتے ہیں۔ جو دل کی گہرائیوں میں ڈوب کر ہمارے جذبات کے ایک ایک تار کو مرتعش کر دیتی ہے۔ اور اپنی ندرت صفائی اور روانی سے رُوح کو وجد میں لے آتی ہے۔

اقبال کی شاعری نے ایک ایسا معیار قائم کر دیا ہے جس سے ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ شاعری کا فلسفہ و حکمت کے ساتھ کیا تعلق ہے [1]

ملا جامی کلامِ حافظ کے متعلق لکھتے ہیں " اشعارِ او لطیف و مطبوع است و بعضے قریب بہ سرحدِ اعجاز رسیدہ و غزلیاتِ وے نسبت بہ غزلیاتِ دیگراں در سلاست و روانی حکم قصائدِ ظہیر دارد۔ نسبت بہ قصائدِ دیگراں سلیقہ شعرِ وے نزدیک است بسلیقہ طرازی قہستانی، و چوں بیشتر اشعارِ وے اثرِ تکلیف ظاہر نیست وے را لسان الغیب لقب کردہ اند" [2]

---

۱ـ اقبال اور اس کا پیغام مصنفہ محمد رفیق خاور ص ۹۶ مکتبہ اردو لاہور

۲ـ بہارستان جامی

حافظ کے کلام کی جاذبیت ہمہ گیری اور سنجیدگی یقیناً اُس کے خلوص فن، ندرتِ خیال اور والہانہ اندازِ بیان کی مرہونِ منت ہے۔ ابتدا میں اقبال کلامِ حافظ سے بے حد متاثر رہے۔ چنانچہ ان کی اس دور کی شاعری پر خواجہ حافظ کے کلام کا گہرا اثر پڑا۔ تاثر پذیری کا یہ رنگ اس زمانہ میں اور بھی گہرا ہو گیا جب اقبال نے جرمنی جا کر گوئٹے کے کلام کا مطالعہ کیا جس پر حافظ کے کلام کے نقوش اور تاثرات ثبت تھے۔

غرض بلاغتِ اظہار اور اندازِ بیان کی اِن مشترک خوبیوں کے علاوہ اقبال اور حافظ کی زبان اتنی متماثل اور متجانس ہے کہ دونوں ہم عصر معلوم ہوتے ہیں۔ غرض نہ تو زبان اور آہنگ و لہجہ متبائن اور متغائر ہیں اور نہ فکر و نظر کے زاویے۔ خواجہ حافظ کے کلام میں جن متصوفانہ اصطلاحات کی بھرمار ہے۔ اقبال کے ہاں وہ بہت کم پائی جاتی ہیں بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ "فارسی کے شعری اسلوب کی تاریخ میں اقبال کا امتیاز خاص یہ ہے کہ انہوں نے فارسی شاعری کی از سرِ نو تطہیر کی۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ جس طرح ان سے کئی صدیاں پہلے صوفی اور عارف شاعروں نے فارسی شاعری کے عریاں طور پر رندانہ اور لاابالیانہ رجحان اور اس کے مخربِ اخلاق اثرات کو روکنے کے لیے خمریہ اور عاشقانہ الفاظ کے معنی بدل دیئے تھے۔ اور الفاظ کی مجازی دلالتوں کو حقیقت کے سانچوں میں ڈھال دیا تھا۔ اسی طرح جدید دور میں اقبال نے ادبی زبان کے ہر دلعزیز اندازِ خمریہ مثلاً اس کا ترجمہ بدل ڈالا اور عشق کے تصور میں وسعت پیدا کر کے نئے معنے پیدا کیے۔ پاک نظری اور معنوی پاکیزگی کو پھر سے اہمیت دی۔ چنانچہ ان کی شاعری میں شوق اور عشق جیسے الفاظ مجاز اور ہوس کی منزل سے بلند تر سطح کے معانی و تصورات کے ترجمان ہیں۔ ان کے یہاں لفظ عشق طلب اور سعی کی جملہ مادی اخلاقی اور روحانی صورتوں پر حاوی ہے۔ ادب اور شاعری کی یہ تطہیر فارسی زبان اور ادب کی تہذیبی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔"[۱]

اقبال نے بے شمار غزلیں حافظ کی زمین میں لکھی ہیں ان میں اسلوب اور اندازِ بیان کی چاشنی حافظ سے بہت حد تک ملتی جلتی ہے۔ معنوی کیفیت میں بھی خاص فرق نظر نہیں آتا۔ جو غزلیں ہم طرح ہیں ان میں کہیں کہیں مصرعے تک لڑ گئے ہیں۔ مضامین اور تراکیب بھی کثرت سے متوارد ہیں۔ خیالات میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

---

[۱] مقاماتِ اقبال صفحہ ۹۲

عبدالعزیز کمال

# اقبال اور انتخابِ زبان

گزشتہ چند سو سال میں بعض اقوام کے ہاں نفسِ مضمون کی نسبت مضمون بندی پر زیادہ زور دیا گیا ہے اور انہوں نے تحریر و بیان کی تمام تر قوتیں زبان آوری کے جوہر دکھانے پہ صرف کر دی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اعلیٰ افکار و خیالات کے فقدان سے نگاہیں اعلیٰ مقاصد کے حصول سے ہٹ گئیں اور قومیں ذہنی اعتبار سے مفلوج اور ناکارہ ہو کر رہ گئیں۔

خود ہند و پاکستان کے جلیل القدر شعرا میں مرزا اسد اللہ خان غالب، جب ظہوری و طالب کے مقابلے میں اپنے آپ کو پیش کرتے ہیں تو غالباً اپنی زباندانی و زبان آوری ہی کے بل بوتے پر اپنے آپ کو اُن پر ترجیح دیتے ہیں۔ غالب بلندیٔ فکر میں بھی اپنے پیش روؤں پر فوقیت رکھتے تھے مگر شاعر کے ہاں بلندیٔ فکر اتنی اہم چیز نہیں جتنی کہ خوبیٔ زبان۔ اپنی بلند نگاہی کے باوجود مرزا کے لئے فارسی زبان دانی اس قدر وجہِ ناز و افتخار بن چکی تھی کہ وہ اس کے مقابلے میں اپنی ہندی سرائی اور اُردو قافیہ پیمائی کو ہیچ خیال کرتے تھے۔

موجودہ دور بجا طور پر دورِ اقبال کہلا سکتا ہے۔ ہمارے علم و ادب اور ذہن و فکر پر اقبال نے جو دُور رس اور ہمہ گیر اثرات مرتب کیے ہیں اُنہیں کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال شاعرِ اسلام ہیں۔ اُن کی سب سے بڑی خدمتِ اسلام یہ ہے کہ اُنھوں نے ہمارے ذہنی اور جذباتی رشتے ہمارے شاندار ماضی کے ساتھ زیادہ معقول اور مضبوط بنیادوں پر استوار کر دیئے ہیں۔ پیشِ نظر مضمون میں زبان کے بارے میں اقبال کا نقطۂ نظر واضح کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اقبال ایک نادر الکلام شاعر تھے اور زبان کی خوبیوں سے پوری طرح باخبر لیکن اولیت کا درجہ وہ زبان کو نہیں خیالات کو دیتے تھے۔ زبان کو سنوارنا اور ترقی دینا اُن کے ہاں ثانوی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ یقین رکھتے تھے کہ خیالات و افکار ہی اصل جوہر ہیں۔ زبان و بیان کو ہمیشہ اِن کے تابع رہنا چاہیئے۔ زبان کا کام مطلوبہ انداز میں ڈھل جانا ہے نہ کہ خیالات کو ڈھال لینا۔ زبان بمنزلہ لباس کے ہے اور لباس وہی قابلِ قدر ہوتا ہے جو جسم کی جملہ ضروریات کو بخوبی پورا کرے۔ صدف کی قدر و منزلت صرف گوہر کی وجہ سے ہوتی ہے۔ صدف کے آغوش میں نظر کو خیرہ کرنے والا گوہر تابدار نہیں تو صدف کی خودی پختہ نہیں خام ہے۔

مسئلہ زبان کے متعلق اقبال کا نقطۂ نظر خالص اسلامی ہے۔ اسلام کے اپنے اصول ہیں۔ ان اصولوں کا ماننے والا

خواہ وہ کسی خطۂ زمین کسی رنگ، کسی نسل سے تعلق رکھتا ہو امتِ مسلمہ میں شمار ہوتا ہے۔ اسلام میں نہ تو وطن ہی ملت کے لئے اساس ہو سکتا ہے اور نہ کوئی زبان ہی۔ ۱۹۳۸ء میں مولانا حسین احمد مدنی کے اس ارشاد کے جواب میں کہ "اقوام اوطان سے بنتی ہیں" علامہ اقبال نے ؏

چہ بے خبر ز مقامِ محمدؐ عربی ست

کی توضیح کے طور پر جو طویل بیان لاہور کے اخبار احسان میں شائع کرایا تھا اس سے علامہ کا وطنی اور لسانی نقطۂ نظر بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ اس بیان میں "وطن" کے بجائے جو جغرافیائی حدود سے عبارت ہوتا ہے "زبان" کو جو لسانی حدود سے وجود میں آتی ہے خیال کر لیا جائے تو اسلام کے نزدیک زبان کی حیثیت صاف طور پر سامنے آجاتی ہے۔ اس بحث میں مولانا رومی کا ایک مصرع درج ہوا ہے جو یاد رکھنے کے قابل ہے۔ ؏

ہم دلی از ہم زبانی بہتر است

"وطن کی محبت انسان کا ایک فطری جذبہ ہے" اور فطری جذبات کو کلی طور پر دبا دینے سے انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہی حال زبان کا ہے۔ اپنی زبان کی حفاظت و نگہداشت کرنا اور اس کو سنوارنے اور ترقی دینے کی کوشش کرنا ہر فرزندانِ زبان کا فرض ہوتا ہے۔ لیکن وطن کی طرح زبان بھی ملت کے لئے اساس نہیں بن سکتی۔ ملت کی اساس ہم دلی اور ہم خیالی کی وسیع تر بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ اقبال نے شروع شروع میں "خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے" کہا تو مبالغہ سے کام لیا۔ اصل مقام وہی ہے جس کا اظہار بعد میں "ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست" کی صورت میں ہوا۔

علامہ کی مادری زبان پنجابی تھی۔ اُن کے گھر میں یہی زبان سمجھی اور بولی جاتی تھی۔ اور اس میں اظہار و بیان سے وہ خاص لطف محسوس کرتے تھے مگر اردو چونکہ مسلمانوں کی علمی و ادبی زبان ہے اس کی ترقی کو وہ دل سے چاہتے تھے خود بھی اُردو کو وسعت اور ترقی دینے کی کوشش کرتے اور دوسروں کو بھی توجہ دلاتے تھے۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق کی خدمتِ اُردو سے بہت متاثر تھے۔ ایک خط میں ان کو لکھتے ہیں۔

"اُردو کی اشاعت اور ترقی کے لئے آپ کا دلی میں نقل مکان کرنا بہت ضروری ہے ـــ کاش میں اپنی زندگی کے باقی دن آپ کے ساتھ رہ کر اُردو کی خدمت کر سکتا"

سید نصیرالدین ہاشمی نے "دکن میں اُردو" کا ایک نسخہ ارسال کیا تو علامہ نے جواب میں لکھا "دکن میں اُردو نہایت مفید کتاب ہے۔ اردو زبان اور لٹریچر کی تاریخ کے لئے جس قدر مسالہ ممکن ہو جمع کرنا ضروری ہے۔ غالباً پنجاب میں بھی کچھ پرانا مسالہ موجود ہے۔ اگر اس کے جمع کرنے میں کسی کو کامیابی ہو گئی تو مورخ اردو کے لئے نئے سوالات پیدا ہوں گے" غالباً یہی اشارہ تھا جس نے حافظ محمود شیرانی سے "پنجاب میں اُردو" لکھوائی۔

ڈاکٹر عباس علی خان لمعہ کی شاعری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا "میرے خیال میں اردو کو اپنے جذبات کے اظہار کا ذریعہ اختیار کرنے میں آپ نے بڑی دانائی سے کام لیا ہے۔ اپنی زبان غیر زبان سے ہر حالت میں بہتر ہوتی ہے۔"

لیکن بعض صورتوں میں اگر اپنی زبان ذاتی افکار و احساسات کو احسن طور پر ادا کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ تو اقبال اپنی زبان سے چمٹا رہنے کو نیکی تصور نہیں کرتے بلکہ کوئی موزوں زبان اختیار کر لیتے ہیں۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"مجھ کو بارہا اس کا تجربہ ہوا ہے کہ اردو میں گفتگو کرتے ہوئے میں اپنے مافی الضمیر کو اچھی طرح ادا نہیں کر سکتا" یہی سبب تھا کہ ایسے موقعوں پر وہ انگریزی کو اظہارِ مطلب کا ذریعہ بنا لیتے تھے۔

پنجاب کے مردِ بزرگ اور اقبال کے ہم راز دوست شیخ عبدالقادر مرحوم نے بانگِ درا کے دیباچے میں اردو کی گیسو آرائی کی طرف شاعر کو توجہ دلائی تو بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شیخ صاحب کی عزت و احترام کی خاطر اقبال بہمہ وجوہ اردو کی گیسو آرائی کی طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ لیکن جیسا کہ معلوم ہے ایسا نہ ہوا۔ ان کے قلم سے بانگِ درا کی ترتیب و اشاعت سے پہلے اور بعد جتنی بھی عظیم اور قابلِ قدر کتابیں نکلیں وہ باستثنائے چند فارسی زبان میں نکلیں۔ اس کے وجوہ معلوم ہیں۔ خود شیخ صاحب اسی دیباچے میں تصریح کرتے ہیں "جوں جوں ان کا مطالعہ علم فلسفہ کے متعلق گہرا ہوتا گیا اور دقیق خیالات کے اظہار کو جی چاہا تو انہوں نے دیکھا کہ فارسی کے مقابلہ میں اردو کا سرمایہ بہت کم ہے اور فارسی میں کئی فقرے اور جملے سانچے میں ڈھلے ہوئے ایسے ملتے ہیں جن کے مطابق اردو میں فقرے ڈھلنے آسان نہیں۔ اس لئے وہ فارسی کی طرف مائل ہو گئے" اس کے علاوہ فارسی کی طرف مائل ہونے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ علامہ اپنا انقلابی پیغام زیادہ سے زیادہ انسانوں کو سنانا چاہتے تھے اور فارسی اس مقصد کے لئے بڑا اچھا ذریعہ تھی۔

فارسی اقبال کے لئے ایک غیر ملکی زبان تھی۔ اس زبان کی ادبیت اور دوسری خوبیوں سے باخبر ہونے کے باوجود اس کے محاورہ سے پوری واقفیت حاصل کرنے کے لئے انہوں نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ انہیں اس زبان کو اپنے عظیم اور ملی افکار کا ذریعۂ اظہار بنانا تھا۔ معمولی فارسی دانی سے کام نہ چل سکتا تھا۔ علامہ نے اکتساب میں وہ کمال پیدا کیا کہ ملک الشعرا بہار تک نے ان کے فارسی شعر کا لوہا مانا اور کہا "جو شخص اقبال کی فارسی شاعری سے انکار کرتا ہے وہ سعدی و حافظ سے انکار کرتا ہے"

حیرت ہوتی ہے کہ اس آخری زمانے میں جبکہ فارسی زبان کا علم ہندوستان سے قریب قریب اٹھ گیا ہے، ایک ایسا شخص منظرِ عام پر آتا ہے جس کا پلّہ ظہوری، غالب اور سعدی و حافظ سے شعر کے میدان میں کسی صورت کم نظر نہیں آتا۔ اقبال سے پہلے آخری عظیم فارسی شاعر غالب کو جو صحبت اور تربیت میسر آئی تھی اقبال اس سے بہت کچھ محروم رہے۔ ان کا زیادہ وقت انگریزی طرز کے مدرسوں اور کالجوں میں گزرا لیکن پھر بھی ان کے جوہر کی تابانی سے دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی ہیں۔ دیکھا جائے تو اس راہ میں کتنے ہی روڑے تھے کتنے سنگِ گراں تھے جن سے انہیں اپنا راستہ صاف کرنا پڑا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اسرارِ خودی کی اشاعت سے پہلے انہوں نے اپنے فارسی شعر کی زبان و محاورہ کی اصلاح کی خاطر کسی استادِ فن سے مستقل طور پر مشورہ کیا ہو۔

البتہ اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی کی اشاعت کے بعد زبان اور محاورے کی بعض لغزشوں کے بارے میں اُن کو آگاہ کیا گیا تو انہوں نے نہایت مشتاقانہ اور بے تابانہ اصلاحوں کو قبول کیا۔ اور جہاں معترض کو غلطی پر پایا، اسناد پیش کر کے اس کو مطمئن کیا۔ سید سلیمان ندوی مرحوم کے نام خطوط سے اس امر کی بخوبی تصریح ہوتی ہے۔ ایک خط میں انہیں لکھتے ہیں: "میری خامیوں سے مجھے ضرور آگاہ کیجئے۔ آپ کو زحمت تو ہو گی لیکن مجھے فائدہ ہو گا۔" اسی خط میں "بادۂ نارسا" کے لئے عدمِ سند کے عجز کا اظہار کرتے ہیں اور بانگِ درا کی اشاعت کے متعلق لکھتے ہیں: "انشاءاللہ بعد از نظرِ ثانی شائع کروں گا۔ اگرچہ مقصود اس شعر گوئی سے نہ شاعری ہے نہ زبان۔"

اکتوبر ۱۹۱۹ء کے خط میں لکھتے ہیں: "شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کے کبھی میرا مطمحِ نظر نہیں رہا۔ کہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لئے وقت نہیں۔ مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس اس بات کو مدِ نظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں اُن کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

پیامِ مشرق کی نظم "بوئے گل" کے شعر

زندانی کہ بند ز پایش کشادہ اند      آہے گذاشت است کہ بو نام دادہ اند

میں "گذاشت است" پر حافظ محمد اسلم جیراجپوری نے اعتراض کیا کہ ترکیب مکروہ معلوم ہوتی ہے۔ اقبال مولانا عبدالماجد اور سید سلیمان سے استصواب کرتے ہیں۔

فارسی محاورہ کے سیکھنے میں اس انہماک کے باوجود بعض موقعوں پر یہ محبوب و شیریں زبان بھی شاعر کو جواب دے جاتی ہے اور اکثر لطیف و دقیق خیالات ادا کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ سید سلیمان ندوی سے ایک خط میں شکایت کرتے ہیں: "بعض خیالات زمانہ حال کے فلسفیانہ نقطۂ نظر کا نتیجہ ہیں۔ ان کے ادا کرنے کے لئے الفاظ ہاتھ نہیں آتے۔ اس واسطے مجبوراً ترکیب اختراع کرنی پڑتی ہے۔ جو ضروری ہے کہ اہلِ زبان کو ناگوار ہو کہ دل و دماغ اس سے مانوس نہیں ہیں۔"

پروفیسر شجاع منعمی کے نام ایک خط میں اپنی فارسی پر اظہارِ خیال کرتے ہیں: "باقی رہے منظومات سو یہ ہندی فارسی ہے ما یک ایرانی کو کیا پسند آئے گی۔ میرے زیرِ نظر حقائقِ اخلاقی و ملّی ہیں۔ زبان میرے لئے ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ بلکہ فنِ شعر سے بھی میں بحیثیت فن کے نا واقف ہوں۔"

فارسی زبان کی طرح عربی زبان بھی اقبال کو بے حد مرغوب تھی۔ فارسی انہوں نے مدرسے یا کالج میں ایک باقاعدہ مضمون کے طور پر نہیں پڑھی لیکن عربی بی۔ اے تک اُن کے ساتھ رہی۔ مگر ظاہر ہے کہ آج کل کے مدرسے اور کالج ان زبانوں کا اصل ذوق پیدا نہیں کر سکتے۔ عربی فارسی کا صحیح ذوق مولوی میر حسن مرحوم نے اقبال کے اندر پیدا کیا۔ پھر کچھ ذاتی مطالعہ اور کچھ آرنلڈ، براؤن، نکلسن کی صحبت نے اس جوہر کو چمکانے میں مدد دی۔ عربی زبان کی سلاست، وسعت اور جامعیت سے اقبال پوری طرح باخبر تھے۔ اور اس کے "جارم" کے عاشق۔ پروفیسر شجاع منعمی کو لکھتے ہیں: "کوئی آدمی عربی زبان کے "جارم" کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میں نے طالب علمی کے

زبانے میں خاصی عربی سیکھی تھی مگر بعد میں اور مشاغل کی وجہ سے مطالعہ چھوٹ گیا۔ تاہم مجھے اس زبان کی عظمت کا صحیح اندازہ ہے۔"

اقبالؔ جرمن اور سنسکرت زبانوں سے بھی کم وبیش واقفیت رکھتے تھے۔ جرمن زبان انھوں نے ہرڈر، گوئٹے، شلر وغیرہ کے شاعرانہ کمالات سے لذت اندوز ہونے کے لئے نہیں بلکہ اورحنل طور پر نطشے، کانٹ اور دوسرے عظیم فلسفیوں کے افکار سے مستفید ہونے کی غرض سے سیکھی تھی۔ لیکن جہاں تک تصانیف کا تعلق ہے، اردو اور فارسی کے بعد اقبالؔ نے انگریزی کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ انگریزی ہی وہ زبان تھی جس میں فلسفیانہ اظہار و بیان کی تربیت انھیں ملی تھی۔ اس لئے اس زبان میں وہ مشکل سے مشکل اور لطیف سے لطیف خیال کو بھی بآسانی ادا کر سکتے تھے۔ چھ لیکچر جن کو خود اقبال نے "حرفِ پیچا پیچ" کا نام دیا ہے اسی زبان میں قلمبند اور شائع ہوئے۔

اردو فارسی اور انگریزی زبانوں پر پوری قدرت رکھنے کے باوجود اکثر مرتبہ شاعر ایسے اونچے خیالات اور خاص کیفیتوں سے دوچار ہوتا ہے جن کے اظہار و بیان کی قوت اور قدرت اپنے اندر موجود نہیں پاتا۔ ایسے موقعوں پر اسے مجبوراً "اشارہ و کنایہ" اور "رموز و ایما" کو ذریعۂ اظہار بنانا پڑتا ہے۔ ذیل کے اشعار سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔

هر معنیٔ پیچیده در حرف نمی گنجد — یک لحظه بدل در شو شاید که تو دریابی

نگاه می رسد از نغمهٔ دل افروزے — بمعنیٔ که بر و جامهٔ سخن تنگ است

ره مینه حرف زگفتن کمال گویائی است — حدیثِ خلوتیاں جز به رمز و ایما نیست

جاوید نامہ میں زندہ رود اور غالبؔ کے درمیان ایک دلچسپ اور خیال انگیز مکالمہ ملتا ہے۔ غالبؔ سے اس کے اس شعر کے معنی دریافت کئے جاتے ہیں۔ ؎

هر کجا هنگامهٔ عالم بود — رحمت اللعالمینی هم بود!

غالبؔ کی وضاحت مایوس کن ہے۔ ؏

ایں سخن را فاش تر گفتن خطاست

زندہ رود کو اصرار ہے کہ مطلب صاف صاف کہئے۔ غالبؔ کا جواب معنی خیز ہے۔ ؏

نکته را بر لب رسیدن مشکل است!

زندہ رود کا اطمینان نہیں ہوا اور غالبؔ کی قدرتِ کلام کی شکایت کی ہے۔ غالبؔ "اشارہ و رمز" سے کام لیتے ہیں۔ ؎

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست — رحمت اللعالمینی انتہا است!

زندہ رود کو پھر بھی شکایت ہے۔ ؎

من نہ دیدم چہرۂ معنی ہنوز
آتشے داری اگر مارا بسوز!

آخر میں غالب کا جواب کتنا فیصلہ کن ہے۔ ؎

اے چو من بینندہ اسرار شعر
ایں سخن افزوں نہ است از تارِ شعر

شاعراں بزم سخن آراستند
ایں کلیماں بے یدِ بیضا ستند!

آنچہ نو از من بخواہی کافری است
کافری کو ماورائے شاعری است!

اقبال کے نزدیک محض زبان اور الفاظ مافی الضمیر کے اظہار کے لیئے کافی نہیں۔ مردِ فقیر کی قوتِ کار اور زورِ اظہار الفاظ کے مرہونِ منت نہیں ہوتے۔ دل کی دنیا آباد کرنے کے لئے "مردانِ حُر" کی صحبت ہی اکسیر اعظم ہے ؎

صحبت از علم کتابی خوشتر است
صحبتِ مردانِ حُر آدم گر است

گرچہ اندر بزم کم گوید سخن
یک دم او گرمیٔ صد انجمن

نغمۂ مردے کہ دارد بوئے دوست
ملتے را می برد تا کوئے دوست!

اب ذرا بہشت کی تعریف سنیئے جہاں زبان و کلام کی ضرورت ہی نہ پڑے گی، اور مُدعا الفاظ کی منت پذیری کے بغیر ہی ظاہر ہو جایا کرے گا۔ رومی زندہ رود سے کہتے ہیں۔ ؎

پیش نہ گامے کہ آمد آں مقام
کاندر او بے حرف می روید کلام!

بہر حال اس بحث سے یہ دکھانا مقصود تھا کہ اقبال کی نظر میں اصل قابلِ قدر شئے انسان کے جذبات اور کیفیاتِ قلبی ہیں، ہاں اتنا ضرور ہے کہ وہ طبعِ موزوں اِن کے ادا کرنے کے لیے تر و تازہ الفاظ کی تلاش کرے۔"
آخر میں سردار عبد الرب نشتر مرحوم کے نام علامہ کا ایک خط درج کیا جاتا ہے۔ جو زیرِ نظر موضوع پر آخری فیصلے کا حکم رکھتا ہے۔ خط ملاحظہ ہو۔

"آپ کا جواب درست ہے۔ میں اس میں کوئی اضافہ نہیں کرنا چاہتا۔ سوائے اس کے کہ زبان کو میں ایک بُت تصوّر نہیں کرتا۔ جس کی پرستش کی جائے۔ بلکہ اظہارِ مطلب کا ایک انسانی ذریعہ خیال کرتا ہوں۔ زندہ زبان انسانی خیالات کے انقلاب کے ساتھ بدلتی رہتی ہے اور جب اس میں انقلاب کی صلاحیت نہیں رہتی تو مُردہ ہو جاتی ہے۔ ہاں تراکیب کے وضع کرنے میں مذاقِ سلیم کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیئے۔"

نصرت قریشی

# قصائدِ اقبال

اُردو شاعری میں میرؔ۔ غالبؔ۔ داغؔ اور اقبالؔ ایسے عہد ساز شاعر ہیں جن کی چھاپ اُن کے معاصرین کے کلام پر پوری طرح لگی ہوئی ہے۔ میرؔ کا دَور سوز و گداز کا دَور ہے۔ غالبؔ خیال کے اچھوتے پن کو رواج دیتا ہے۔ داغؔ زبان کو نکھارتا اور سنوارتا ہے اور اسے روزمرّہ سے ہمکنار کر دیتا ہے۔ اقبالؔ فکرِ جدید کو عام کرتا ہے۔ اگر اُردو شاعری کو ان چار ادوار میں تقسیم کیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ (۱) میرؔ کا دور (۲) غالبؔ کا دور (۳) داغؔ کا دور (۴) اقبالؔ کا دَور۔ ان عہد ساز شعراء نے اُردو شاعری کو آگے بڑھایا ہے اور اس کے جملہ مروّجہ اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ اُردو زبان کے رائج اصنافِ سخن غزل۔ مثنوی۔ قصیدہ اور مسدس ہیں۔ بلند پایہ اور قادر الکلام شعراء نے انھیں اصناف میں طبع آزمائی کی ہے پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ عصرِ حاضر کی عہد ساز شخصیت انھیں جملہ اصناف میں دادِ سخن طرازی نہ دیتی۔ اقبالؔ نے غزل میں وقت کے تقاضوں کو سمو کر تجدیدِ غزل گوئی کا کام سرانجام دیا۔ اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی تصنیف کر کے مثنوی کی آبرو بڑھائی اور دنیائے ادب کو بتا دیا کہ مثنوی زہرِ عشق اور گلزارِ نسیم ہی نہیں ہوتی اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی بھی ہو سکتی ہے۔ مسدس کی صنف میں شکوہ اور جوابِ شکوہ لکھ کر اس مقام سے مسدس کو آگے بڑھایا جہاں تک حالیؔ اپنی کوششوں سے اُسے لے آئے تھے۔ قصیدہ کی صنف پر اگر اقبالؔ طبع آزمائی نہ کرتے تو یہ بات تشنہ رہ جاتی کہ اقبالؔ کے دَور میں اس معروف صنفِ شعر کو بھی عصرِ حاضر سے ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ حسنِ اتفاق سے علامہ نے قصائد بھی نظم کئے ہیں جن کے مطالعہ سے یہ بات ہر صاحبِ بصیرت پر واضح ہو جاتی ہے کہ اس صنفِ سخن کو بھی اقبالؔ نے آگے بڑھایا ہے۔ پیش رَو شعراء نے قصائد ذاتی منفعت حاصل کرنے کے لئے لکھے لیکن اقبالؔ نے انھیں "قومی مفاد" حاصل کرنے کے لئے قلمبند کیا۔ وہ گورنر پنجاب کا قصیدہ ہو یا والیٔ بہاولپور کا یا کشن پرشاد شادؔ کے لئے بطرزِ شکریہ ہو سب قصائد مسلم قوم کے لئے منفعت حاصل کرنے کا سبب تھے کسی ذاتی نفع کے لئے نظم نہیں کئے گئے تھے۔

آیئے قصائدِ اقبال کا ادبی حیثیت سے جائزہ لیں اور دیکھیں کہ داخلی طور پر بھی انھوں نے قصائد میں کوئی قابلِ ذکر اضافہ کیا ہے یا نہیں۔

قصیدہ باعتبارِ ہیئت غزل سے مشابہ اور مضامین کے اعتبار سے غزل سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ قصیدے کے مضامین وعظ و پند، مدح و ہجو، اخلاق وغیرہ ہوتے ہیں۔ شکوہِ الفاظ اور فصاحت و بلاغت اس صنف کا

طغرائے امتیاز ہے۔ مضامین کی نزاکت اور رفعت اس سونے پر سہاگے کا کام دیتی ہے۔

اُردو کے وہ شاعر جنھوں نے فن قصیدہ نگاری میں کمال پیدا کیا ہے اور شہرت کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے ہیں۔ مرزا سودا، انشاؔ، غالبؔ، ذوقؔ، امیرؔ، شہیدی اور محسنؔ کاکوروی ہیں۔ سوداؔ نے قصیدے کو فصاحت و بلاغت کے جوہر دکھا کر فارسی زبان کے بہترین قصائد کے ہم پلّہ بنا دیا تھا۔ اسی لئے بعض اہل ادب نے انھیں "بادشاہِ قصائد" قرار دیا ہے۔ سوداؔ نے قصائد میں اپنے زمانے کی بولتی ہوئی تصویریں کھینچی ہیں۔ اپنے دور سے سماجی اور سیاسی حالات کا نقشہ کھینچا ہے۔ امراء کی خصلتیں، پیشہ وروں کی کیفیتیں اور عساکر کا حال قلمبند کیا ہے۔

ان کے بعد انشاؔ کے قصیدے ہیں لیکن شوکت الفاظ، صنائع بدائع اور نزاکت مضامین کے باوصف ان میں ناہمواری اور مختلف رنگی ہے۔

غالبؔ نے بھی اچھے قصیدے کہے ہیں۔ انھیں ایک بلند پایہ قصیدہ گو سمجھنا چاہیئے۔ مولانا حالیؔ نے یادگار غالبؔ میں ان کے قصائد کے ضمن میں تحریر کیا ہے۔

"قصائد میں مرزا نے کہیں خاقانی کا تتبع کیا ہے کہیں سلمانؔ و ظہیرؔ کا اور عرفیؔ و نظیری کا اور ہر ایک منزل کامیابی کے ساتھ طے کی ہے۔ مرزا کی تشبیب بہ نسبت مدح کے نہایت شاندار اور عالی رتبہ ہوتی ہے اور اسی سے قصیدے کی پستی و بلندی کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ مشرقی شاعری میں عموماً اور ایران کی شاعری میں خصوصاً کوئی مضمون مدح و ستائش سے زیادہ پھیکا، سیٹھا، ٹھنڈا اور بے لطف نہیں ہوتا۔ علی الخصوص متاخرین نے مبالغہ کی لے کو بڑھاتے بڑھاتے مدح کو ہجو کے درجہ تک پہونچا دیا ہے اور اس کلیہ سے مرزا کی مدح بھی مستثنیٰ نہیں البتہ عرفیؔ نے مدحیہ مبالغوں میں ایک قسم کا بانکپن پیدا کیا ہے جو اسی کے ساتھ مخصوص ہے۔ جس طرح قدما کے قصائد میں وہ آن نہیں پائی جاتی اسی طرح مرزا کے قصائد بھی اس سے معرّا ہیں لیکن مرزا کے اکثر قصیدوں کی تشبیبیں کچھ شک نہیں کہ عرفی کی تشبیبوں سے سبقت لے گئی ہیں"۔

غالبؔ کے فارسی قصائد کے متعلق تو مولانا کی یہ رائے آپ پڑھ چکے ہیں اس کے اُردو قصائد بھی خیال کی رفعت، نزاکت اور شوکت الفاظ کا خزانہ ہیں۔ اس حقیقت کے باوصف قصیدہ گوئی میں غالبؔ کو وہ مقام حاصل نہیں جو ذوقؔ کو بحیثیت قصائد نگار کے حاصل ہے۔ یہ حقیقت بھی ہے کہ اس صنف سخن میں سوداؔ کے بعد ذوق کا ہی نمبر آتا ہے۔ ذوقؔ کے قصائد میں روانی کے ساتھ زور بھی بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ اس خوبی کے باوجود اُن کے قصیدے تاثر سے یک قلم عاری ہیں۔ قصائد سے ذوق کی علمی قابلیت اور معلومات عامہ کا پتہ تو چلتا ہے لیکن اثر کے فقدان نے اس خوبی کو معدوم کر دیا ہے۔

ذوقؔ کے بعد شہیدی اور محسنؔ کاکوروی کے قصائد ہیں جو تمام تر نعتیہ ہیں۔ اردو ادب میں ذوقؔ کے بعد محسن کاکوروی کو ہی اچھا قصیدہ گو مانا جاتا ہے۔

اُردو قصیدہ گویوں کے اس مختصر سے تذکرہ کے بعد ہمیں اقبالؔ کے قصائد کی ادبی حیثیت کا جائزہ لینا ہے۔

اقبال کے قصیدے بھی تشبیب کے اعتبار سے غالب کے قصیدوں کے ہم پایہ ہیں۔ شوکت الفاظ، صنائع بدائع، رفیع الخیالی سبھی کچھ اُن کے قصائد میں اپنی بہار دکھلاتے ہیں۔ ان سب لوازمات کے ساتھ اُن کے قصائد میں اثر و کیف کے عناصر بھی موجود ہیں۔ اقبال کے قصائد کی یہ تشبیبیں ہمارے خیال کو مضبوط بنانے کے لئے بہت کافی ہیں۔ ملاحظہ کیجئے ؎

پہلے والیٔ بہاولپور کے قصیدے کی تشبیب ملاحظہ کیجئے جس کے متعلق سر عبدالقادر مدیر مخزن نے تحریر کیا ہے "ناظرین دیکھیں گے کہ قصیدے کی زمین کس قدر مشکل تھی۔ مگر اس میں کیسے کیسے شعر طبع خداداد کے زور سے شاعر نے نکالے ہیں اور پُرانے اور نئے رنگ کو کس خوبی سے ملایا ہے۔"

اس قصیدے کی تشبیب میں ڈاکٹر اقبال نے زمین اور اُس کی عظمت کی منظر کشی کی ہے ملاحظہ کیجئے ؎

بزم انجم میں ہے گو چھوٹا سا اک اختر زمیں — آج رفعت میں ثریا سے بھی ہے اُوپر زمیں
اوج میں بالا فلک سے مہر سے تنویر میں — کیا نصیبہ ہے رہی ہر معرکہ میں ور زمیں
انتہائے نور سے ہر ذرّہ اختر خیز ہے — مہر و ماہ و مشتری چینے ہیں اور مصدر زمیں
لیکے پیغام طرب جاتی ہے سوئے آسماں — اب نہ ٹھہرے گی کبھی اطلس کے خانوں پر زمیں
شوق بک جانے کا ہے فیروزۂ گردوں کو بھی — مول لیتی ہے لُٹانے کے لئے گوہر زمیں
بسکہ گلشن ریز ہے ہر قطرۂ ابر بہار — ہے شگفتہ صورت طبع سخن گستر زمیں
خاک پر کھینچیں جو نقشہ مرغ بسم اللہ کا — قوّت پرواز دیدے حرف قُم کہہ کر زمیں
صاف آتا ہے نظر صحن چمن میں عکس گل — بن گئی آپ اپنے آئینے کی روشن گر زمیں
اس قدر نظارہ پرور ہے کہ نرگس کے عوض — خاک سے کرتی ہے پیدا چشم اسکندر زمیں
امتحاں ہو اس کی وسعت کا جو مقصود چمن — خواب میں سبزے کے آئے آسماں بن کر زمیں
چاندنی کے پھول پر ہے ماہ کامل کا سماں — دن کو ہے اوڑھے ہوئے مہتاب کی چادر زمیں
آسماں کہتا ہے ظلمت کا جو ہو دامن میں داغ — دھوئے پانی چشمۂ خورشید سے لے کر زمیں

---

اس منظر کشی میں تخیل کی نزاکت اور رفعت اس طرح جلوہ گر ہے کہ ارباب بصیرت کی نگاہیں بھی خیرہ ہو جاتی ہیں اس قصیدے کے چند اشعار پر پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی نے کچھ اعتراضات بھی کئے تھے۔ جن کا جواب نواب جعفر علیخاں صاحب اثر لکھنوی نے نہایت مدلل و مفصل قلمبند فرمایا ہے یہ جامعہ دہلی نے اپنی اشاعت ماہ جون ۱۹۶۱ء میں شائع کیا ہے۔ اثر صاحب نے اپنے مضمون میں چکبست کا اعتراض اور پھر اس کا جواب ساتھ ساتھ دئے ہیں اس لئے صرف اثر صاحب کا مضمون ہی یہاں نقل کر دینا کافی ہے۔

؎ حضرت عابد رضا بیدار نے رسالہ جامعہ نئی دہلی بابت اپریل ۱۹۶۱ء میں ایک مضمون "اقبال پر چکبست کی ایک تنقید

" رسالۂ تصوف معارف بابت اپریل ۱۹۰۹ء کی نقل چھاپ کر ایک مفید ادبی خدمت کی ہے۔ بقول ان کے چکبست کا یہ مضمون جو اقبال کی ایک قلم زد نظم پر ہے اقبال کے غیر مرتب کلام کے جو نئے مجموعے چھپے ہیں ان میں مل جاتا ہے لیکن بانگِ درا میں شامل نہیں کیا گیا تھا۔ یہ مضمون بقول ان کے اس لیے " دل چسپی سے پڑھا جائے گا کہ دو مشاہیر ادب بلکہ اساطین (اساطین؟) اشہا ادب اس کے مصنف اور موضوع بنے ہوئے ہیں "۔

چکبست اور میں دونوں کیننگ کالج لکھنؤ کے طالب علم تھے۔ ۱۹۰۴ء میں جب وہ غالباً ایم اے میں تھے میں ایف اے (دوسرا سال) میں تھا۔ مجھے یہ کہنے میں مطلق باک نہیں کہ مضمون زیرِ نظر ان کی ابتدائی مشق انتقاد کا نمونہ معلوم ہوتا ہے مطالعہ میں گہرائی اور گیرائی نہیں۔

آیئے اب ان کی تنقید کا مفصل جائزہ لیں۔

جیسا حضرت چکبست نے فرمایا یہ نظم ایک قصیدہ ہے جو نواب بہاول پور (نواب بہاول خاں) کے جشنِ تاجپوشی کی تہنیت میں شائع ہوا ہے۔ اڈیٹر مخزن (شیخ سر عبد القادر مرحوم) نے اس قصیدے کو حضرت اقبال کی طبع خداداد کا اعلیٰ نمونہ مانا ہے پنجاب کے اور اخباروں نے بھی اس کی تعریف میں دریا بہا دیئے ہیں۔ پھر فرماتے ہیں کہ اس (قصیدے) میں ایسی ایسی لغزشیں موجود ہیں جن سے مصنف کا عجز ثابت ہوتا ہے۔ قبل اس کے کہ خاص خاص لغزشوں کا ذکر کیا جائے قصیدے کی شان بحیثیت مجموعی قابلِ اعتراض ہے۔ اس کی تمہید اس امر کا اشارہ کرتی ہے کہ حضرت اقبال کا ممدوح دنیا کا کوئی عظیم الشان فرمانروا ہے جس کی تخت نشینی سے کل روئے زمین کا ستارہ چمک گیا۔ مثلاً قصیدے کا مطلع ملاحظہ ہو ؎

بزمِ انجم میں ہے گو چھوٹا سا اک اخترزمیں      آج رفعت میں ثریا سے بھی ہے اوپر زمیں

یا ایک اور شعر ہے ؎

ہو ترا عہد مبارک صبحِ حکمت کی نمو      وہ چمک پائے کہ ہو محسودِ ہر اخترزمیں

غرضیکہ کل قصیدہ اسی رنگ میں ہے۔ یہ مانا کہ مبالغہ شاعری میں جائز ہے مگر ایک حد تک..... ایک معمولی والیٔ ریاست کے قصیدے کی تمہید اس رنگ پر اٹھانا بالکل ناموزوں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قصیدۂ مذکور مبالغے کی حد سے گزر کر ہجوِ ملیح کا پہلو لیے ہوئے ہے۔ یہ یاد رہے کہ تناسب شاعری کا خاص جوہر ہے۔ مگر یہ جوہر اس قصیدے میں موجود نہیں۔

اقبال کی طرف سے میری عرض ہے کہ عام شاعری میں تو مبالغہ فقط جائز ہے، قصیدے کی جان ہے۔ بغیر اس کے قصیدہ قصیدہ نہیں ہوتا۔ اقبال کے قصیدے میں تو ایک خاص نکتہ ہے جس کا حوالہ ان دو شعروں میں ہے ؎

چومتی ہے دیکھنا جوشِ عقیدت سے کمال      پایۂ تختِ یادگارِ عمِ پیغمبر زمیں

زینتِ مسند ہوا عباسیوں کا آفتاب      ہو گئی آزادِ احسانِ شہِ خاور زمیں

حضرت عباس بن عبد المطلب ہمارے رسولِ کریم کے عم یعنی چچا تھے۔ ان کی طرف اشارہ ہے۔ انھیں کے نام پر ان کی نسل میں سلطنتِ عباسیہ (عباسی) قائم ہوئی۔ نواب بہاول پور بھی عباسی تھے۔ اقبال نے ان دو شعروں میں عباسیوں کی پوری تاریخ اور داستانِ عروج و اقتدار کی طرف اشارہ کر دیا اور در پردہ نواب بہاولپور کو یہ نصیحت کی کہ ایسے اسلاف

کے حامی ہونے کی حیثیت سے تمہارا فرض ہے کہ داد عدل و معدلت گستری اور رعایا پروری کرو۔ تاکہ عہدِ پاکستان کی عظمت و شوکت کی یاد تمہارے محدود حلقۂ اقتدار میں ہی سہی تازہ ہو جائے۔ یہ نہ بھول جاؤ کہ رسولِ عربی کے عم حضرت عباس کی نسل سے ہو۔ اقبال نے یہ ثابت کرنے کو کہ میں یہ سب کچھ از راہِ تملق یا کسی لالچ سے نہیں کہہ رہا ہوں آخر میں یہ شعر اضافہ کر دیا ؎

پاک ہے گردِ غرض سے آئینہ اشعار کا ۔۔۔ جو فلک رفعت ہیں ہو لایا ہوں وہ چن کر زمیں

الغرض اس روشنی میں دیکھئے تو اقبال نے جو کچھ کہا ہے وہ در پردہ نواب بہاولپور کو ان کے بزرگوں کی عظمت و رفعت کی طرف توجہ دلائی اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی رغبت دلائی ہے۔ تعریف دراصل ان کی نہیں ان کے اجداد رفتگاں کی ہے۔ تاہم قصیدے کی شان قائم رکھی ہے اور ثنا و صفت نواب کی معلوم ہوتی ہے۔ یہ اقبال کا ایک عظیم کارنامہ ہے جس کی جس قدر تعریف کی جائے زیبا ہے۔

اقبال کے جلیل القدر شاعر ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ میں اس کی شاعری کے متعلق پہلے بھی کئی مضمون لکھ چکا ہوں مگر معلوم ہوتا ہے کہ کچھ نہیں لکھا۔

اب قصیدے کے منفرد اشعار پر چکبست کے اعتراضات لیجئے:۔

؎ بزمِ انجم میں ہے گو چھوٹا سا اک اختر زمیں ۔۔۔ آج رفعت میں ثریا سے بھی ہے اوپر زمیں

گو کے مقابلے میں مصرعِ ثانی میں کوئی دوسرا لفظ موجود نہیں حالانکہ مگر یا لیکن کا ہونا ضروری ہے۔ نیز مصرعِ ثانی میں اگر بجائے اوپر کے برتر ہوتا تو شعر زیادہ صحیح ہو جاتا ہے۔ ع

آج رفعت میں ثریا سے بھی ہے برتر زمیں

مجھے پہلے اعتراض سے اتفاق نہیں لفظ آج کی تخصیص کے بعد گو یا لیکن کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ ماننا پڑے گا کہ لفظ اوپر خارج از آہنگ ہے مگر مجوزہ ترمیم برتر اس سے بدتر ہے۔ رفعت کے ساتھ بلندی دکھائی جائے گی نہ کہ برتری یا بزرگی۔ برتر کے بجائے بالاتر کسی ترکیب سے کھپاتے تو ایک بات بھی تھی۔

چوتھا شعر ہے ؎

لے کے پیغامِ طرب جاتی ہے سوئے آسماں ۔۔۔ اب نہ ٹھہرے گی کبھی اطلس کے شانوں پر زمیں

یہ ایک عام اصول ہے کہ شاعر کو ایسے تلمیحات نظم کرنا چاہئیں جن سے اس کے ہم زباں واقف ہوں ...... یہ ایک یونان کی روایت ہے کہ زمین ایٹلس کے شانوں پر قائم ہے ......

میں عربی نہیں جانتا مگر اطلس یونانی ایٹلس کا معرب معلوم ہوتا ہے اور عربی میں اطلس فلکِ نہم کو کہتے ہیں جو تاروں سے خالی ہے۔ ممکن ہے کہ اقبال نے زمین کی وسعتِ پرواز دکھانے کو یہ لفظ استعمال کیا ہو کہ اطلس (فلکِ نہم) پر بھی دم نہ لے گی اور حاملانِ عرش کو پیغامِ نشاط سنائے گی۔ یا فلکِ نہم کے حریری شانوں پر بھی نہ ٹھہرے گی۔ (اطلس حریر یا ریشم کو بھی کہتے ہیں)

خیر اس پہلو کو چھوڑیے۔ زبان کبھی پرانی لکیر کی فقیر نہیں رہی۔ اس میں اضافے ہوئے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ اقبال کے زمانے میں انگریزی تعلیم عام تھی۔ اتنی عام کہ بچہ بچہ دنیا اور ملکوں کے جغرافی نقشوں کو اٹلس کہتا تھا۔ کرۂ ارض کا نقشہ ہی اس طرح بنا ہوتا تھا کہ ایک شخص دنیا کو ہاتھوں پر اٹھائے ہوئے ہے جو نام اتنا عام ہو اس کو اقبال نے معرب صورت میں استعمال کیا تو کوئی گناہ نہیں کیا۔ علم الاصنام یونان میں تو ان حضرت اٹلس نے کتنے ہی روپ بھرے ہیں اور ہم انگریزی کے ذریعے سے یونانی علم الاصنام سے ایک حد تک واقف ہو گئے ہیں۔

پانچواں شعر ہے ؎

شوق بک جانے کا ہر فیروزۂ گردوں کو بھی ۔۔۔ مول لیتی ہے لٹانے کے لئے گوہر زمیں

یہ ظاہر ہے کہ فیروزہ اور گوہر جواہرات کی دو قسمیں ہیں۔ پھر اس شعر کے معنی کیا ہوئے۔ زمین کو تو گوہر کی ضرورت ہے، اور جوہری فلک فیروزہ لے کر حاضر.... کیا ہوتا کہ زمین کو موتی لٹانے کے لئے درکار رہیں اور سمندر اپنا خزانہ لئے ہوئے موجود ہے۔

میں عرض کرتا ہوں کہ گوہر صرف موتی کو نہیں کہتے۔ اس کا اطلاق انواع جواہر پر ہوتا ہے۔ ہیرا۔ پنّا۔ یاقوت وغیرہ۔ کوئی کتاب لغت دیکھ لیجئے۔ میرے قول کی تصدیق ہو جائے گی۔

ساتواں شعر ہے ؎

برگِ گل کی رگ میں جنبش ہو رگِ جاں کی طرح ۔۔۔ ہے ابینِ اعجازِ عیسیٰ کی کہ افسوں گر زمیں

پہلے مصرع کی بندش نہایت شستہ و پاکیزہ ہے۔ لیکن مصرع ثانی میں ایسی غلطی موجود ہے جو کہ سچے شاعر کے کلام میں کبھی نہ ملے گی یعنی جس حالت میں زمین کو اعجاز عیسیٰ کا امین قرار دیا ہے تو دوسرا جملہ ثانیہ ایسا ہونا لازم ہے جو کہ اعجاز عیسیٰ کے امین ہونے سے بھی کوئی اعلیٰ صفت ظاہر کرے نہ کہ افسوں گری۔

میں عرض کرتا ہوں کہ اقبال نے برگ گل کے رگ جاں کی طرح جنبش میں ہونے کے دو امکانات فرض کئے۔ (۱) زمین کی عیسیٰ نفسی (۲) زمین کی افسوں گری۔ تیقن کے ساتھ نہیں کہا کہ یہ ہے وہ نہیں ایسی صورت میں خیال پہلے بلندی (اعجاز عیسوی) کی طرف جائے گا۔ بعد ازاں اگر یہ تصور ناقابل قبول ثابت ہوگا تو افسوں گری کی طرف متبادر ہوگا۔ ہونہہ! بی زمین اور مسیحائی کا دم بھریں۔ یہ تو مُردے کھینچتی ہیں۔ حیات کیا بخشیں گی۔ محض شعبدہ بازی ہے کہ برگ گل میں رگ جاں کی طرح جنبش ہے ؎

سترھواں شعر ؎

یعنی تو اب ہادِل فال کرے جس پر فدا ۔۔۔ بحر موتی، آسماں انجم، زر و گوہر زمیں

یہ مضمون بالکل فرسودہ ہے اور نئی روشنی کے شاعر کے لئے اس کا نظم کرنا نازیبا ہے۔ علاوہ بریں مصرع ثانی میں گوہر محض برائے وزن بیت ہے۔ جس حالت میں موتی کا ذکر مناسب طور پر بحر کے ساتھ ہو چکا ہے اب اس کی تکرار زمین کے ساتھ محض فضول ہی نہیں بلکہ نامناسب ہے کیونکہ تر بے خشک زمین کے قبضے میں ہوتا ہے مگر گوہر نہیں

ہر گوہر دریا کا حصہ ہے۔

میں عرض کرتا ہوں کہ فرسودگیٔ مضمون کا محض ادعا ہے۔ تصریح نہیں کی گئی کہ غور کا موقع ملتا۔ شعر میں گریز ہے یعنی ممدوح کا نام آیا ہے ایسی صورت میں اس کا ہونا ناگزیر ہے۔ گوہر بمعنی موتی اور صرف موتی کے متعلق پیشتر لکھ چکا ہوں۔ دوسرے پانچواں شعر، گوہر کا اطلاق ہر قسم کے جواہر پر ہوتا ہے موتی کی قید نہیں۔

چونتیسواں شعر ؎

محو کر دے عدل تیرا آسماں کی کجروی      کائنات دہر کے حق میں ہے مسطر زمیں

میرے ایک دوست نے مجھ سے اشارتاً کہا کہ پہلے مصرع سے ایک ہجو کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ مجھ کو بھی واقعی لاجواب ہونا پڑا۔ یعنی جس عدل کے آگے لوگ آسمان کی کجروی بھول جائیں وہ حقیقت میں بڑا ظلم ہوگا۔

میری گزارش ہے کہ اگر محو کے معنی بھول جانا سمجھئے تو دوست کا اعتراض اور اس کی ہمنوائی درست۔ برخلاف اس کے اگر محو کے معنی مٹا دینا حسب لغات مروجہ ہیں تو دوست کی نادانی و کم بینی قابل افسوس ہیں۔ اس کے معنی بھول فرض کرنا دوست کی بھول ہے۔

چالیسواں شعر ؎

عدل ہو مالی اگر اس کا بھی فردوس ہے      ورنہ ہے مٹی کا ڈھیلا خاک کا پیکر زمیں

مٹی کا ڈھیلا ایک سبک اور کم مقدار شے ہے۔ ایسی شے سے زمین کو تشبیہ دینا مصنف کی قوت خیال کی سستی ظاہر کرتا ہے۔ بجائے ڈھیلے کے اگر "تودہ" استعمال کیا جاتا تو زیادہ موزوں تھا۔ ؏

ورنہ ہے مٹی کا تودہ خاک کا پیکر زمیں

میں عرض کرتا ہوں کہ حقیر او رنا کارہ چیز کو ڈھیلا کہیں گے۔ مالی ڈھیلا اٹھا کے پھینک دے گا یا تودہ؟ زمین گول ہے ڈھیلا بھی گول ہوتا ہے۔ تودہ مخروطی ہوتا ہے۔ خاک کے پیکر کو مٹی کا تودہ کہہ دیا تو ایک قدم آگے نہیں بڑھایا۔ میں نے اقبال کے لفظ ڈھیلا کے حرف پر جتنا غور کیا اُس کا زیادہ مرید ہوتا گیا۔

بیالیسواں شعر ہے ؎

چاہیے پھرا دماغ عاقبت اندیش کا      بے دری میں ہے مثال گنبد اخضر زمیں

اخضر مصرع ثانی میں محض برائے وزن بیت ہے یعنی کوئی خاص معنی ظاہر نہیں کرتا۔ اگر مصرع یوں بدل دیا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ ؏

بے دری میں ہے مثال گنبد بے در زمیں

میں عرض کرتا ہوں کہ اخضر محض برائے وزن بیت نہیں۔ گنبد اخضر آسمان کو کہتے ہیں۔ البتہ بے دری کے بعد گنبد بے در کہنا کچھ عجیب سا ہے۔

آخر میں یہ ادعا ہے کہ ان لغزشوں کے علاوہ اس قصیدے میں ایک عیب ایسا موجود ہے کہ اکثر نوالوں

شعرا کے کلام میں پایا جاتا ہے یعنی مختلف اشعار کی ردیف محض برائے وزن بیت ہے ۔ اس اعتراض کی تائید میں تمثیلاً دو شعر لکھے جاتے ہیں ؎

جس کی بزم مسند آرائی کے نظارے کو آج دل کے آئینے سے لائی دیدۂ جوہر زمیں

وہ سراپا نور اک مطلع خطابیہ پڑھوں جس کے ہر مصرع کو سمجھے مطلع خاور زمیں

ان اشعار میں اگر بجائے "زمیں" کے فلک کر دیجئے تو معنوں میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا (پہلے شعر کے مصرع ثانی میں برائے "لائی" لا یا کر دیا جائے) ۔ سوائے اس کے کہ ان اشعار میں بھی دوسرے اشعار کی خاطر سے "زمیں" ردیف قائم رکھی جائے کوئی وجہ معقول نظر نہیں آتی ۔

میرا دعویٰ ہے کہ اگر ردیف نکال کر دیجئے تو یہ اشعار مہمل و بے معنی ہو جائیں ۔ پہلا شعر لیجئے ۔ فلک دیکھتا ہی رہتا ہے آفتاب چشم فلک ہے وہ آنکھیں کیوں مانگنا پھرے گا ۔ رات کو تو "آنکھیں ہی آنکھیں جدھر دیکھو نمایاں ہو گئیں" چاند نکلتا ہے ستارے چھٹکے ہوتے ہیں ۔

دوسرے شعر میں "زمین" سے مراد ردیف و قافیہ و وزن شعر ہے ۔ میر کہتا ہے :

جو زمیں نکلی اسے تا آسماں میں لے گیا

وہی اسیر جن کا ایک شعر حکیبت نے نقل کیا ہے کہتے ہیں ؎

گلشن کسی نے مول لیا ہو کسی نے گھر ہم نے زمین شعر جہاں میں خرید لی

میرا مقطع جس میں میر کے مصرع کی تضمین ہے ؎

کہنا پڑا مجھے بھی آخر میر کی طرح "ہر ایک سے ہو خوب یہ ایسی زمیں نہیں"

اقبال کے دوسرے شعر میں الفاظ مطلع اور مصرع اسی طرف اشارہ کرتے ہیں اور زمین سے مراد زمین شعر یعنی طرح ہے ۔

پھر یہ اعتراض ہے کہ بحیثیت مجموعی اس قصیدے میں کوئی سلسلہ نظر نہیں آتا ۔ نہ گریز ہی قابل تعریف ہے میری عرض ہے کہ سلسلہ ہے اور ایسا سلسلہ جو بہترین روایات قصیدہ کا نمائندہ ہے ، پہلے تیرہ اشعار تشبیب کے ہیں ۔ زمین نازاں ہے کیوں نازاں ہے ممدوح کے زیر قدم ہے ۔ تین شعر گریز کے ہیں اور گریز نہایت بے ساختہ اور تشبیب سے دست و گریباں ہے ۔ سترھویں شعر سے بائیسویں شعر تک مدح ۔

پھر دوسرا مطلع اور مدح انتیسویں شعر تک بعد ازاں ناصحانہ اور دعائیہ اشعار تعداد میں سولہ ۔ آخری دو شعر اپنے متعلق فخریہ ؎

پاک ہے گرد غرض سے آئینہ اشعار کا جو فلک رفعت میں ہو لایا ہوں وہ چن کر زمیں

تھی تو پتھر ہی مگر مدحت سرا کے واسطے ہو گئی ہے گل کی پتی سے بھی نازک تر زمیں

آخری شعر میں بھی زمین سے مراد زمین شعر ہے ۔

تمام اشعار میں قصیدے کی جزالت موجود ہے ۔ جن لوگوں نے اسے سراپا غلط نہیں سراپا حق بہ جانب تھے ۔
قصیدے میں جس طرح "جامعہ" میں درج ہے یا نقل کیا گیا ہے بعض بدیہی اغلاط کتابت ہیں مثلاً

شعر نمبر ۲ - درزمیں - ورزمیں چاہیئے ( واؤ بجائے دال یعنی غالب )

شعر نمبر ۶ - سحو بستر زمیں - سحو گستر زمیں چاہیئے ۔

شعر نمبر ۲۵ - اے کہ ترے دم سے خسرو تا ورزمیں - موجودہ صورت میں مصرع ناموزوں ہے ۔ کچھ الفاظ چھوٹ گئے ہیں ۔ غالباً یوں تھے : ( اے کہ تیرے دم قدم سے خسرو تا ورزمیں )

شعر نمبر ۲۶ - آسماں انجم نجیب - آسماں انجم نصیب چاہیئے ( اثر صاحب کا مضمون ختم )

دوسری تشبیب سرکشن پرشاد شاد مدار المہام ریاست حیدرآباد دکن کے قصیدے کی ہے ۔ اس میں صبح کی منظر کشی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ نہیں نگینے جڑ دئے ہیں ۔ ملاحظہ فرمایئے ؎

ہو رہی ہے زیبِ داماں افق سے آشکار — صبح یعنی دخترِ دوشیزۂ لیل و نہار
پا چکا فرصت ورودِ فصلِ انجم سے سپہر — کشتِ خاور میں ہوا ہے آفتاب آئینہ کار
آسماں نے آمدِ خورشید کی پا کر خبر — محملِ پروازِ شب باندھا سرِ دوشِ غبار
شعلۂ خورشید گویا حاصل اس کھیتی کا ہے — بوئے تھے دہقانِ گردوں نے جو تاروں کے شرار
ہے رواں نجمِ سحر جیسے عبادت خانے سے — سب سے پیچھے جائے کوئی عابدِ شب زندہ دار
کیا سماں ہے جس طرح آہستہ آہستہ کوئی — کھینچتا ہو میان کی ظلمت سے تیغِ آبدار
مطلعِ خورشید میں مضمر ہے یوں مضمونِ سحر — جیسے خلوت گاہِ مینا میں شرابِ خوشگوار
ہے تہِ دامانِ بادِ اختلاط انگیزِ صبح — شورشِ ناقوس و آوازِ اذاں سے ہم کنار
جاگے کوئل کی اذاں سے طائرانِ نغمہ سنج — ہے ترنم ریز قانونِ سحر کا تار تار

دیکھا آپ نے صبح کا کتنا پیارا نقشہ کھینچا گیا ہے اور کیسی اچھوتی اور پیاری تشبیہات سے اس منظر میں رنگینی پیدا کی گئی ہے ۔

قصائد کے دوسرے حصے گریز اور مدح بھی شعرائے متقدمین سے باعتبار تنوع اور غلو جداگانہ انداز لئے ہوئے ہیں ۔ مدح میں زمین آسمان کے قلابے نہیں ملائے گئے بلکہ ممدوح کی ایسی تعریف کی ہے جو بڑھ کر تضحیک نہیں بن گئی ۔ مثلاً سرکشن پرشاد کی مدح میں کہتے ہیں ؎

آستانے پر وزارت کے ہوا میرا گزر — بڑھ گیا جس سے مرا ملکِ سخن میں اعتبار
اس قدر حق نے بنایا اس کو عالی مرتبت — آسماں اس آستانے کی ہے اک موجِ غبار
کی وزیر شاہ نے وہ عزت افزائی مری — چرخ کے انجم مری رفعت پہ ہوتے تھے نثار
مسند آرائے وزارت راجۂ کیواں حشم — روشن اس کی رائے روشن سے نگاہِ روزگار

اسکی تقریروں سے رنگیں گلستانِ شاعری　　　اس کی تحریروں پہ نظم مملکت کا انحصار
بیلۂ معنی کا محمل اس کی نثرِ دل پذیر　　　نظم اس کی شاہدِ رازِ ازل کی پردہ دار
اس کے فیضِ پاک کی منت خواہ کانِ لعل خیز　　　بحرِ گوہر آفریں دستِ کرم سے شرمسار
سلسلہ اسکی مروّت کا یونہی لا انتہا　　　جس طرح ساحل سے عاری بحرِ ناپیدا کنار
دلربا اس کا تکلم، خلق اس کا عطرِ گل　　　غنچۂ گل کے لیے موجِ نفس بادِ بہار
ہو خطا کاری کا ڈر ایسے مدبّر کو کہاں　　　جس کی ہر تدبیر کی تقدیر ہو آئینہ دار
ہے یہاں شانِ امارت پردہ دارِ شانِ فقر　　　خرقۂ درویشی کا ہے زیرِ قبائے زرنگار
خاکساری جوہرِ آئینۂ قسمت بنی　　　دستِ وقفِ کارفرمائی و دل مصروفِ یار
نقش وہ اسکی عنایت [illegible] دل پر کیا　　　محو کر سکتا نہیں جسکو مرورِ روزگار

کشن پرشاد شاد کے لیے مندرجہ بالا مدح میں بتائیے کیا مبالغہ ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ وہ ایک خوشگو شاعر و ادیب اور منصف مزاج حاکم تھا۔ وہ صوفی منش انسان تھا اور نعت رسول لکھتا تھا۔ اس کا یہ مقطع ملاحظہ کیجیے ؎

مسلم جو نہیں ہوں تو زمیں کا ذمی نہیں شاد
ہندو ہوں مگر ہوں میں ثنا خوانِ محمدؐ

پھر اقبال نے ہر قصیدہ کا سبب بھی تحریر کیا ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ قصائد کسی ذاتی منفعت کے لئے نہیں لکھے گئے ہیں کسی قومی مفاد یا ھل جزاء الاحسان الا الاحسان کے پیش نظر۔ اسی قصیدے کا مقطع اس بات کو ظاہر کرتا ہے ؎

شکریہ احسان کا اقبال لازم تھا مجھے　　　مدح پیرائی امیروں کی نہیں میرا شعار

یا گورنر پنجاب ہز آنر سر میکورتھ ینگ کی نظم خیر مقدم میں جو قصیدہ ہی کی ذیل میں آتی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

عجیب معاملہ ہے کچھ ولایت دل کا
کہ اک نگاہ سے ہوتا ہے یہ نگر تسخیر

اور والیٔ بہاول پور کے قصیدے میں لکھتے ہیں ؎

پاک ہے گردِ غرض سے آئینۂ اشعار کا　　　جو فلک رفعت میں ہو لایا ہوں وہ جھک کر زمیں

ان اشعار سے صاف طور پر عیاں ہے کہ قصیدے ذاتی نفع کے لالچ میں قطعی نہیں کہے گئے ہیں۔ اقبال کے قصائد کا رنگ واضح کرنے کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر ینگ گورنر پنجاب کا قصیدہ من و عن درج کیا جائے تاکہ ہمارے دعوے کا واضح ثبوت مہیا ہو سکے۔ یہ نظم خیر مقدم یا قصیدہ اسلامیہ کالج میں گورنر صاحب کی تشریف آوری کی تقریب میں کہا گیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے ؎

زہے نشاط فراواں کہ اخترِ تقدیر　　　چمک رہا ہے ابھر کر مثالِ مہرِ منیر

کیا ہے آنکھ نے ممدوح انتخاب ایسا
صفت سے جس کی زبانِ قلم میں ہے تاثیر

خوشا نصیب وہ گوہر ہے آج زینتِ بزم
کہ جسکی شان سے ہے آبروئے تاج و سریر

وہ کون زیب دہ تختِ صوبۂ پنجاب
کہ جس کے ہاتھ نے کی قصرِ عدل کی تعمیر

عجیب معاملہ ہے کچھ ولایتِ دل کا
کہ اک نگاہ سے ہوتا ہے یہ نگر تسخیر

حضور زینتِ محفل ہیں ناز ہے ہم کو
جھلک رہی ہے نصیبوں میں سبزیِ کشمیر

مزے سے سوتا ہے بے خوف دیدۂ عالم
کہ تیرے عہد کا ہے خواب بھی نکو تعبیر

بدل کے امن کے باعث ہے اصطلاحِ زباں
بجائے نالۂ زنجیر، نغمۂ زنجیر

کوئی جو غور سے دیکھے تو امن کی ہے بہار
یہ درس گاہ، یہ محفل، یہ شان، یہ تعمیر

جو بزم اپنی ہے طاعت کے رنگ میں رنگیں
تو درس گاہ رموزِ وفا کی ہے تفسیر

اسی اصول کو ہم کیمیا سمجھتے ہیں
نہیں ہے غیر اطاعت جہان میں اکسیر

مدد جہان میں کرتے ہیں آپ ہم اپنی
غریب دل کے ہیں لیکن مزاج کے ہیں امیر

مگر حضور نے ہم پہ کیا ہے وہ احسان
کہ جس کے ذوق سے شیریں ہوا لبِ تقریر

وہ لوگ ہم ہیں کہ نیکی کو یاد رکھتے ہیں
اسی سبب سے زمانے میں اپنی ہے توقیر

دعا نکلتی ہے دل سے حضور شاد رہیں
رہیں جہان میں عظمت طراز تاج و سریر

عجیب طرح کا نظارہ ہے اپنی محفل میں
کہ جس کے حسن پہ نازاں ہے خامۂ تحریر

ہوئے ہیں رونقِ محفل جناب ولیم بل
ضیائے مہر کی صورت ہے جن کی ہر تدبیر

یہ علم و فضل کی آنکھوں کا نور ہیں واللہ
انہیں کی ذات سے حاصل ہے مہر کو تنویر

خدا انھیں بھی زمانے میں شاد کام رکھے
یہ وہ ہیں دہر میں جن کا نہیں عدیل و نظیر

قمر کے گرد ستارے ہیں ہم عناں کیا ہیں
ہے جس طرح کا شہنشہ اسی طرح کے وزیر

خوشا نصیب کہ بہ ہمرہِ حضور آئے
ہماری قوم کی یکبار بڑھ گئی توقیر

بڑھے جہان میں اقبال ان مشیروں کا
کہ ان کی ذات سراپا ہے عدل کی تصویر

کہیں بھی پورے قصیدے میں کوئی اشارہ ایسا ملتا ہے جس سے یہ شبہ بھی گزر سکے کہ شاعر کچھ اپنا مطلب رکھتا ہے۔ ہاں صوبے کے مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکنیں اور خواہشیں اس کے بین السطور میں ضرور ملتی ہیں۔ یہی اقبال کے قصائد کا رنگ ہے جو انھیں دوسرے قصیدہ نگاروں سے ممیز اور ممتاز کر دیتا ہے۔

نصرت قریشی

# اقبال اور نظامِ پاکستان

سرزمینِ پاکستان حکیم الامت ڈاکٹر سر محمد اقبال کے اُس خواب کی تعبیر ہے جس کا بیان اُنہوں نے خطبہ الٰہ آباد ۱۹۳۰ء میں بدیں الفاظ کیا تھا۔

"برِ صغیر میں ایک جُداگانہ اسلامی ریاست ہندوستان کے ساتھ ساتھ اسلام کے لیے بھی انتہائی فائدہ بخش ہے۔ ہندوستان کے لئے یوں کہ اندرونی توازن اقتدار کے باعث تحفظ اور امن پیدا ہوگا اور اسلام کے لئے یُوں کہ اُسے موقعہ ملے گا کہ عرب ملوکیت کی چھاپ سے نجات پا جائے اور اپنے قانون، تعلیم، ثقافت، کو تحریک دے کر انھیں اپنی اصل رُوح سے قریب لے آئے اور روحِ عصر سے ہم آہنگ کر دے۔"

یہ اقتباس زبانِ حال سے پکار رہا ہے کہ شاعر کا یہ خواب کسی شعری کیفیت کا آئینہ دار نہیں تھا بلکہ ایک مفکر اور فلسفی کے خواب کی طرح اس میں براہین و عزائم کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ اقبال کا یہ خواب محض خوش آئند نعرہ نہیں تھا۔ اُس کے نہاں خانہ دماغ میں اُس مملکت کا پورا نظام موجود تھا جس کا اُس نے خواب دیکھا تھا۔ اس مملکت میں شخصی حکومت ہو یا جمہوری وہاں سرمایہ دارانہ و جاگیردارانہ نظام قائم ہو یا دولت اور اس کے ذرائع کی تقسیم سے ہر شخص متمتع ہو سکے، اس کے ایشیائی ممالک سے روابط کیسے ہوں۔ اقوامِ عالم سے اِس کا رابطہ کِس قسم کا ہو۔ غرضیکہ مملکت کے مکمل نظم و ضبط کا ایک خاکہ ہے جو اقبال کے ذہن میں موجود تھا اور جس کو اس نے وقتاً فوقتاً اپنے خطبات، مکاتیب اور نظموں میں بیان کیا ہے۔ آئیے اس کے اِن سب ذرائع اظہار سے استفادہ کرتے ہوئے ایک خاکہ مرتب کریں کہ اقبال کس قسم کا پاکستان چاہتا تھا۔

مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال جمہوری نظام کے قائل تھے، انہیں شخصی یا خاندانی حکومت قائم کرنے کا خیال تک بھی نہیں آیا تھا۔ وہ کہتے ہیں ؎

سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ　　　جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

اِس شعر میں جمہوری نظام کی حمایت کے علاوہ قدیم طرزِ حکومت کی بیخ کنی کی تعلیم بھی مضمر ہے علاوہ ازیں اُنھوں نے جون ۱۹۳۷ء میں قائداعظم کے نام ایک مکتوب میں تحریر کیا ہے۔

"اسلام کے لئے اشتراکی جمہوریت کو کسی موزوں شکل میں قبول کرنا حقیقت میں اسلام سے انحراف نہیں بلکہ اسلام کی اصل پاکیزگی کی طرف لوٹنے کے مترادف ہوگا۔"

(قائد اعظم کے نام خط ۲۱ جون ۳۷ء)

ان الفاظ سے واضح ہے کہ اقبال پارلیمانی طرز جمہوریت کے حق میں تھے جو بالغ رائے دہی کے ذریعے وجود میں آتی ہے جیسا کہ روس میں ہے وہ ایسی جمہوریت نہیں چاہتے تھے جو بالواسطہ ہو انہوں نے اپنے مکتوب میں "اشتراکی جمہوریت" کے الفاظ تحریر کئے ہیں "امریکی جمہوریت" کے نہیں۔

یہ حقیقت تو بالکل واضح ہو چکی ہے کہ اقبال جمہوریت چاہتے تھے اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ اس جمہوریت کے ذریعے سرمایہ دارانہ نظام چاہتے تھے یا سوشلزم کا قیام اس ضمن میں اقبال کی آراء ڈھکی چھپی نہیں ہیں۔ وہ "اسلامی سوشلزم" کے خواہاں تھے۔ ایسا سوشلزم جس سے اسلامی اصول مجروح نہ ہوتے ہوں۔ اس خیال کی تائید میں لینن خدا کے حضور میں۔ بالشویک روس۔ کارل مارکس کی آواز۔ اشتراکیت۔ ابلیس کی مجلس شوریٰ اور نوائے مزدور وغیرہ معروف نظمیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ اقبال کس دلسوزی سے کہتے ہیں: ؎

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ جو

صرف یہی ایک مصرع ان کے خیال کا پوری طرح ترجمان ہے۔ اس سلسلہ میں ان کا یہ شعر خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہو

اسی طرح ان کے یہ اشعار بھی قابل غور ہیں ؎

اُٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو — کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے — کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی — اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم — بے سود نہیں روس کی یہ گرمیِٔ گفتار
اندیشہ ہوا شوخیِٔ افکار پہ مجبور — فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار
انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر — کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں — اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار

جو حرفِ "قل العفو" میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

کارخانے کا ہے مالک مردکِ ناکردہ کار — عیش کا پتلا ہے، محنت ہے اسے ناسازگار
حکمِ حق ہے لَیسَ لِلاِنسانِ اِلّا مَا سَعیٰ — کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و نظر کا انقلاب ۔۔۔ بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں

دہ خدایا، یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں ۔۔۔ تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں میری نہیں

اقبال نے نظم ہی میں نہیں اپنے کئی مکاتیب اور تقاریر میں بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ ۱۹۳۵ء ایکٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے قائدِ اعظم کے نام اپنے ایک مکتوب میں رقمطراز ہیں :-

" فرقہ وارانہ فیصلہ ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی ہستی کو تسلیم تو کرتا ہے لیکن کسی قوم کی سیاسی ہستی کا ایسا اعتراف جو اس کی معاشی پسماندگی کا کوئی حل نہ تجویز کرتا ہو اور نہ کر سکے۔ اس کے لئے بے سود ہے "

آگے چل کر اسی مکتوب میں لکھتے ہیں۔

" مزید برآں یہ دستور توائی معاشی تنگدستی کا جو شدید تر ہوتی جا رہی ہے کوئی علاج ہی نہیں " (مکتوب بنام قائدِ اعظم ۲۱ رجون ۱۹۳۷ء)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامِ حکومت کے ساتھ ساتھ معاشی اور اقتصادی ترقی ہمیشہ ہی اقبال کے پیش نظر رہی ہے۔ اس ترقی کے بغیر انہیں قیامِ مملکت کی کوئی بھی تجویز پسند نہ تھی قائدِ اعظم کے نام ایک اور مکتوب میں سوشلزم کے ضمن میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین اس کا فرق واضح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

" جواہر لال کی اشتراکیت خود ہندوؤں میں کشت وخون کا موجب ہوگی۔ سوشل ڈیماکریسی اور برہمنیت کے درمیان وجہ نزاع، برہمنیت اور بدھمت کے درمیان وجہ نزاع سے مختلف نہیں۔ میں اس سے متعلق تو کوئی پیش گوئی نہیں کر سکتا لیکن مجھے اس قدر صاف نظر آتا ہے کہ ہندو دھرم سوشل ڈیماکریسی اختیار کر لیتا ہے تو خود ہندو دھرم کا خاتمہ ہے اسلام کے لئے سوشل ڈیماکریسی کی کسی موزوں شکل میں ترویج جب اُسے شریعت کی تائید و موافقت حاصل ہو۔ حقیقت میں کوئی انقلاب نہیں بلکہ اسلام کی حقیقی پاکیزگی کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ مسائلِ حاضرہ کا حل مسلمانوں کے لئے ہندوؤں سے کہیں زیادہ آسان ہے "

(خط بنام قائدِ اعظم ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء)

اسی خیال کو پوری شرح وبسط کے ساتھ اس وقت بیان کیا تھا جب ترکوں نے خلافت منسوخ کرنے کے بعد آتاترک مصطفیٰ کمال پاشا کی قیادت میں اصلاحات نافذ کیں ان قانونی اصلاحات کے بارے میں اقبال نے لکھا ہے۔

" جو سوال آج ترکوں کو درپیش ہے اور جو کل دیگر مسلمان ملکوں کے سامنے آئے گا یہ ہے کہ آیا اسلامی قانون میں ارتقا کا امکان ہے یا نہیں۔ اس کے مناسب حل کے لئے بڑی شدید دماغی کاوش کی ضرورت ہوگی اور اس کا جواب یقیناً اثبات میں دیا جائے گا۔ بشرطیکہ اسلامی دُنیا اس کو حل کرنے میں حضرت عمرؓ کے نقش قدم پر چلے ۔

حضرت عمرؓ اسلام کی تاریخ میں سب سے پہلے ناقدانہ اور آزاد ذہن رکھنے والے مسلمان تھے جنھوں نے رسول اللہؐ کی آخری زندگی کے آخری لمحوں میں مندرجہ ذیل قابل قدر الفاظ کہنے کی اخلاقی جرأت دکھائی تھی۔

"خدا کی کتاب ہمارے لئے کافی ہے"

ہرچند کہ ہمارے علماء شدت سے تقلید پسند واقع ہوئے ہیں۔ نئی زندگی کے آنے کے ساتھ ساتھ اسلام کی ہمہ گیر روح یقیناً اپنا اثر دکھائے گی۔ میرے دل میں کوئی شک نہیں کہ اگر اسلام کے ضخیم قانونی لٹریچر کا بغور مطالعہ کیا جائے تو جدید نقادوں کو اپنا یہ سطحی فیصلہ بدلنا پڑے گا کہ اسلامی قانون جامد ہے اور اس میں ارتقاء کا امکان نہیں ہے کیا ہمارے فقہ کے مختلف دبستانوں کے مؤسسوں نے کبھی یہ دعویٰ بھی کیا کہ ان کے دلائل یا تعبیریں اور تاویلیں حرف آخر ہیں۔ کبھی نہیں مسلمان حریت پسندوں کی جدید نسل کا یہ کہنا کہ ان کو اپنے تجربے اور جدید زندگی کے بدلتے ہوئے تقاضوں کی روشنی میں بنیادی قانونی اصولوں کی تعبیر کرنی ہے۔ میری نظر میں بالکل جائز مطالبہ ہے۔ قرآن کی تعلیم ہے کہ زندگی ایک مسلسل ارتقائی تخلیق کا نام ہے۔ اس تعلیم سے ہم پہ لازم ہے کہ ہر نئی نسل اپنے مسائل کو اپنے طور پر حل کرنے کی مجاز ہو۔ وہ اگلی نسلوں کے کام سے رہنمائی حاصل کرے لیکن ان کو اپنے راستہ کی رکاوٹ نہ بننے دے"

(تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ)

مزید وضاحت اقبال کے اس مکتوب سے ہو جاتی ہے جو انہوں نے ۱۹۳۰ء میں سر فرانسس ینگ ہسبنڈ کے نام تحریر کیا تھا۔ اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"اگر بالشوزم میں خدا کی ہستی کا اقرار شامل کر دیا جائے تو بالشوزم اسلام کے بہت قریب آ جاتا ہے۔ اس لئے میں متعجب نہیں ہوں گا اگر کسی زمانے میں اسلام روس کو جذب کر لے یا روس اسلام میں جذب ہو جائے"

یہ تمام سفری مکتوبی اور تقریری اقتباسات اس خیال کی تائید کرتے ہیں کہ اقبال اسلامی سوشلزم کے مؤید تھے اور ان کی خواہش تھی کہ اس ملک میں جس کا خواب انھوں نے دیکھا ہے ایسا ہی نظام معیشت رواج پائے۔

تشکیل معاشرہ اور تبلیغ جمہوریت کے بعد ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اقبال اپنی نظریاتی مملکت کے تعلقات ایشیائی ممالک سے کس نوع کے قائم رکھنا چاہتے تھے۔ اس کے لئے بھی زیادہ چھان بین کی ضرورت نہیں۔ اس نکتہ پہ ان کے خیالات صدرجہ واشگاف ہیں۔ یہ تو سب کو معلوم ہی ہے کہ ہمارے برِّ اعظم ایشیاء میں مسلم ممالک شامل ہیں یا چین اور جاپان۔ ہمارے مسائل اس اعتبار سے دو حصوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں ایک ملی مسائل دوسرے براعظمی مسائل

یا مشرقی مسائل۔ اقبال کی نظر سے دونوں میں سے کوئی سا مسئلہ بھی اوجھل نہیں تھا۔ اُنہوں نے دونوں مسئلوں میں اپنا نقطۂ نظر بیان کیا ہے۔ جہاں تک ملّی مسائل کا تعلق ہے اُن کے متعلق وہ لکھتے ہیں ؂

ایک ہوں مُسلم حرم کی پاسبانی کیلئے
نیل کے ساحل سے لیکر تا بخاکِ کاشغر

اس شعر کو پڑھتے وقت حرم کے لفظ کو پیشِ نظر رکھنا بڑا ضروری ہے۔ سطحی مطالعہ سے آدمی غلطی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور مشرقی روابط کے سلسلہ میں اُن کا یہ شعر ان کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتا ہے ؂

طہران ہو گر عالمِ مشرق کا جنیوا
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

اقبال کے زمانے میں یو۔ این۔ او کی جگہ لیگ آف نیشنز نامی ادارہ موجود تھا جس کا دفتر جنیوا میں قائم تھا۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں کہ اگر مشرقی اقوام مل کر اپنی الگ ہی علیحدہ تنظیم قائم کر لیں اور اس کا دفتر طہران یعنی ایران میں ہو تو دنیا کی تقدیر پلٹ سکتی ہے۔ مسلمان ملّی مسائل ایک یونٹ بن کر حل کریں اور پھر مشرقی اقوام ایک وحدہ بن کر اپنے مسائل حل کریں تو دنیا میں یہ بحرانی کیفیت باقی نہ رہے۔ مغرب کی بالا دستی کا قلع قمع ہو جائے۔ مغرب نے استحصال زرکی جو مہم مشرق میں شروع کی ہوئی وہ یکسر ختم ہو جائے اور مشرق بھی خوش حالی کی راہ پہ گامزن ہو جائے۔ یہی خیال تھا جس نے چین کی ترقی اور آزادی پر اقبال سے یہ شعر کہلوایا ؂

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
ہمالہ کے چشمے اُبلنے لگے

دُنیا سے تعلقات کی استواری کیسی ہو اور کس نکتہ نگاہ سے پورے عالم کو مربوط کیا جائے اس سلسلہ میں اقبال کا یہ شعر ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ ؂

مکّہ نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم

جمعیتِ اقوام جس نے اب یو۔ این۔ او کی شکل اختیار کر لی ہے قوموں کے اتحاد پر قائم ہے بالفاظِ دیگر اس ادارہ میں ملکوں یا قوموں کو نمائندگی دی گئی ہے۔ اور اس نمائندگی کی بنیاد نظریۂ قومیت ہے اقدارِ انسانیت نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بڑی قومیں چھوٹی قوموں کو اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لئے استعمال کرتی رہتی ہیں۔ اگر اس ادارہ کی بنیاد قومیت کی جگہ انسانیت کے اصولوں پہ رکھی جاتے تو کالے گورے مشرق۔ مغرب۔ چھوٹے بڑے کا سوال یکسر ختم ہو جائے۔ ویٹو کی برتری نے جو الجھنیں پیدا کر رکھی ہیں اُن کا بھی خاتمہ ہو جائے۔ جیسا کہ مکّہ کی مرکزیت نے رنگ و نسل۔ ایرانی۔ تورانی۔ ہندی۔ مصری۔ مشرقی۔ مغربی کا فرق مٹا دیا ہے اور ایک اصول و تعلیم پہ تمام بنی نوع انسان کو مجتمع کر دیا ہے۔ اقبال استفہامیہ انداز میں سرزمین جنیوا سے یہ پوچھتے ہیں کہ مکّہ تجھ سے سوال کرتا ہے کہ قوموں کو متحد کیا جائے یا انسانوں کو؟

اگر دُنیا اس حکیمِ مشرق کے استفہام کو بنظرِ غائر دیکھے اور اس کی افادیت محسوس کرے تو آج دنیا میں رنگ و نسل کے تمام جھگڑے ختم ہو جائیں اور دنیا امن کی دولت سے ہمکنار ہو جائے۔

---

اختر جمال خانم

# اقبال کے نثری سرمائے کی اہمیّت

اقبال دنیا میں ایک معمار کی حیثیت سے تشریف لائے تھے۔ ان کا جذبۂ تعمیر صرف خواص ہی کے لیے نہیں بلکہ عوام کے لئے بھی تھا۔ اُنھوں نے ملّت کو بیدار کرنے کیلئے حسبِ موقع خطابت بھی کی ہے۔ اور تقریریں بھی، بیانات بھی دیئے ہیں اور سیاست میں حصّہ لے کر قوم کی رہنمائی بھی کی ہے۔ تبصرے بھی کئے ہیں اور تنقید کا حق بھی ادا کیا ہے۔ حکمت کی باتیں بھی کی ہیں اور ندائے حق بھی بلند کی ہے۔ کلیم نہ ہوتے ہوئے خدا سے کلام بھی کیا ہے اور اپنے الہاماتِ شعر کے قالب میں ڈھال کر پیش بھی کئے ہیں۔ یہ سب کچھ اس لئے کیا کہ وہ ملّت مسلمہ کے ہر فرد کو تعمیری رنگ میں رنگا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی لئے انہوں نے ہر ذریعہ استعمال کیا اور ہر راستے کو اپنے فن سے ہموار کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر وہ شاعر نہ ہوتے تو بھی ان کے خطبات، مضامین، تقریریں، بیانات اور خطوط کا ایک ایک حرف اس بات کی غمازی کرتا کہ وہ ملّتِ اسلامیہ کو کس بلند مقام پر لے جانا چاہتے ہیں

اقبال کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ لیکن نناوے فیصد مضامین اِن کی شاعری کے بارے میں ہیں۔ اور صرف ایک فیصد ان کی نثر کے متعلق حالانکہ جب اُنھوں نے تصنیفات کا سلسلہ شروع کیا تو پہلی کتاب "علم الاقتصاد" نثر ہی میں لکھی۔ عقیدت مندانِ اقبال شاید ان کی نثر کو اتنی اہمیّت نہیں دیتے جتنی اِن کی شاعری اور شاعرانہ افکار کو دیتے ہیں ——— حالانکہ جتنی ضرورت عوام کو ان کی شاعری سے واقف کرانے کی ہے۔ اتنی ہی بلکہ اس سے زیادہ اِن کے نثری سرمایہ سے آگاہ کرنے کی ہے۔ کیونکہ نثر میں مفہوم ظاہر اور شاعری میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ "اگر شبلی نے حکیمانہ نثر کی آن قائم رکھی ہے تو اقبال نے حکیمانہ نثر کا وزن بڑھایا اور اس کا رتبہ اونچا کیا ہے۔" یوں سمجھنا چاہیئے کہ شاعری نے تو ان کے دھڑکتے ہوئے دِل کو پردے میں چھپا رکھا ہے۔ جب تک کوئی اس کو ہٹانے کی اہلیت نہ رکھتا ہو وہ اس کے دیدار کا شرف حاصل نہیں کر سکتا لیکن نثر میں اِن کا دھڑکتا ہوا دِل بالکل سامنے نظر آتا ہے۔ اس کا نقاب اُٹھانے کی کسی کو ضرورت نہیں۔ مضمون زیرِ قلم میں اقبال کی شاعری اور نثر کا موازنہ کر کے تعمیری لحاظ سے اِن کی نثر کی اہمیّت ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

رئیس احمد جعفری صاحب فرماتے ہیں کہ "بہت سے نجی اور پرائیویٹ خطوط اقبال نے اپنے دوستوں،

قدرشناسوں، عزیزوں اور ملت کے سربرآوردہ اصحاب کے نام لکھے ہیں۔ انہیں اب تک صرف خطوط کی حیثیت سے
پڑھا گیا لیکن میں نے ان کے بین السطور میں اقبال کا دل دھڑکتا دیکھا ہے۔ ان خطوں میں اقبال محوِ تکلم نظر آتے ہیں۔
لیکن محوِ جستجو بھی۔ ان خطوط میں کہیں کہیں ایسی باتیں بھی اقبال کی زبان پر آ جاتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے اقبال کا
اندازِ فکر کیا ہے۔ کیسے کیسے سوالات ان کے دل میں آتے ہیں، وہ کس طرح سوچتے ہیں اور کیا سوچتے ہیں"۔

ان کا یہی خیال اقبال کی دوسری تحریروں کے بارے میں بھی ہے۔ اس نثری سرمائے کو فراموش کرنا یا
شاعری سے کم درجہ دینا بہت بڑی حق تلفی ہے۔ جبکہ اس میں ان کا قلم دردِ دل سے مجبور ہو کر۔۔۔ کبھی مرثیہ
خواں ہوتا ہے۔ کبھی شمعِ حیات فروزاں کرتا ہے۔ کبھی ماضی کا آئینہ دکھاتا ہے۔ کبھی حال کی پستی پر طعنے دیتا
ہے۔ کبھی مستقبل کی تابندگی کا نقشہ کھینچتا ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اپنی نثر میں بھی قوم کے
بہت بڑے مصلح ہیں۔ بہت بڑے لیڈر ہیں۔ بہت بڑے رہنما ہیں۔ اور منفرد قائد ہیں:۔

خودی اقبال کے کلام کا محبوب موضوع ہے اور اس پر ان کا کافی لبسیط کلام موجود ہے۔ مثلاً

ہے شعرِ عجم گرچہ طربناک و دل آویز — اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیرِ خودی تیز
فطرت کو دکھایا بھی ہے دیکھا بھی ہے تو نے — آئینۂ فطرت میں دکھا اپنی خودی بھی

شیشے کی صراحی ہو کہ مٹی کا سبو ہو
شمشیر کی مانند ہو تیزی میں تری مے

اس طرح اُنہوں نے مختلف شعروں میں خودی پر بحث کی ہے اور مسلمانوں کو مقامِ خودی دیکھنے کے لئے
چشمِ بینا دی ہے اپنے اس نظریۂ خودی کی تشکیل اُنہوں نے ایک خط میں کی ہے:۔

" بہر حال حدودِ خودی کے تعین کا نام شریعت ہے اور شریعت کو اپنے قلب کی گہرائیوں میں محسوس کرنے کا
نام طریقت ہے جب احکامِ الٰہی خودی میں اس حد تک سرایت کر جاتے ہیں کہ خودی کے پرائیویٹ امیال و عواطف
باقی نہ رہیں اور صرف رضائے الٰہی اس کا مقصود ہو جائے تو زندگی کی اس کیفیت کو بعض اکابر صوفیائے اسلام نے فنا کہا ہے۔
بعض نے اس کا نام بقا رکھا ہے لیکن ہندی اور ایرانی صوفیاء میں سے اکثر نے مسئلۂ فنا کی تفسیر فلسفۂ ویدانیت اور بدھ
مت کے زیرِ اثر کی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان اس وقت عمل کے اعتبار سے ناکارۂ محض ہے"۔

خودی کے بارے میں ان کے چند شعر اور ملاحظہ کیجئے ؎

زمن گو صوفیاں با صفا را — خدا جویان معنی آشنا را
غلامِ ہمتِ آں خود پرستم — کہ با نورِ خودی بیند خدا را

خودی کی تندی و شوخی میں کبر و ناز نہیں — جو ناز بھی ہو تو بے لذتِ نیاز نہیں

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

ان کی نظر میں انسانی انا اتنی بلند ہونی چاہیئے کہ خدا اس سے اس کی رضا پوچھنے پر مجبور ہو جائے۔ ممکن ہو سکتا ہے کہ بعض لوگ اِن کو اِس قسم کے شعروں پر معذور خیال کریں لیکن اگر وہ خودی کے بارے میں ان کے خیالات نثر میں پڑھیں تو اس غلط فہمی سے بچ سکتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ اُنہوں نے مسلمانوں کو خودی کا وہی تصور دیا ہے جو قرآن نے مسلمانوں کے لیے متعین کیا ہے۔ چنانچہ خواجہ حسن نظامی کے اعتراض کا (جو اُنہوں نے اسرارِ خودی پہ کئے ہیں) جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"مجھے خواجہ صاحب سے پورا اتفاق ہے کہ قرآن شریف میں کہیں زیادہ تعلیم خودی کی ہے اور اگر یہ تعلیم انوکھی اور نرالی ہوتی تو میں ہرگز مسلمانوں کے سامنے اسے پیش کرنے کی جرأت نہ کرتا۔ یاد رہے کہ یہ مثنوی کسی زمانۂ حال کے مصور کی لکھی ہوئی نہیں جو اپنی نادانی سے یہ سمجھتا تھا کہ میں قرآن جیسی عبارت لکھ سکتا ہوں بلکہ ایک مسلمان کی لکھی ہوئی ہے جس نے قرآن سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ اور اس کی تعلیم کو بنی نوعِ انسان کی نجات کا باعث تصور کرتا ہے۔"

شاعری میں انسان غلط مفہوم لے سکتا ہے لیکن نثر میں غلط مفہوم اخذ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اب اِن کے ذیل کے اشعار دیکھیے:-

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن — گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت — یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان،
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم — دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان
تقدیر کے پابند نباتات و جمادات — مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود — ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے
مومن کا مقام ہر کہیں ہے

یہ تمام اشعار ایسے ہیں جن میں وہ مسلمانوں کو بیدار کرنے کے لئے نغمہ سرا ہیں اس کے علاوہ انہوں نے اِن شعروں میں مسلمانوں کا مقام بھی متعین کیا ہے۔ اکثر حضرات کا خیال ہے کہ مسلمان جنگجو قوم ہے اور اقبال بھی جنگ و جدل سے الفت کرتے ہیں اور ان کو ان کی صفات یاد دلاتے ہیں کہ تو وہ طوفان ہے جس سے دریاؤں کے دل دہل جاتے ہیں۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے شعر میں ہر شخص اصل مفہوم تک پہنچنے سے قاصر ہے لیکن نثر میں ایسا نہیں ہے۔ اقبال ایک خط میں جہاد کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:-

"میں جنگ کا حامی نہیں ہوں نہ کوئی مسلمان شریعت کے حدود معینہ کے ہوتے ہوئے اس کا حامی ہو سکتا ہے۔ قرآنِ کریم کی تعلیم کی رو سے یہاں جنگ کی صرف

دو صورتیں ہیں محافظانہ اور مصلحانہ پہلی صورت میں یعنی اس صورت میں جب کہ مسلمانوں پر ظلم کیا جائے اور اُن کو گھروں سے نکالا جائے۔ مسلمانوں کو تلوار اُٹھانے کی اجازت ہے ورنہ حکم، دوسری صورت میں جس میں جہاد کا حکم ہے ۴۶:۹ میں بیان ہوا ہے۔"

شاہین اقبال کا محبوب پرندہ ہے اور بیشتر اشعار میں انہوں نے مسلمانوں کو اس سے سبق حاصل کرنے کا درس دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا — تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں
نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر — تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

انہوں نے اپنے اس شعری نظریے کو ایک خط میں واضح کیا ہے۔

"شاہین کی تشبیہ محض شاعرانہ نہیں اس جانور میں اسلامی فقر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

(۱) خود دار اور غیرت مند ہے کہ اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا۔
(۲) بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا۔
(۳) بلند پرواز ہے۔
(۴) خلوت پسند ہے
(۵) تیز نگاہ ہے۔

گفتارِ سیاست میں وطن کا مفہوم اور کچھ ہے اور ارشادِ نبوی میں کچھ اور اس بارے میں ان کے ذیل کے اشعار ملاحظہ کیجیے:۔

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور — ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور — تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بُت کہ تراشیدہ تہذیب نوی ہے — غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے — اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بُت کو ملا دے

ہو قیدِ مقامی تو نتیجہ ہے تباہی — رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی
ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِ الٰہی — دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی

گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے — تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے — کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

ان کے نظریۂ وطنیت کو سمجھنے کے لئے ایک خط کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے :-

"آپ نے اپنے پہلے خط میں وطنیت کے اصول پر اسلام کے اصول اجتماعی کو ترجیح دینے میں مجھے "امام العصر" کہا ہے جس کے لئے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ ایک نیشنلسٹ اخبار میں جس کے چار ایڈیٹر ہیں، چاروں مسلمان ہیں اور جس کا پہلا نمبر لاہور سے آج ہی نکلا ہے۔ لکھتا ہے کہ اقبال نے وطنیت کا عذر لنگ تراشا ہے۔ دیکھا مغربی کالجوں کے پڑھے ہوئے مسلمان۔ نوجوان روحانی اعتبار سے کتنے فرومایہ ہیں ان کو معلوم نہیں کہ اسلام کیا ہے۔؟ اور وطنیت کیا چیز ہے۔؟ وطنیت ان کے نزدیک لفظ وطن کا محض ایک مشتق ہے۔[۱]"

علامہ نے ۱۹۱۰ء میں لیکچر علی گڑھ میں "Islam as a social and political ideal" پر دیا تھا اس کا ترجمہ مولانا ظفر علی خاں نے کیا تھا اس میں بھی وطن کے متعلق فرماتے ہیں۔

"میں سمجھتا ہوں کہ وطن پرستی کا خیال جو قومیت کے تصور سے پیدا ہوتا ہے ایک طرح سے مادی شئے کا تابع ہے۔ جو سراسر اصول اسلام کے خلاف ہے اس لئے کہ اسلام دنیا میں ہر طرح کے شرک خفی و جلی کا قلع قمع کرنے کے لئے نمودار ہوا تھا۔"

اس کے علاوہ ایک اور مضمون "جغرافیائی حدود اور مسلمان" میں لکھتے ہیں :-

"باقی رہے مسلمان، سو افسوس ہے کہ ان سادہ لوحوں کو اس نظریۂ وطنیت کے لوازم اور عواقب کی پوری حقیقت معلوم نہیں اگر بعض مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ دین اور وطن ایک سیاسی تصور کے ساتھ یکجا رہ سکتے ہیں تو میں مسلمانوں کو بروقت انتباہ کرتا ہوں کہ اس راہ کا آخری مرحلہ اوّل تو لادینی ہوگا اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے بے پروائی ہوگی۔"

اقبال ملت کے لئے رگِ جاں تھے ان کو معلوم تھا کہ کوئی قوم اس وقت تک دنیا میں کامیابی و کامرانی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی جب تک موت کے خوف کو اپنے دل سے محو نہ کر دے ذیل کے شعروں میں وہ مسلمانوں کو یہ پیغام دے رہے ہیں ؎

از خود اندیش و ازیں بادیہ ترساں مگذر — کہ تو ہستی و وجود دو جہاں چیزے نیست

گفت اے نامحرم از رازِ حیات — غافل از انجام و آغازِ حیات
فارغ از اندیشۂ اغیار شو ، — قوتِ خوابیدہ بیدار شو

اب ان کے انہی خیالات کو ایک تقریر میں ملاحظہ کیجئے :-

"اگر آپ کا فیصلہ موجودہ حکمتِ عملی کو خیرباد کہنے کا ہو تو آپ کا سب سے مقدم فرض یہ ہے کہ پوری جماعت کو ایثار کے لئے تیار کریں جس کے بغیر کوئی غیرت مند قوم باعزت زندگی بسر نہیں کر سکتی ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ کا سب سے نازک وقت آن پہنچا ہے اپنا فرض بجا لائیے یا اپنے وجود کو مٹا دیجئے "

اقبال نے اپنے شعروں میں مسلمانوں کو بارہا قرآنی تعلیمات کی طرف رجوع کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس سلسلے میں بڑے بڑے غیرت آموز الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہی ایک چیز ایسی ہے جو بغیر کسی کمی بیشی کے ہم تک پہنچی ہے۔ اور اس کی پیروی سے مسلمان صراطِ مستقیم پر چل سکتے ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں ان کے چند اردو اور فارسی اشعار ملاحظہ کیجئے۔

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم — حکمت او لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات — بے ثبات از قوتش گیرد ثبات

می برد پابند و آزاد آورد — صید بنداں را بفریاد آورد ،
نوعِ انساں را پیامِ آخریں — حامل او رحمۃ اللعالمین

او ؐ می گیرد از و نا ارجمند — بندہ را از سجدہ سازد سر بلند

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں — ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق
اس قرآں میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم — جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیں

چوں سرمۂ رازی را از دیدہ فرو شستم
تقدیرِ امم دیدم پنہاں بہ کتاب اندر

ان کے یہ اشعار ایسے ہیں کہ اکثر لوگ ان کو تفسیر حدیث فقہ کے خلاف تصور کرنے لگتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ چنانچہ اس حقیقت کو ان کی ایک تقریر "محفل میلاد النبی" میں ملاحظہ کیجئے :-

"گویا ان بزرگوں میں (مولانا روم کی مثال دی ہے) تقلیدِ رسولؐ اور اتباعِ سنّت سے ایک خاص اخلاقی ذوق پیدا ہو گیا تھا اس طرح کے بے شمار واقعات ہیں علماء کو چاہیئے کہ ان کو ہمارے سامنے پیش کریں۔ قرآن و حدیث کے غوامض تبانا بھی ضروری ہے لیکن عوام کے دماغ ابھی مطالبِ عالیہ کے متحمل نہیں انہیں صرف اخلاقِ نبوی کی تعلیم دینی چاہیئے "

خیال کیا جاتا ہے کہ اقبال عورت کی تعلیم کے خلاف ہیں اور نہیں چاہتے کہ عورت دینِ اسلام کے سوا دنیا کے اور گوشوں سے واقفیت حاصل کرے ۔ اس ضمن میں ان کے اشعارِ ذیل ملاحظہ کیجئے ؎

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن　　کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت
اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش　　مجبور ہیں معذور ہیں مردانِ خرد مند
کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ　　آزادیِ نسواں کہ زمرّد کا گلوبند
بے گانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن　　ہے عشق و محبّت کے لئے علم و ہنر موت

میں بھی مظلومیِ نسواں سے ہوں غمناک بہت
نہیں ممکن مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود ؎

اب عورت کے بارے میں ان کے خیالات ان کے مضمون "قومی زندگی" میں ملاحظہ فرمائیے جو مخزن ماہِ اکتوبر سنہ ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا تھا۔

"عمومیات کو چھوڑ کر اگر خصوصیات پر نظر ڈالی جائے تو عورتوں کی تعلیم سب سے زیادہ توجہ کی محتاج ہے۔ عورت حقیقت میں تمدن کی جڑ ہے۔ ماں اور بیوی دو ایسے پیارے لفظ ہیں کہ تمام مذہبی اور تمدنی نیکیاں ان میں مستتر ہیں اگر ماں کی محبت میں حُبِ وطن اور حُبِ قوم پوشیدہ ہے جس میں سے تمام تمدنی نیکیاں بطور نتیجے کے پیدا ہوتی ہیں۔ تو بیوی کی محبت اس سوز کا آغاز ہے جس کو عشقِ الٰہی کہتے ہیں بس ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ تمدن کی جڑ کی طرف اپنی توجہ مبذول کریں اور اپنی قوم کی عورتوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کریں ۔ مرد کی تعلیم صرف ایک فردِ واحد کی تعلیم ہے مگر عورت کو تعلیم دینا حقیقت میں تمام خاندان کو تعلیم دینا ہے ۔ دنیا میں کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی اگر اس قوم کا آدھا حصّہ جاہلِ مطلق رہ جائے لیکن اس ضمن میں ایک غور طلب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا مشرقی عورتوں کو مغربی طریقِ تعلیم کے مطابق تعلیم دی جائے یا کوئی ایسی تدبیر اختیار کی جائے جس سے ان کے وہ شریفانہ اطوار جو مشرقی دل و دماغ کے ساتھ خاص ہیں قائم رہیں ۔ میں نے اس سوال پر غور و فکر کیا ہے ۔ مگر چونکہ ابھی ملک کسی قابلِ عمل نتیجے پر نہیں پہنچا ۔ اس واسطے فی الحال میں اس بارے میں کوئی رائے نہیں دے سکتا ۔

"عورتوں کے حقوق کے ضمن میں پردے کا سوال بھی غور طلب ہے کیونکہ کچھ عرصے سے اس پر بڑی بحث ہو رہی ہے بعض مسلمان جو مغربی تہذیب سے بہت متاثر ہو گئے ہیں اس دستور کے سخت مخالف ہیں اور اس بات پہ زور دیتے ہیں کہ

اسلام کے ابتدائی زمانے اور حال کے دیگر اسلامی ممالک میں پردے کی یہ صورت نہیں تھی جو آج کل ہندوستان میں ہے لیکن اگر غور کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں پردے پر سخت زور دیا جانا اخلاقی وجوہ پر مبنی تھا۔ چونکہ اقوام ہندوستان نے اخلاقی لحاظ سے کچھ بہت ترقی نہیں کی۔ اس واسطے اس دستور کو یک قلم موقوف کر دینا میری رائے میں قوم کے لئے نہایت مضر ہوگا ہاں اگر قوم کی حالت ایسی ہو جائے جیسی کہ ابتدائے زمانۂ اسلام میں تھی تو اس کا زور بہت کم کیا جا سکتا ہے۔ اور اقوام کی عورتوں کو آزادی سے افراد کے ساتھ تبادلۂ خیالات کرنے کی عام اجازت ہو سکتی ہے۔"

اقبال کے کلام میں تصوف کا ذکر بارہا آیا ہے اور ان کے اندازِ بیان کو دیکھتے ہوئے اکثر و بیشتر قارئین کا خیال ہے کہ وہ اس کے خلاف ہیں اس سلسلے میں کلام اور نثر ملاحظہ کیجئے ؎

ہند میں حکمت و دیں کوئی کہاں سے سیکھے / نہ کہیں لذتِ کردار نہ افکارِ عمیق۔
ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب / کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق
میں ایسے فقر سے اے اہلِ حلقہ باز آیا / تمہارا فقر ہے بے دولتی و رنجوری
نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری / کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری
نہ مومن ہے نہ مومن کی امیری / رہا صوفی گئی روشن ضمیری
کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے / فقیہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

شکایت ہے مجھے یا رب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

"اسرارِ خودی اور تصوف" پر اخبار "وکیل" امرتسر ۱۵ جنوری ۱۹۱۶ء میں ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں اقبال لکھتے ہیں:-

"اس وقت صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ یہ تحریک غیر اسلامی عناصر سے خالی نہیں اور میں اگر مخالف ہوں تو صرف ایک گروہ کا جس نے محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر بیعت لے کر دانستہ یا نادانستہ ایسے مسائل کی تعلیم دی ہے جو مذہبِ اسلام سے تعلق نہیں رکھتے۔ حضرات صوفیہ میں جو گروہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ پر قائم ہے اور سیرت صدیقؓ کو اپنے سامنے رکھتا ہے میں اس گروہ کا خاکِ پا ہوں اور ان کی محبت کو سعادتِ دارین کا باعث تصور کرتا ہوں۔"

اسی مضمون میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں ۔

"دوسرا سوال جو حالت سکر کے متعلق پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ آیا یہ حالت زندگی کے اغراض کے منافی ہے یا ممد کسی روز فرصت میں یہ ثابت کروں گا کہ علم الحیات کے اعتبار سے یہ حالت زندگی کے لئے نہایت ہی مضر ہے اور جو لوگ اس حالت کو مستقل بنا لیتے ہیں وہ کشمکش حیات کے قابل نہیں رہتے اور ملی و قومی اعتبار سے بھی اس کے مضر ہونے کی مثالیں اسلامی تاریخ میں ملتی ہیں ۔"

محنت کرو کیونکہ یہی ترقی کا زینہ ہے زندگی اس عمل اور حرکت کا مرکب ہے ۔ بغیر عمل کے دنیا میں کچھ حاصل نہیں ہوتا اور رہبانیت اسلام کی شان کے منافی ہے چنانچہ فرماتے ہیں ۔

ایسی کوئی دنیا نہیں افلاک کے نیچے
بے معرکہ ہاتھ آئے جہاں تخت جم و کے

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

بے محنت پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن شرر تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

"اسرار خودی اور تصوف" کے تحت ایک مضمون لکھا ہے جس میں پنجابی شاعر وحید خاں کا تذکرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں ۔

"وحید خان ایک پنجابی شاعر تھا ۔ جو کسی ہندو جوگی کا مرید ہو کر فلسفۂ ویدانت (ویدانت اور وحدت الوجود ایک ہی چیز ہے) کا قائل ہو گیا تھا ۔ اس تبدیلی خیال و عقیدہ نے جو اثر اس پہ کیا ہے اسے وہ خود بیان کرتا ہے ۔ ؎

سے ہم پیت پٹھان کے دل کے دیں موڑ
شرن پڑے رگھناتھ کے سکیں نہ تنکا توڑ

یعنی میں پٹھان تھا اور فوجوں کے منہ موڑ سکتا تھا مگر جب سے رگھناتھ جی کے قدم پکڑے ہیں یا با الفاظ دیگر

یہ معلوم ہوا ہے کہ ہر چیز میں خدا کا وجود جاری و ساری ہے ہیں ایک تنکا نہیں توڑ سکتا۔ کیونکہ توڑنے میں تنکے کو دُکھ پہنچنے کا احتمال ہے کاش رشید خان کو یہ معلوم ہوتا کہ زندگی نام ہی دُکھ اُٹھانے اور دُکھ پہنچانے کی قوت رکھنے کا ہے زندگی کا مقصد زندگی ہے نہ کہ موت "

اپنے اس خیال کو وہ ایک تقریر میں اس سے زیادہ واضح الفاظ میں پیش کرتے ہیں ۔

"خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ اپنا نصب العین متعین کرکے خود اپنی حالت کو نہیں بدلتی کامیابی اس کے بغیر ممکن نہیں کہ انسان کو خود اپنی قلبی زندگی کی آزادی میں یقین ہو۔ یہی یقین تو ہے جو قوموں کی نظر اپنے مقصد سے ہٹنے نہیں دیتا اور تذبذب سے نجات دلاتا ہے جو سبق ہمیں پرانے تجربے سے ملا ہے وہ بھولنا نہیں چاہیئے۔ کسی طرف سے کسی قسم کی توقع نہ رکھو خود اپنے اوپر نظر جماؤ۔ اپنی خاک کو انسانیت کی پختگی بخشو اگر تم اپنے ارادے میں کامیاب ہونا چاہتے ہو مسولینی کا قول تھا "جو قوت رکھتا ہے، دولت رکھتا ہے" میں کہوں گا جو قوتِ مجسم ہے اسے سب کچھ میسر ہے۔ سخت بنو اور سختی جھیلو ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کا یہی راز ہے ہمارے نصب العین کا تعین ہو چکا ہے۔ اس کے حصول کے لئے پیہم مستعدی کی ضرورت ہے اور ایک مستقل پروگرام کی !"

اقبال کو اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ انفرادی ترقی اجتماعی ترقی میں مضمر ہے کیونکہ ایک شخص کے مہذب ہونے سے پوری قوم مہذب نہیں کہلا سکتی چنانچہ اپنے کلام میں فرماتے ہیں ۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

سر سکندر حیات خاں وزیرِ اعظم (متحدہ) پنجاب نے ۱۹۳۷ء کے آخر میں کابینہ مسلم برادر ہڈ کو ایک پیغام دیتے ہوئے اپیل کی کہ اقبال کی خدمت میں نذرِ عقیدت کے طور پر ایک کیسہ زر پیش کیا جائے اقبال اگرچہ مالی اعتبار سے پریشان اور ضرورتمند تھے لیکن اُنہوں نے نہایت فراخ حوصلگی کے ساتھ اس طرح کی رقم قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ اس میں انفرادی مفاد ظاہر تھا۔ فرمایا :۔

"عوام کی ضرورت بحیثیت مجموعی کسی ایک فردِ واحد کی ضروریات سے کہیں زیادہ اہم ہوتی ہیں خواہ اس کی تصانیف عامۃ الناس کے لئے روحانی فیضان کا ذریعہ ہی کیوں نہ ہوں ایک شخص اور اس کی ضروریات ختم ہو جاتی ہیں لیکن عوام اور ان کی ضروریات ہمیشہ باقی رہتی ہیں "

مسلۂ کشمیر جس طرح آج الجھا ہوا ہے اسی طرح اقبال کے زمانے میں بھی تھا لیکن انہیں یقین تھا کہ ان کی فریاد

دنیا کو تہ و بالا کر سکتی ہے ؎

ایک فریاد ہے مانند سپند اپنی بساط    اسی فریاد سے دنیا تہ و بالا کر دیں

چنانچہ وہ ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء کو مسلم کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں فرماتے ہیں۔

"جہاں تک کشمیر کا تعلق ہے مجھے ان واقعات کے تاریخی پس منظر میں جانے کی ضرورت نہیں جو حال ہی میں رونما ہوئے ہیں، ایسی قوم کا دفعتاً جاگ اٹھنا جس میں شعلۂ خودی بجھ چکا ہو غم اور مصائب کے باوجود ان لوگوں کے لیے مسرت کی بات ہے جو ایشیائی قوموں کی اندرونی کشمکش سے واقف ہیں کشمیر کی تحریک انصاف پہ مبنی ہے اور مجھے کوئی شبہ نہیں کہ اس ذہین اور صناع قوم میں اپنی شخصیت کا احساس نہ محض ریاست بلکہ تمام ہندوستان کے لیے طمانیت کا باعث ہوگا البتہ جس چیز کا سب سے زیادہ دکھ ہے وہ ہندوستان کی فرقہ وارانہ مخاصمت ہے۔"

کشمیر میں اس کے بعد ۳۳ء میں ظلم و تشدد اور فتنہ و فساد کا ایک طوفان بیکراں آیا تھا اور آج بھی ظلم تشدد نے وہی صورت اختیار کر رکھی ہے۔ اقبال اپنے کلام میں مسلمانانِ کشمیر کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں ؎

سود ا بیر کی اسے قوم یہ ہے اک تدبیر    چشم اغیار میں بڑھتی ہے اسی سے توقیر
دُرِ مطلب ہے اخوت کے صدف میں پنہاں    مل کے دنیا میں رہو مثل حروفِ کشمیر

اور بالکل یہی پیغام کشمیری مسلمانوں کو ایک تقریر میں دیا ہے۔

"میں مسلمانانِ کشمیر سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ ان تحریکوں سے خبردار رہیں جو ان کے خلاف کام کر رہی ہیں اور اپنے درمیان اتفاق و اتحاد پیدا کریں کشمیر میں ابھی ایک وقت دو یا تین اسلامی سیاسی جماعتوں کے کام کرنے کا وقت نہیں ہے۔ وقت کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ریاست میں مسلمانوں کی نمائندہ صرف ایک ہی جماعت ہو۔"

ان کی شاعری کا ایک مقصد تھا۔ وہی مقصد ان کی تقریروں، بیانوں، پیغاموں، مضمونوں، خطبوں میں بھی نظر آتا ہے وہ زلفِ یار کے اسیر نہ تھے۔ بلکہ دردِ ملت میں مبتلا تھے جو ان کو ایک اضطراب میں مبتلا رکھتا تھا ان کی شاعری کیا تھی؟ اس کا تذکرہ خود انکی زبانی سننا زیادہ سودمند ہوگا۔

"میں نے نہ کبھی اپنے آپ کو شاعر سمجھا اس واسطے کہ کوئی میرا رقیب نہیں اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب تصور کرتا ہوں۔ فنِ شاعری سے کبھی مجھے دلچسپی نہیں رہی ہاں بعض خاص مقاصد رکھتا ہوں جن کے بیان کے لئے ملک کے حالات و روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کر لیا ہے ورنہ ؎

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ    کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

نہ بینی خیر ازاں مرد فرو دست
کہ بر من تہمت شعر و سخن بست

اس ساری بحث سے صرف یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ ان کی شاعری کی طرح نثر کے جام میں بھی وہی شراب بھری ہوئی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ شاعری کے جام میں نزاکت ہے، لطافت ہے، حسن ہے، اور نثر کے جام میں سادگی اور صفائی بلکہ زیادہ واضح الفاظ میں یوں کہنا چاہیئے کہ ان کے ہاں شراب تو ایک ہی ہے جام دو قسم کے ہیں۔ شاعری کے جام خوبصورت تھے اس لیے محفل میں ان کی گردش شروع ہو گئی لیکن نثر کے جام سادہ تھے اس لئے بہت کم نگاہیں اس طرف متوجہ ہوئیں۔ اقبال کے متوالوں پہ لازم ہے کہ وہ جام سے زیادہ مے کو دیکھیں کیونکہ اس محفل میں خواص تو کم اور عوام زیادہ ہیں۔ ان کے لئے جام کی خوبصورتی کی اتنی اہمیت نہیں رکھتی جتنی مے رکھتی ہے اقبال نے کہا بھی تو ہے۔ کہ

نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے

وارث میر، ایم۔ اے

# شکوہ اور جواب شکوہ

لکھنے والوں نے لکھا ہے کہ اقبال کے کلام میں بے حسی اور جمود و سکوت کی بجائے طوفانی موجوں کا اضطراب اور پہاڑوں کی بلندی اور مضبوطی پائی جاتی ہے۔ وہ ایسے مردِ مومن کا منتظر ہے جو مہر و ماہ کا شکار کرے اور آسمان کے ستاروں کو نیزے کی نوک پر اُٹھائے۔ وہ زمین کی طرف دیکھتا ہی نہیں۔ اُس کی نظر ہمیشہ آسمانوں کی طرف رہتی ہے۔ اس کا مردِ مومن سخت کوش اور شعلہ نوش ہے۔ وہ معرکۂ بدر و حنین میں دادِ شجاعت دیتا اور "شادہ و دلو رست در دست بہند"، کو تا قیامت زندہ رہنے والی حقیقت بنا دیتا ہے اور شانِ استغنا کا یہ عالم ہے کہ قیصر و کسریٰ کے خزانوں کو اپنے مکئی کے پیالے پر قربان کر دیتا ہے۔ وہ خلیل و مصطفیٰ کی رہنمائی میں زیردستی و مسکنت کی بجائے، حرکتِ عمل، کشمکشِ انقلاب اور غلبہ و استیلا کا طالب ہے —— اور کہنے والوں نے یہ بھی کہا ہے کہ ایک طرف تو اقبال پُر خطر صحراؤں میں جستجوئے محملِ لیلیٰ کو زندہ تصوّر کرتا ہے لیکن دوسری طرف بعض مقامات پر وہ خدا اور تقدیر کے خلاف شکوہ سنجیوں کا خوگر نظر آتا ہے۔ یہ نہ پوچھئے کہ یہ اعتراض کس نقاد کی "شوخیٔ تحریر یا تقریر" ہے۔ معلوم کرنے والی بات صرف یہ ہے کہ معترض کا اشارہ اقبال کے شکوہ اور جوابِ شکوہ کی طرف ہے اور "زبانِ طعن" یہاں تک دراز کر دی گئی ہے کہ ان نظموں میں اقبال کی شاعری کے ڈانڈے فانی اور میر کی شاعری سے جا ملائے ہیں۔

وہ نقاد جو یہ کہتا ہے کہ شکوہ اور جوابِ شکوہ میں اقبال قنوطیت اور یاسیت کا شکار نظر آتا ہے اور ہر شعر فکرِ اقبال کی رعنائی و برنائی کو گرد آلود کرتا جاتا ہے۔ یقیناً نقاد تو کیا، سخن فہم کہلانے کا بھی مستحق نہیں۔ وہ اقبال کی شاعری میں کارفرما رُوح کی تڑپ اور اس کے اساسی فلسفۂ حیات کو سمجھے بغیر قلم اُٹھانے کی جرأت کرتے ہیں۔ اقبال کے شعروں میں استعمال ہونے والے ہر لفظ اور اصطلاح میں ایک پورا نظامِ فکر پوشیدہ ہے۔ اس نظامِ فکر کی بنیاد قرآن کے ابدی اور ناقابلِ تغیر اصولوں پر اُٹھائی گئی ہے اور اس کی دلکشی و خوبصورتی میں سب سے زیادہ حصّہ اُس محبت نے لیا ہے جو اسلام اور مسلمانوں کے لئے، اقبال کے دل میں موجزن تھی۔ وہ اپنے اشعار میں جو الفاظ، تشبیہیں اور استعارے استعمال کرتا ہے، اُن کو فکرِ اقبال کے پس منظر سے ذرا اِدھر اُدھر کر لیا جائے تو سمجھئے، معانی کے لطیف ترین پہلو تشنۂ اظہار رہ جائیں گے۔ اس کے یہاں الفاظ و معانی کی ایک نفیس و جمیل مطابقت ہے اور وہ ایک وسیع سلسلۂ خیال کو نہایت مختصر لفظ یا علامت میں ادا کرتا ہے۔ اور اس لئے شکوہ اور جوابِ شکوہ میں اقبال نے قوموں کے فلسفۂ عروج و زوال کو حسبِ دلکش، موثر اور عبرت آموز پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اس کا اندازہ

ایسے کوتاہ بین نقاد کیسے لگا سکتے ہیں جو اقبال کے فلسفۂ حق و باطل اور احتجاج و فریاد کی اداؤں اور رموز ملں سے ناواقف ہوں جن اصحاب فکر کے قلب و ذہن مطالعۂ اقبال کی روشنی سے مستنیر ہیں اور شعرِ اقبال کے براہِ راست مطالعے کی نعمت سے مالامال ہیں بخوبی جانتے ہیں کہ اقبال کی شاعری میں فلسفۂ حق و باطل اور تخریب و تعمیر جاری و ساری ہے۔ قرآنی اصولوں کے تحت تخریبی عناصر ہمیشہ برباد ہوتے ہیں۔ اور تعمیری طاقتوں یعنی حق و انصاف کو غلبہ حاصل ہوتا ہے گویا باطل کے لئے ازل سے شکست و ذلت مقدر ہے۔ یہی فلسفۂ حق و باطل اور فلسفۂ تخریب و تعمیر نظم شکوہ اور جواب شکوہ میں موجود ہے۔ علامہ اقبال نے وطنیت کے پردے میں یورپی قوموں کی استعماریت اور ہوسِ ملک گیری کو بچشم خود دیکھا تھا۔ جنگِ طرابلس اور جنگِ طرابلس کی صورت میں مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے تھے۔ اسلام کے نام لیوا دنیا کے ہر حصے میں ذلیل اور تباہ ہو رہے تھے علامہ اقبال کا دل رو دیا اس کے فن کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور شکوہ اور جواب شکوہ لکھ کر اس نے مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کی اور اس ترجمانی میں جذبہ و فن کے خوبصورت اور کامیاب امتزاج کی وہ معراج نظر آتی ہے کہ بے اختیار ٹالسٹائی کا ایک فقرہ یاد آتا ہے "اپنے احساسات و جذبات کو بیدار کرنا اور بیدار کرنے کے بعد حرکت، خطوط، رنگ، آواز اور الفاظ کے ذریعے ان احساسات کو دوسروں تک اس طرح پہنچانا کہ دوسرے بھی انہیں اسی طرح محسوس کریں، حقیقتاً فن ہے" اور واقعی ان نظموں کے ذریعے علامہ نے اپنے فن کا لوہا منوا لیا۔

شکوہ اور جواب شکوہ میں اقبال بعض اوقات بالفاظ حسن نظامی "اکبری اقبال" بن جاتا ہے۔ وہ اپنے واردات و تاثرات زبانِ شعر میں ادا کرنے کا ایک نادرانہ اور شوخ انداز اختیار کرتا ہے جو اکبر کو ودیعت ہوا تھا۔ اس قسم کے موقعوں پر وہ شوخ انداز دانستہ طور پر اختیار نہیں کرتا تھا بلکہ یورپ کے بحرِ علم و حضارت میں مشق شناوری کے بعد یہ طریقِ انداز قدرتاً اس کے کلام میں در آئی تھی۔ شکوہ اور جواب شکوہ میں وہ ہمیں دو اور حیثیتوں سے بھی نظر آتا ہے۔ میر کے رنگ میں اور غالب کے انداز میں۔ اقبال نے ایک شاعر اور دوسرے، نقاد کی حیثیت سے میر کے غم آگیں اندازِ فکر اور غالب کی مخصوص تخیل آرائی سے کام لیتے ہوئے قوم کے جذبات شوریدگی پر منظوم صورت میں تنقید بھی کی ہے اور ترجمانی بھی اقبال کے ایک سوانح نگار کے الفاظ میں "اقبال نے وہ کام بھی کیا جو حالی نے کیا تھا۔ وہ مقصد بھی ادا کیا جو اکبر پیدا کرنا چاہتے تھے اور یاس و قنوطیت کی زنجیروں سے آزاد ہو کر "مشککیت" کے طلسم سے رہا ہو کر "رجائیت" کے وہ آئینِ شہبازی بھی سکھائے جو "یقین و عمل" کے اس آخری پیغمبری کا درس ہو سکتے تھے" اقبال نے شکوہ اور جواب شکوہ میں اکبر کی شوخی اور چلبلاہٹ، میر کی یاسیت اور غالب کی رفعتِ تخیل سمو کر، مسلمان قوم کی نکبت و پستی اور زبوں حالی کے عمل و ردِ عمل پر طبع آزمائی کی ہے۔ ایک عام اور دردمند مسلمان کا تقاضائے بشریت سے مجبور ہو کر، خدا کی بے التفاتی کے خلاف خاموش احتجاج اور شکوہ۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ لیجئے کہ خود فریب قوم کے عامیانہ اور سطحی فکر پر، ایک دیدۂ بینا کا نقد و احتساب اگر اقبال ایک فلسفی کی حیثیت میں خدا سے شکوہ سنج ہوتا تو یقیناً اس کا اشہبِ قلم نکات و عوامض کی ان خارزار اور دشوار گذار وادیوں کو جولانگاہ بناتا نظر آتا جہاں تک عام لوگوں کی چشمِ تصور بھی نہیں پہنچ سکتی۔ لیکن متکلمین کی افلاطونی منطق کو اقبال نے چھیڑا تک نہیں (جسے آج تک نہ پڑھانے والا سمجھا ہے نہ پڑھنے والا) اس کے برعکس اس نے سادگی اور سلاست کی دل نشینی کو

ہر قدم پر ملحوظ رکھا ہے۔ اس کے پیشِ نظر صرف ایک قوم کی ذہنی ناآسودگی اور اجتماعی لاشعوری سوچ کا اظہار تھا ان نظموں میں اقبال نے اپنی قوم کی اس ذہنیت کی ترجمانی کی ہے اور اس پر تنقید کی ہے جو زوال پذیر قوموں کا اکثر شیوہ رہا ہے یعنی اپنی "بے وفائی" کا اعتراف کرنے کی بجائے، خدا کی دلداری پر شک کیا جاتا ہے۔ انحطاط و زوال کے ایک خاص دور میں ہندوستان کے مسلمان کیا محسوس کرتے تھے۔ کیا کہتے تھے، کیا سمجھتے تھے (یہ مسلمان صدیوں تک ہندوستان پر حکومت کرتے رہے)، اقبال نے یہ سب کچھ بتایا ہے۔ مسلمانوں کے مرض کی نشاندہی کی ہے۔ تشخیص کی ہے اور پھر اسکا علاج اور پرہیز بھی بتایا ہے۔ اقبال نے "مایوس اور ردِ عمل بیزار" ذہنوں کا جس اچھوتے پن سے تجزیہ کیا ہے۔ وہ صرف اُسی کا حصّہ ہے لیکن شکوہ اور جواب شکوہ کے حزن انگیز تاثر کو کلامِ اقبال کی قنوطیت پر برہان سمجھنا، دراصل اقبال فہمی سے محرومی کا ثبوت دینا ہے۔ اقبال نے شکوہ میں مسلمانوں کی پوری دینی و تہذیبی تاریخ کا پُرفخر لہجے میں اعادہ کر دیا ہے اور گویا اس طرح خالقِ کائنات کے الطاف و اکرام پر مسلمان قوم کا استحقاق ثابت کیا ہے۔ اور جواب شکوہ میں خدا کی زبان سے عاقبت نااندیش اور محض شکوہ سنج مسلمانوں کی کوتاہیاں اور معائب بیان کئے ہیں "شکوہ" میں اقبال نے بلبلِ پُردرد بن کر اثر و تاثیر میں ڈوبے ہوئے وہ نغمے گائے ہیں کہ کوئی دلِ پُرسوز اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس نظم میں اقبال خود کہتا ہے ؎

بوئے گُل لے گئی بیرونِ چمن رازِ چمن  کیا قیامت ہے کہ خود پھول ہیں غمازِ چمن
عہدِ گُل ختم ہوا، ٹوٹ گیا سازِ چمن  اُڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پردازِ چمن
ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنم اب تک
اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک

نظم کا آخری بند ہے ؎

چاک اِس بلبلِ تنہا کی نوا سے دل ہوں  جاگنے والے اسی بانگِ درا سے دل ہوں
یعنی پھر زندہ نئے عہدِ وفا سے دل ہوں  پھر اسی بادۂ دیرینہ کے پیاسے دل ہوں
عجمی خم ہے تو کیا، مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا، لے تو حجازی ہے مری

شکوہ اور جواب شکوہ کا انداز کچھ یوں ہے کہ اقبال پہلے بے حال و مسکین مسلمانوں کی پُرسوز آرزو کو شکوے کے رنگ میں پیش کرتا ہے اور پھر بارگاہِ الٰہی (یا قوانینِ فطرت) سے اس کی بصیرت جواب حاصل کرتی ہے۔ اقبال شکوہ کرتا ہے کہ مسلمانوں پر تنزل اور ادبار کی گھٹائیں چھائی ہیں اور اقوامِ عالم میں جو ہستی انہیں حاصل ہے۔ اس پر دیدۂ دردمند اشک فشاں ہے۔ پھر خود اقبال ہی بزبانِ حق یہ دلیل پیش کرتا ہے۔ ع

ہاتھ بے زور ہیں، الحاد سے دل خوگر ہیں

ہر حساس دل نوحہ کناں ہے کہ خدایا تیرے دشمنوں کے خزانے تو سیم و زر سے معمور ہیں ان کے دن ظفر مندیوں اور سرفرازیوں کے مہرِ درخشاں سے روشن ہیں۔ ان کی راتیں حور و قصور کی دل نوازیوں سے آباد ہیں اور ع

ع "بیچارے مسلمان کو فقط وعدۂ حور"

اے قادر و عادل!

کیوں مسلمانوں میں ہے دولتِ دنیا نایاب        تیری قدرت تو ہے جس کی کوئی حد ہے نہ حساب

طعنِ اغیار ہے، رسوائی ہے، ناداری ہے

کیا ترے نام پہ مرنے کا عوض خواری ہے

لیکن خدا کا یہ قانونِ مکافات ازل سے چلا آرہا ہے۔ ع

ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

مسلمانوں کی ہلاکت و نامرادی خود ان کی اپنی بے عملی اور بے تدبیری کا نتیجہ ہے۔ دوسری قوموں نے زمین و آسمان کی طنابیں کھینچ لیں۔ ذرے سے لے کر چاند تک کا جگر چیر ڈالا، لیکن مسلمان تصوّف کے فروعی مسائل میں الجھا رہ گیا۔

جن کو آتا نہیں، دنیا میں کوئی فن تم ہو        نہیں جس قوم کو پروائے نشیمن تم ہو

خدا نے آج تک اُس قوم کو نہیں بخشا جس کی حیاتِ اجتماعیہ میں اتفاق و اتحاد کی بجائے نفاق اور انتشار کے طوفان پوشیدہ ہوں۔ مسلمانوں کا نبی ایک، ایمان ایک اور حرم و کعبہ بھی مشترک ہے اس کے باوجود۔ ع

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں

ان کے اسلاف رگِ باطل کے لئے ایک نشتر تھے۔ ان کی قوتِ بازو در خیبر کو ایک جھٹکے سے اُکھاڑ پھینکتی تھی۔ ان کی ہیبت سے رفتارِ زمانہ کی نبضیں چھوٹنے لگتی تھیں۔ اُنھوں نے وقت اور ماحول کے مزاج میں انقلاب برپا کر دیا۔ لیکن ان کی حمیّت و خودداری کو کوئی متاثر نہ کر سکا۔

اقبال کے شکوہ اور جواب شکوہ کو شروع سے آخر تک پڑھ جائیے۔ کہیں کوئی الجھاؤ، اُلکاؤ یا پیچیدگی نہیں۔ محدود معنوں میں یہ مسلمان قوم کے مریض ذہن کی تحلیلِ نفسی ہے اور وسیع معنوں میں قوموں کے فلسفۂ عروج و زوال پر بحث کی گئی ہے۔ یعنی۔ ایک دریوزہ گر قوم کس انداز میں سوچتی ہے؛ وہ اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کے لئے کس طرح خود تراشیدہ مجبوریوں کو متہم کرتی ہے۔ اپنے خود فریب ذہنوں کی تسکین کے لئے تقدیر کو کیسے سلائے رکھنا چاہتی ہے۔ یہی وہ عوامل ہیں جنہوں نے ہمیشہ قوموں کو غارت کیا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ مسلمان آج بھی اُسی قسم کے جمود اور بے حسی کا شکار ہیں۔ شمشیر اور عقل کی سپر، دونوں سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ اقبال ہی کے الفاظ میں "رسمِ اذاں تو رہ گئی ہے، روحِ بلالی عنقا ہے" فلسفہ بھی موجود ہے لیکن اس میں غزالی کی صحتِ بصیرت، پختہ خیالی اور حرارتِ ایمانی کا فقدان ہے۔ عمل و حرکت پر آمادہ ہونے کی بجائے ستوں طالع کو کوس کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ وہ فطرت کے اصولوں کو جھٹلاتے ہیں وہ بھول گئے ہیں کہ قوانینِ فطرت آج تک کسی کی خاطر تبدیل نہیں ہوئے اور نہ ہوں گے جس نے فطرت سے محبت کی ہے، فطرت نے بھی اس سے محبت کی ہے جس نے فطرت سے اغماض برتا، فطرت نے اُسے پائے استحقار سے ٹھکرا دیا اور اقبال نے اس حقیقت کو شکوہ اور جواب شکوہ میں یوں بیان کیا ہے۔ سہ

گلہ جور نہ ہو، شکوۂ بیداد نہ ہو

عشق آزاد ہے، کیوں حسن بھی آزاد نہ ہو

خواجہ عبدالحمید یزدانی

# اقبال ایرانیوں کی نظر میں

آج سے رُبع صدی پیشتر علامہ اقبال ایرانیوں کے لئے معروف شخصیت نہ تھے۔ جس کی غالب وجوہ یہ ہیں کہ نہ تو حکیم الامت خود کبھی ایران تشریف لے گئے اور نہ کسی نے انہیں متعارف کرانے ہی کی زحمت گوارا کی۔ ایرانی فضلا میں سے بقول ڈاکٹر طاہر فانی، صرف سعید نفیسی[1] مرحوم نے دو ایک مرتبہ ان سے خط و کتابت کی۔

ایران میں اقبال کا ذکر سب سے پہلے "انجمن فرہنگی ایران و ہند" کے افتتاحی اجلاس میں ہوا جس میں ملک الشعرا بہار مرحوم نے اقبال کے متعلق اپنا ایک منظوم مقالہ پڑھا۔ اس مقالہ میں انھوں نے مقام اقبال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے زمانہ حاضرہ کو "خاصہ اقبال" کے نام سے یاد کیا ہے۔ لیکن ایرانی ادبا و شعرا میں اقبال کی حقیقی شہرت کا آغاز پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد ہوا۔ ۱۹۴۸ء میں پہلی مرتبہ ان کی شخصیت اور شاعری پر ایک مختصر سی کتاب "اقبال لاہوری" کے نام سے چھپی، جس کے مصنف ایران کے نامور فاضل و ادیب بزرگ آقائے مجتبیٰ مینوی تھے۔

ادھر تو اس کتاب نے اقبال کو ایران کے تعلیمیافتہ حلقے میں روشناس کرایا ادھر ۱۹۵۰ء میں پاکستان کے سفارت خانے نے بڑی شان کے ساتھ پہلی مرتبہ یوم اقبال منایا۔

اس تقریب کی صدارت ملک الشعرا بہار مرحوم نے کی۔ انھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا:۔

"میں اقبال کو اسلامی مجاہدوں عالموں اور ادیبوں کی نو سو سالہ جدوجہد کا خلاصہ اور نچوڑ جانتا اور اس بوستان کا پکا ہوا میوہ سمجھتا ہوں"۔

دانائے راز کے متعلق اشعار ذیل بھی مرحوم بہار ہی کے ہیں:

عصر حاضر خاصۂ اقبال گشت  واحدی کز صد ہزاراں بگذشت
شاعراں گشتند جیشی تار و مار  وین مبارز کرد کار صد سوار

| | |
|---|---|
| عصر حاضر خاصۂ اقبال گشت | واحدی کز صد ہزاراں بگذشت |
| ہیکلی گشت از سخن گوئی بپا | گفت: "کل الصید فی جوف الفرا" |

---

[1] سعید نفیسی نے ۲۲ آبان ماہ ۱۳۴۵ھ ش (اتوار ۱۳ نومبر ۱۹۶۶ء) کو تہران میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ آپ ایران کے بہت بڑے ادیب و فاضل تھے اور تہران یونیورسٹی کے دانشکدۂ ادبیات میں پروفیسر بھی رہے جہاں آپ علوم سیاسی تاریخ ادبیات، تاریخ تصوف اور تاریخ تمدن وغیرہ کا درس دیتے رہے۔ بے شمار تصنیف و تالیفات آپ کے یادگار ہیں۔

شاعران گشتند جیشی تار و مار — وین مبارز کرد کار صد سوار

ایران میں اقبال کو ملکی شہرت اس وقت حاصل ہونا شروع ہوئی جب خواجہ عبدالحمید عرفانی ایران میں پاکستانی سفارتخانے کے پریس اتاشی مقرر ہو کر گئے۔ وہ چونکہ فارسی بول چال سے بخوبی آگاہ اور خود فارسی کے شاعر تھے، انھوں نے اس سلسلے میں بڑی سرگرمی اور جوش و ولولہ کا مظاہرہ کیا۔ چنانچہ بقول سعید نفیسی مرحوم ایران میں اقبال کی شہرت تمام تر خواجہ صاحب ہی کی مرہون منت ہے۔

اب ایران میں علامہ مرحوم کی زندگی، ان کی شخصیت اور ان کی شاعری وغیرہ پہ مضامین لکھے جانے لگے اور شعرا نے بھی ان پر نظمیں لکھنا شروع کیں۔ چنانچہ ۱۹۵۶ء میں سعید نفیسی مرحوم ہی نے "ضرب کلیم" فارسی ترجمہ (از خواجہ عبدالحمید عرفانی) کے مقدمہ میں لکھا کہ "آج ایران میں کیا پیر و جوان اور کیا زن و مرد سب پاکستان کے عظیم شاعر محمد اقبال سے بخوبی واقف ہیں اور ہر شخص کی زبان پہ ان کا نام اور ہر گھر میں ان کا کلام موجود ہے"۔

مرحوم بہار جن کا ذکر پہلے آ چکا ہے، ایران کے عصر حاضر کے بہت بڑے شاعر، عالم اور محقق تھے۔ انہیں اقبال سے والہانہ عشق تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی کئی ایک منظومات میں اقبال کا ذکر کیا ہے۔ (اور تعجب کی بات یہ ہے کہ تاریخِ وفات دونوں کی ایک ہی ہے یعنی اوّل اردی بہشت مطابق ۲۱ اپریل)۔ پاکستان کے متعلق اپنی ایک نظم میں کہتے ہیں:

درود باد بر روحِ مطہرِ اقبال — کہ بود حکمتش آموزگار پاکستان
"ہزار بادۂ ناخوردہ"[1] در عہد او کہ مست — از آن میکش می بی خمار پاکستان

ایک جگہ اقبال سے اپنی عقیدت و ارادت کا اظہار یوں بھی کرتے ہیں:

شمۂ ای میگویم از احوال تو — این سخن گویم کہ گفت اقبال تو
زندگی جہد است و استحقاق نیست — جز بعلم انفس و آفاق نیست

سعید نفیسی مرحوم، شاعر مشرق کے نظریۂ خودی کے بہت معترف تھے۔ انھوں نے اقبال پر کئی مقالات لکھے جنھیں بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"این خورشیدِ فروغ بخش جہانفروز محمد اقبال شاعر بزرگِ پاکستان
وارثِ ہشتصد سالہ سُنتِ ادبی زبان فارسی در ہند و پاکستان است"

صادق سرمد مرحوم ایران کے شاعر ملی اور ملک الشعرائی کے منصب پر فائز تھے۔ مارچ ۱۹۵۰ء میں جب

---

[1] بہار نے یہ ٹکڑا اس شعر سے لیا ہے:

گمان مبر کہ بپایان رسید کار مغان — ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

مطلب یہ ہے کہ ہزار ناخوردہ شرابوں میں سے اقبال کی ایک بے خمار شراب یہی "پاکستان" ہے۔

شہنشاہ ایران پہلی مرتبہ پاکستان تشریف لائے تو سرمد بھی ان کے ہمراہ تھے۔ انھوں نے جہاں مختلف مواقع پر پاکستان سے متعلق اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا وہاں حکیم الامت سے بھی اپنی عقیدت و محبت کا مظاہرہ کرنے کے لئے فی البدیہہ اشعار کہے۔ چنانچہ ۳ مارچ ۱۹۵۰ء کو جب سابق سندھ کے گورنر نے شہنشاہ موصوف کی دعوت کی تو اس موقع پر سرمد نے پاکستان کے بارے میں ایک قصیدہ پڑھا جس میں اقبال کو "سخنگوے حقیقت دان" کے الفاظ سے یاد کیا تھا۔ اس قصیدے کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

گر قیامِ پاکدل مردانِ با ایمان نبود — کشوری پیدا بپاکی ہمچو پاکستان نبود
فتح پاکستانیان مولودِ ایمان است و بس — فتح پاکستان نبود از لشکر ایمان نبود
گر ہرا ایمان نبود از حق و باطل مالکی — از تبیینات طلبیان را امتیاز امکان نبود
گر نبود ایمانِ مردانِ خدا در راہِ حق — خلق را روی نجات از پنجۂ عدوان نبود
پرچمِ اقبالِ پاکستان نبُد در اہتزاز — گر چو اقبالش سخنگوی حقیقت دان نبود

(پاکستان کے نصیبے کا پرچم نہ لہرایا ہوتا اگر اس کا اقبال جیسا حقیقت دان شاعر نہ ہوتا)

دس مارچ ۱۹۵۰ء کو شہنشاہ شالامار باغ لاہور میں مدعو تھے۔ وہاں سرمد مرحوم نے جو قصیدہ پڑھا اس کے شروع میں چونکہ اقبال کو یاد کیا گیا تھا اس لیے اس کا عنوان "نغمۂ اقبال" رکھا۔

ای مسلمانانِ پنجابی زہی اقبالتان — کز دمِ اقبالتان مقبول شد آمالتان
نغمۂ اقبالتان شوی قطارہ آورد باز — ای مسلمانان پنجابی زہی اقبالتان
گر چراغِ لالۂ صحرای اقبالی نبود — شمع این محفل نمی شد روشنی حالتان
فکر خود کردید و "اسرار خودی" آموختید — لاجرم بیخود نشد نزد خدا اعمالتان

جیسا کہ پہلے بیان ہوا اپریل ۱۹۵۰ء میں ایران میں پہلی مرتبہ یوم اقبال منایا گیا۔ اس موقع پر سرمد نے اقبال پر جو قصیدہ پڑھا وہ ان کی قدرتِ بیان اور روشن طرز فکر کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ ملاحظہ ہو:

اگرچہ مرد بمیرد، بگردشِ مہ و سال — نمردہ است و نمیرد، محمدِ اقبال
حیاتِ صورتش ار طی شدہ است، طی نشود — حیاتِ سیرتش، ار طی شود ہزاران سال
بیادِ روزِ بزرگش کہ روزِ اقبال است — درود باد برین بزم و روز فرخ فال
درود باد بلاہور و خطۂ پنجاب — کہ زاد و پرورد این شاعر خجستہ خصال
برغمِ ہر چہ چمن زاد و ناز پرورد است — ز خاک مردہ دمید این جمال و جلال[1]

---

[1] حکیم الامت مشہور جرمن شاعر گوئٹے سے اپنا مقابلہ کرتے ہوئے ایک جگہ کہتے ہیں:

او چمن زادے چمن پروردۂ — من دمیدم از زمینِ مردۂ

سرمد کا مذکورہ شعر اسی شعر کی طرف اشارہ ہے۔

زخاکِ مردہ دمید آیتِ حیات چنانکہ  حیات دولتِ پاکان ازاو گرفت کمال
چو شمعِ منزلِ ویرانِ خود نفس می سوخت  کہ طوفِ سوزشِ پروانہ ای زند پروبال[۱]
چراغِ لالہ شد و آنقدر بصحرا سوخت  کہ شمعِ محفلِ اقبال گشت و روشن حال[۲]
زمامِ ناقۂ اسلام زی قطار کشید  اگرچہ دستِ طبیعت بدو نداد مجال[۳]
درستِ خواہی آغازِ زندگی مرگ است  کہ میکشند بمیزانِ صحیفۂ اعمال
حدیثِ چشمۂ حیوان و دولتِ جاوید  حقیقتی است کہ فہمش نمیکند جہال
زلالِ چشمۂ ایمان بنوش و باقی باش  کہ آبِ چشمۂ حیوان از آن گرفت زلال
کسی کہ زندہ بحق شد چو حق نمی میرد  کہ بر وجود و عدم حق و باطل است مثال

رجالِ حق، ہمہ آیاتِ ذاتِ لم یزلند  حیاتِ لم یزلی، کی شود اسیرِ زوال
ببیں بہ صفحۂ تاریخ و حق مردان بین  کہ نیست تاریخ الا مساعیِ ابطال
بطل شنیدی و نشناختی بطل، زیراک  بطل شناس نۂ، زان سبب شدی بطّال
بطل نہ آنکہ بآہنگِ طبل خواند سرود  بطل نہ آنکہ بہ شیپورِ رزم شد طبّال
بطل نہ آنکہ سپر کرد سینہ بر باطل  کہ حق مردم بدست و پاکند پامال
بطل کسی کہ بروز بلا بلا جوید  کہ دفعِ شر کند از خیرِ خلق بد احوال
بطل کسی کہ بشر را بحق ہدایت کرد  کہ باطلش نکشاند بہ پرتگاہِ ضلال
چنیں بطل کہ ادا کرد حقِ خدمتِ خلق  خدای خود نکند حق خدمتش ابطال
درود باد بر ابطالِ حق کہ از دمشان  مسیح زندہ شود روزِ رجعتِ آمال
قیامِ مردِ خدا، کمتر از قیامت نیست  کہ بعثِ ملت و دولت کند باستعجال

گواہ دولتِ پاکان ببین، بہ پاکستان  کہ خود چگونہ برافراشت پرچمِ اقبال
اگرچہ قائدِ اعظم بہ نہضتِ پاکان  جناحِ لشکرِ اسلام بود و قلبِ رجال
ولیک نغمۂ اقبال اگر نبود، نبود  نوای لشکرِ پاکان، سرودِ استقلال

---

۱؎ اقبال کے ایک قطعہ شمع اور شاعر کی طرف اشارہ ہے جس میں وہ کہتے ہیں :

دوش می گفتم بہ شمعِ منزلِ ویرانِ خویش  گیسوے تو از پرِ پروانہ دارد شانہ
مدتی مانندِ تو من ہم نفس می سوختم  در طوافِ شعلہ ام بالے نہ زد پروانہ

۳؎ اقبال کے اس شعر کی طرف اشارہ ہے :

نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست  سوی قطار میکشم ناقۂ بی زمام را

سخن سرائی اقبال بندر دین افشاند — برغم دشمن بیدین و کافر قتال
بخوانِ "زبورِ عجم" وز "رموز اسرارش" — "پیامِ مشرق" بشنو بخوشترین اقوال
رسول وار، بہ تبلیغ حق کتاب نوشت — کہ قدر حق بشناسند منافق محتال
اگر کتاب نبود و اگر رسول نبود — چہ بود غیرت ابطال و ہمت ابدال!
درود باد بر اقبال و سعی مقبولش — کہ عزت ابدی آمدش باستقبال
سخن سر آمد و سر مد مجال شعر نداشت — وگرنہ حق سخن بود جای بسط مقال

جب ایران میں دوسری مرتبہ یوم اقبال منایا گیا تو اس موقع پر صادق سرمد نے "ایام بزرگ" کے نام سے درج ذیل قصیدہ پڑھا۔ جس میں بلاغت و روانی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اس میں تاریخ کے بعد عظمت سے بحث کی ہے کہ عظمت مال و دولت وغیرہ ہی کی کثرت سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ عظیم افکار و پیغام انسان کو عظمت بخشتے ہیں۔ اقبال عظیم ہے لیکن اس کی عظمت یکروزہ نہیں اس لئے کہ عظیم ہستیوں کے تمام دن عظیم ہوتے ہیں :

ہر کس کہ بتاریخ وی اقدام بزرگ است — در صفحۂ تاریخ از او نام بزرگ است
از نام بزرگ است بہ تاریخ فراوان — تاریخ ولیکن، نہ بہ انعام بزرگ است
تاریخ، جز اقدام بزرگان چہ بود ہیچ — تاریخ نہ آنرا، کہ نہ اقدام بزرگ است
تاریخ نہ از ہر چہ بود نام بود نیک — بس نام کہ اندر خور دشنام بزرگ است
بسیار کس آمد کہ ز تدلاف بزرگی — پنداشت کہ اقدام با قدام بزرگ است
پنداشت کہ در عالم اشباه و نظایر — ارواح بزرگان، پس اجسام بزرگ است
پنداخت کہ آثار بزرگی است بصورت — وآنرا کہ قد و قامت و اندام بزرگ است
پنداشت کہ عیش خوش و مستی بزرگان — در ساغر پر بادہ و در جام بزرگ است
پنداشت کہ زیر فلک پی در و پیکر — اسباب بزرگی بہ در و بام بزرگ است
سرمایہ بدست آورد، آوخ کہ ندانست — سرمایۂ او مایۂ سرسام بزرگ است
بگشود در خانہ و گسترد سر خوان — پنداشت کہ اطعام وی اکرام بزرگ است
انعام صفت دل بہ نعم بست و ندانست — کاین آب و علف طعمۂ انعام بزرگ است
اطعام ز عادات بزرگی است، ولیکن — اکرام بزرگان نہ با طعام بزرگ است
آنراست بزرگی کہ بہ کام دل ناکام — در حلقۂ ناکامان، ناکام بزرگ است
آنراست بزرگی کہ ز عالم برد آلام — ہر چند ز عالم بہ وی آلام بزرگ است
چون صید بزرگ آمد صیاد قوی گشت — پیداست، پس از شدی دام بزرگ است
ادراک حقیران نکند قسم بزرگی — کاین مسئلہ اندر خور افہام بزرگ است

اقوام، بزرگند، بہ افکارِ بزرگان — وین سنتِ دیرینۂ اقوامِ بزرگ است
اسرارِ بزرگی است پدیدار زِ پیغام — چونانکہ نبیؐ حاملِ پیغامِ بزرگ است
اقبال کہ پیغمبرِ پیغمبرِ حق بود — در حضرتِ حق صاحبِ انعامِ بزرگ است
فرعون بزرگ است چو اهرام ولیکن — اصنام بزرگ است کہ اهرام بزرگ است
اهرام چہ بندی بہ اهرام؛ چو اقبال — رُو سوی حرم کن کہ باحرام بزرگ است
اقبال بزرگ است کہ در عالمِ توحید — از بت شکنی دشمنِ اصنامِ بزرگ است
اقبال بزرگ است کہ برگردنِ اسلام — از خدمتِ بی منت وی دام بزرگ است
ہرچند بزرگی است پدیدار ز آغاز — آغاز بزرگی بہ سرانجام بزرگ است
اقبال بہ پاکستان بخشید سرانجام — بخشید براو حق کہ بہ فرجام بزرگ است
امروز بہ پاکستان ز اقبال بلند رَش — ہنگامۂ شادی است کہ ہنگام بزرگ است
اقبال بزرگ است ولیکن نہ بیک روز — کا یام بزرگاں ہمہ ایّام بزرگ است

بقول ڈاکٹر مبین خلیقی، صادق سرمد نے اقبال کے بارے میں جتنے بھی اشعار کہے ہیں وہ مضامینِ بدیع اور افکارِ عالی پر مشتمل ہیں اور ان کا ہر قصیدہ فلسفۂ اخلاق و اجتماع کی ایک کتاب ہے۔ انھوں نے ان قصائد میں شخصیتِ اقبال کی کچھ اس انداز میں تعریف و توصیف کی ہے کہ موضوع کی یکسانیت کے باوصف وہ ایک دوسرے سے متمیز ہیں۔

ایران میں تیسرے "یومِ اقبال" (منعقدہ سفارتخانۂ پاکستان) کے موقع پر سرمد نے جو قصیدہ پڑھا اس میں وہ کہتے ہیں کہ اقبال نے اگرچہ دیگر شعرا کی طرح شعر کہے ہیں لیکن ان کا مقصد ایک حکومت کا قیام تھا، اشعار ان کے افکار کی تبلیغ کا ذریعہ تھے۔ اقبال جیسی شخصیتیں جو مختلف طبقات کے درمیان، انسانی سوسائٹی میں بندگانِ خدا کی بھلائی کے لئے کام کرتی ہیں، جن کے مقاصد قوم کے مقاصد ہیں اور جو مکتبِ انبیا کی تربیت یافتہ ہیں، حتمی طور پر "خادمینِ بشریت" کی صفِ اوّل میں جگہ پاتی ہیں۔ بقولِ سرمد، اقبال ان رجال میں سے تھے جنھوں نے مکتبِ توحید میں رازِ نبوت اور انسانی کامیابی کا بھید پایا اور شاعری کے ذریعے لوگوں کو "حقِ حیات" اور "رمزِ حکومت" سے آگاہ کیا۔ یہ اقبال ہی کا معجز آسا اور روح پرور کلام تھا جس نے مسلمانوں کے گم کردہ راہ قافلے کے لئے بانگِ درا کا کام کیا، ناقۂ اسلام کی زمام پاک لوگوں کے ہاتھ میں دی اور اسی طرح ایک عظیم مملکت (پاکستان) وجود میں آئی۔ ایسی شخصیت فقط شاعر ہی نہیں بلکہ اسلامی سوسائٹی کے مربیوں اور بانیوں میں سے ہے جس کا ہمیشہ زندہ رہنے والا نام تا بہ ابد صفحاتِ تاریخ کے لئے زینت کا سبب ہوگا۔

"دانای راز"

خدای عالمیان چون بنای خلقت کرد — نظامِ عالمِ خلقت بحکمِ فطرت کرد
من این حقیقتِ فطری، بطبع دانستم — کہ ہرچہ کرد خدا در خورِ طبیعت کرد
چو در سرشتِ بشر خوی اجتماعی دید — طبیعتِ بشری، تابعِ جماعت کرد

طبایع آدمیان چون باختلاف افتاد　　هر آدمی، بطریقی بخلق خدمت کرد
یکی طریق تجارت سپرد و مال اندوخت　　که بذل مال توان کرد و کسب شهرت کرد
یکی طریق زراعت سپرد و بذر افشاند　　که می توان به زراعت وفور نعمت کرد
یکی بعلم گرائیده بر هنر افزود　　وزین طریق هنر با بعلم و صنعت کرد
ولیک زین همه یک تن بمرد حق نرسید　　که از گروه پراگنده جمع امت کرد
هزار منعم و مفلس فدای یکتن باد　　که بعث ملت و دولت بیمن همت کرد
من این فضیلت در شان انبیا دیدم　　که جز نبی نه کسی درک این فضیلت کرد
فضیلت نبوی در لیاقت کس، الّا　　که کسب معرفت از مکتب نبوت کرد

اگر بصفحهٔ تاریخ بنگری، بلبینی　　بسا کسا که بصورت بنای دولت کرد
هزار صاحب ثروت بقدرت زر و زور　　بساط عیش فگند و بنای عشرت کرد
هزار طالب شهرت بفکر شیطانی　　فریفت جامعه و فتنه در سیاست کرد
هزار حاکم مطلق، بدین گمان که توان　　بخلق روی زمین تا ابد حکومت کرد
نشست در پس دیوار آهنین بغرور　　بدین گمان که مسخّر جهان قدرت کرد
عجب که چون بسر آمد حیات صورتشان　　کسی نبود تو گوئی که یاد صحبت کرد
حیات شان همه نقش بر آب شد چو حباب　　که چون حباب شکست آنکه نقش صورت کرد
ولیک مرد خدا را خدای مرگ نداد　　مگر که قالب صورت بدل بسیرت کرد
حیات مرد خدا در حیات ملتها ست　　که مرد حق سر و جان در حیات ملت کرد

اگر شنیده ای این داستان که در تاریخ　　کسی تواند یا دولتی که رجعت کرد
دگر بگوش تو خوانند انبیا و رسل　　که حق بخلق خدا وعدهٔ قیامت کرد
همه، ز رجعت حق در قیامت ملّی　　حقیقتی است که هر کس از آن روایت کرد
نشان رجعت حق بین بخاک پاکستان　　که حق بدولت خود بازگشت و عودت کرد
لوای دعوت اسلام بر سر پاکان　　فراشت رایت اقبال و بعث دولت کرد

درود باد بر اقبال و معجز سخنش　　که معجز سخنش عالمی بحیرت کرد
ز خاک مرده بر آورد چشمه سار حیات　　وز آن حیات ابدجست و خرق عادت کرد
دم از خودی زد و بیگانه راند از بر خویش　　یکی بجز در سد آنکو نه جز حق اطاعت کرد
نبود شاعر، بل موجد حکومت بود　　سرود شعر و لی شاعری وسیلت کرد
مشیت ازلی بر مراد ملتها ست　　که در ارادهٔ ملت حق این مشیت کرد

درود باد بہ دانای راز پاکستان | کہ خلق را ز خود آگہ بسرِّ وحدت کرد
درود باد بہ امروز و صاحبِ امروز | کہ روزگار بنامش صحیفہ زینت کرد
درود باد بہ اقبال و جانِ حق طلبش | کہ ہر چہ کرد بحق کرد و با حقیقت کرد

ایک نظم "سرودِ خرد" میں شعرا کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اقبال از آن قبیل سخن گستران نبود | کاندر بہار وصفِ گل و نسترن کنند
اقبال از آن گروہِ حقیقت شعار بود | کز بہرِ حق مجادلہ با اهرمن کنند
اقبال بت شکست و خدا جای بت نشاند | زان مسلمین ستایش آن بت شکن کنند
از حق درود باد بہ اقبال و خدمتش | و آنانکہ یادِ خدمتِ او انجمن کنند

آقائے علی دشتی موجودہ دور میں چوٹی کے عالم، ادیب اور سیاستدان ہیں۔ ان کی کئی کتابیں "قلمرو سعدی"، "نقشی از حافظ"، "سیری در دیوان شمس" اور "شاعر دیر آشنا" وغیرہ خاصی شہرت حاصل کر چکی ہیں۔ جن دنوں وہ بیروت میں ایران کے سفیر کبیر تھے وہاں انھوں نے یوم اقبال کے موقع پر عربی میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

اقبال کی عظمت ان کے شعروں کی کثرت کے سبب نہیں بلکہ اس وجہ سے ہے کہ وہ ایک پُرغوغا اور متلاطم روح رکھتے تھے۔ کارلائل نے ایک جگہ لکھا ہے کہ استصواب کیا جائے کہ ہندوستان، انگلستان کا حصہ بنے یا شیکسپیئر، تو تمام انگریز شیکسپیئر کو ترجیح دیں گے، اس لئے کہ ہر قوم اپنے لئے کسی ستائش کے سامان کی حاجتمند ہوتی ہے۔ پھر بھلا اہل پاکستان کے لئے اقبال جیسے مرد شایستہ سے بڑھ کر اور کون (سامانِ ستائش) ہو سکتا ہے کہ جو آج ایران میں قابلِ احترام سمجھا جاتا ہے اور کل تمام دُنیا میں موردِ احترام ٹھہرے گا۔ اور گویا انھوں نے اس بات کو خود ہی محسوس کر لیا تھا جو یہ کہا:

نوای من بہ عجم آتش کہن افروخت | عرب ز نغمۂ شوقم ہنوز بے خبر است

آقائے تقی زادہ ایران کے نہ صرف ایک روشن فکر سیاستدان اور محبِ وطن ہیں بلکہ علمی و ادبی دنیا میں بھی انہیں بلند مقام حاصل ہے۔ ان کا شمار ان راہنماؤں میں ہوتا ہے جنھوں نے فارسی زبان کی اصالت کو قائم رکھنے پر زور دیا۔ اقبال پر اپنی ایک تقریر میں کہتے ہیں:

میں ابتدائے زندگی ہی سے اس صاحبِ افکار (اقبال) کے اصل عقاید سے یعنی:

"چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا | مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا"

سے کچھ نہ کچھ بہرہ ور ہوں اور اسلامی ممالک کے قرب و اتحاد کا خواہشمند ہوں۔
دنیائے اسلام کے اتحاد کا سیاسی عقیدہ بطورِ کُلّی اقبال سے پہلے کی پیداوار ہے
اور یہ عقیدہ بھی زیادہ تر ہندوستان ہی کے مسلمانوں میں اشاعت پذیر ہُوا، اور
اس کے بڑے پرجوش حامی پیدا ہوئے جن میں سیّد جمال الدین افغانی
سرِفہرست ہیں ...... تاہم اقبال کے جوش و ولولہ اور تاثیرِ نفس نے اس
عقیدہ کو نہ صرف ایک زبردست زندگی اور رونق بخشی بلکہ اسے ایک نئے
قالب میں ڈھالا۔ اور اب بھی یہ تحریک پاکستان میں مستقل طور پر آگے بڑھ
اور پھیل رہی ہے ....... اقبال کی کوششیں کہ مسلم اقوام کے درمیان ہر
قسم کے جاہلانہ اور کوتہ نظرانہ تعصبات مٹائے جائیں اور اسلامی اتحاد کے عقاید
اور اسلامی ممالک میں زیادہ سے زیادہ قربت و یگانگت پیدا کی جائے نہایت
پسندیدہ اور لازم ہیں۔ اور اس کی اس آرزو تک پہنچنے کے لئے کہ دنیائے
اسلام کا مرکز جینوا کی بجائے تہران ہو، اس کے ابتدائی اقدامات کی کوشش
بہرصورت مفید ہے۔
مجھے اُمید ہے کہ یہ تحریک مسلسل زور پکڑے گی اور اقبال کی روح اور
بھی خوش ہوگی"۔

علامہ دہخدا مرحوم (م ۱۹۵۶ء) محقق و فاضل اجل تھے۔ لغت پر انہیں بیحد عبور تھا۔ الفاظ کی تحقیق و تدقیق ان کا شیوہ تھا۔ بہت سی ضخیم تصنیفات و تالیفات ان سے یادگار ہیں جن میں سے لغت نامہ اور امثال و حکم وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ شعر بھی کبھی کبھار کہہ لیا کرتے تھے۔ چنانچہ اقبال سے اپنی عقیدت کا اظہار انھوں نے اشعار ہی میں کیا ہے:

زانگونہ کہ پاکستان با نابغۂ دوراں　　اقبال شہیرِ خویش بر شرق ہمی نازد
زیبد وطنِ ما نیز بر خویش ہمی نازد　　واندر چمنِ معنی چوں سرو سرافرازد
زاں روی کہ چوں اقبال خواہد کہ سخن گوید　　گنجینۂ قلبِ خود یا گفتہ بپردازد
از بعدِ وطن تاشاں کس را بجز ایرانی　　شایستہ نہ بیند تا با وی سخن آغازد
دُرہای ثمینِ خود در دُرج دری ریزد　　از بہتہ این میداں ہر لا نگہ خود سازد

(جس طرح پاکستان کو اپنے مشہور نابغۂ دوراں اقبال پر ناز ہے اسی طرح ہمارے وطن کو یہ زیب دیتا ہے کہ وہ اپنے اوپر ناز کرے اور چمنِ معنی میں سرو کی طرح سربلند ہو۔ کیونکہ جب اقبال کوئی بات کہتا یا اپنے دل کا خزانہ باہر لانا چاہتا ہے تو وہ اپنے ہموطنوں کے بعد سوا ایرانیوں کے اور کسی کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ اسے مخاطب کیا جائے۔

وہ اپنے بیش بہا موتی فارسی کی ڈبیا میں ڈالتا اور اس میدان (فارسی) کی وسعت کو اپنی جولانگاہ بناتا ہے)

ادیب برومند ایران کے مشہور شعرا میں سے ہیں انھوں نے علامہ اقبال کے متعلق کتنے ہی قصائد لکھے ہیں اور کئی اشعار میں ان کے پیغام کو منظوم کیا ہے ۔ ایک جگہ حقیقت شعار شعرا کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

شاعر وہ ہوتا ہے جو رموز دہر کے کشف کے لئے مکاشفہ کی راہ اختیار کرکے پاؤں سے طے کرے ، قوم کی رشد و ہدایت اس کا مقصود ہو اور ملک کی سربلندی کے لئے اس کا شیوۂ محمود کام کرے ۔ چنانچہ :

اقبال بود شاعری آزادہ زین قبیل — درخورد مدح و قابل تحسین بہر دیار
در خاوران بنام نکو گشت مشتہر — در باختر بفضل و ادب یافت اشتہار
در راہ و رسم بود چو مردان راہ حق — حق گوی و حق پرست و حق آیین و حق گزار
سر مشق جان ز مکتب خیر خدا گرفت — کلکش گرفت در رہ حق رسم ذوالفقار
بنیان گزار ملک نوین شد بنظم نو — آنکس کہ نظم اوست یکی آہنین حصار
اقبال باد مورد اقبال مردمان — وندر بہشت درخور الطاف کردگار

ادیب برومند کا ایک اور قصیدہ ملاحظہ ہو :

امروز با قبال قوای یار فسون کار — اقبال ہمی باید م و زمزمۂ تار
امروز با قبال تو خوش بادہ خورم تلخ — ای دلبر شیرین سخن نادرہ گفتار
در دہ دو سہ جامی کہ بنوشم من و زان پس — یک لحظہ زینجاب سرایم سخن ای یار
آنجا کہ در او اختر اقبال فروزان — آنجا کہ در و پرتو اسلام پدیدار
آنجا کہ از و خاست یکی مرد گرانسنگ — آنجا کہ در و رست یکی نخل گرانبار
زان مرد نکو نام زمان راست ہمی فخر — زان نخل برومند زمین راست ہمی بار
ہمنام محمدؐ ہنر آموز حکیمی — دلباختۂ ختم رسل احمد مختار
فرزانہ و دانشور و نام آور و محبوب — آزادہ و بینا دل و نیک اختر و ہشیار
اندوخت بسی علم و سخندانی و حکمت — آموخت بسی فضل و ہنرمندی و رفتار
شد شاعر آزادہ و دریا دل و فیاض — از وسعت اندیشہ و از طبع گہر بار
شد شاعری آنگونہ کہ در ہند سراسر — کردند باعجاز کلامش ہمہ اقرار

. . . . . . . . . . . . . . . . — . . . . . . . . . . . . . . . .

خوش نغمہ گر گلشن رومی شد و دریافت — از ساخت اندیشۂ او نزہت گلزار
یکبارہ بخدمت گری خلق کمر بست — تا باز رہاند وطن از سلطۂ اغیار

بس کرد بسیج از رہ گفتار کسا نرا | بر ضد بریطانی یغما گر مکار
و آنام تجسید درایں مرحلہ تا کرد | آوای نجاتش ہمہ را یکسرہ بیدار
چون دید کہ در ہند دل مسلم و ہندو | پیوند محبت نپذیرفت بنا چار
یکبارہ صلا داد کہ اقوام مسلمان | باید کہ در آیند بیک حلقہ و یک دار
این گفت و پس از مرگ وی این کشتہ ثمر داد | با ہمت مردان ظفرمند و فدا کار
و ندر صف میدان بجناح وطن و دین | گردید "جناح" از پی این نقشہ علمدار
زین نقشہ پدیدار شد آن کشور نو خیز | کان خطہ پاکستان شد شہرۂ اقطار

۱۹۶۲ء میں مشہد میں یوم اقبال کے موقعہ پر مشہد یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر اسماعیل بگی نے کہا:

"ایسا کم ہی اتفاق ہوا ہے کہ ایک شاعر بزرگ، عظیم فلسفی اور قانون دان بزرگ اپنی قوم کے احترام و اکرام کا اس قدر مورد ٹھہرے کہ اس کی یاد میں سرکاری طور پر تعطیل منائی جائے اور تمام روئے زمین پر جہاں جہاں بھی اس کی قوم کے افراد ہوں، وہ اکٹھے ہو کر اس کی یاد میں مجلسیں بپا کریں اور اُن علاقوں کے لوگوں کو بھی ان میں شریک کریں۔ محمد اقبال لاہوری ایک ایسی شخصیت ہیں جو اس سلسلے میں دنیا میں اپنی مثال نہیں رکھتے۔ اقبال ایران و پاکستان کے درمیان تعلقات کی زنجیر کا سب سے بڑا حلقہ ہیں۔ بلکہ جرأت کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال لاہوری اور ان کے اشعار و افکار ہم ایرانیوں اور پاکستانیوں کے درمیان ایک وجہٴ اشتراک ہیں"۔

حبیب یغمائی ایران کے مشہور شاعر و ادیب اور مشہور ادبی مجلّہ "یغما" کے مدیر ہیں۔ انھوں نے اپنے ایک قصیدے میں اقبال کو یوں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

زندہ ماند سخنورے کہ وُرا | دقتِ فکر ہست و لطفِ خیال
اسخ شاعر بود بہ نیروی فکر | اوج طائر بود بقوتِ بال
سخنی کان ز حکمتی است تہی | میوہ ای ہست نارسیدہ و کال
حکمت آموزی آن کند کہ وُرا ست | طبع موّاج و فکرتِ جوّال
بجہان شور افگند آن کو | دلش از عشق گشت مالامال
مستمع را فزود حسن اثر | متکلم چو داشت حسن مقال
...... ........ | ...... ........
گفت دانا کہ چون بنی ملہم | ہست شاعر ز ایزدِ متعال

شاعرانند چون پیامبران — در بیان و فضایل و اقوال
از کلام محمدی است اثر — در کلام محمد اقبال
پارسی گو حکیم پاکستان — پاک جان پاک شیوه پاک خصال
نکتہ بکر بش بکتہ بجبر عظیم — شعر نغز بش بلطف آب زلال
دین اسلام را نموده شرف — مردم شرق را فزوده جمال
چارۂ جوئی کند بخیر و صلاح — کہ گراید بشر براه کمال
و اتحاد ممالک اسلام — ہست او را ز جملۂ آمال

.............. ..............

"روز اقبال" یعنی امروز است — کہ رسیدش ز حق نوید وصال
وین چنین روز را علی التحقیق — بغراید شکوه در ہر سال

صاحبِ طرز اور اعلیٰ پائے کے ادیب شجاع الدین شفا، اقبال کی تصانیف پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

عصر حاضر میں مرحوم اقبال کی معجز آسا اور انقلاب انگیز تصنیفات نہایت
عمدہ طرز میں مثنوی مولانا روم کے معنوی نفوذ اور (ان کی) زبان کی تاثیر
کی نشاندہی کرتی ہیں"

ایران میں "انجمن ادبی ایران و پاکستان" کے صدر اور مشہور ادیب و شاعر ڈاکٹر ناظر زادہ کرمانی کا کہنا ہے:

"محمد اقبال از مبلغانِ گرامی اسلام و از مبشرانِ نامی شرق است"

کاظم رجوی بھی ایک مشہور شاعر ہیں انہیں "اقبال شناس" (ماہر اقبالیات) سمجھا جاتا ہے۔ ان کے مطابق اقبال کے تمام افکار و رجحانات وغیرہ میں مولانا روم رح، سعدی رح اور حافظ رح نے تجلی کی ہے۔ ان کا ایک قصیدہ ملاحظہ ہو۔

آفرین بر ملک پاکستان و بر اقبال او — آنچنین بنیان گذار کاخ استقلال او
شاعری کز گفته اش بر ملتِ خود جان دمید — برد بر اوج ثریا پایۂ اقبال او
غوطه در شد در دل دریای ماضی سالہا — تا ز طوفان برد بیرون رخت استقبال او
جان پاکان را ز دام جور ناپاکان رہاند — جامہ ہستی بپوشانید بر آمال او
برگروه خود شناسانید ز "اسرار خودی" — آنچه پنہان است اندر جوہر فعال او
تا نہ پندارد کہ جام جم بدست دیگری است — باده نابی است ہم در جام مالا مال او
از "پیام شرق" او دنیای مشرق جان گرفت — تافت خورشید رشاد از مشرق اقوال او

.............. ..............

گفت اقبال ای بسا شاعر کہ بعد از مرگ او — این سخن حق است در حق وی و ابدال او

چون مسافرِ سیر در آفاق و انفس میکند    "بالِ جبریل" است گوئی فکرِ زرین بالِ او
می ستاید اندر دل و جان دینِ حق مصطفیٰ    می سپارد راهِ نیک مرتضیٰ و آلِ او
"مولویؒ و سعدیؒ و حافظؒ" تحلیل کرده اند    در همه افکار و در آمال و در امیالِ او
"حکمت یزدانی ایمان زمین" چون مطلعی است    کز همه تابنده تر زان اخترِ اقبالِ او
شاعران را باید از اندیشهٔ او پیروی    تا بار آید ز اقوال همه افعالِ او
ملتِ پاکستان همه چیزِ خود از "اقبال" یافت    چون سرودِ او شنید و رفت از دنبالِ او
بر بیانِ نغز و فکرِ یکسا اقبال است و بس    کاخِ استقلالِ پاکستان و استکمالِ او
نامِ پاکستان از این فرزندِ رادش زنده شد    زنده می دارند آری نام را اطفالِ او
بس در و د از من برایِ اقبالِ پاکستان که شد    نامِ پاکان زنده از آلام و از آمالِ او

آقائے عباس فرات نے اقبال سے اپنی محبت کا اظہار اس طرح کیا ہے:

ز اقبال، پاکستان کنون رخشنده در کیهان نگر
خندرشک خلد این سرزمین اقبال این سامان نگر
آن قائد فرخنده خوی، آن شاعرِ زیبنده گوی
افزود ادب را آبروی الطاف بی پایان نگر
جاوید ماند ملتی کاندر طلب کوشد همی
بنگر بپاکستان دمی اقبالِ جاویدان نگر

ایک اور جگہ کہتے ہیں:

گو بپاکستانیان ای خوشخبر احوالِ شما    چه خوش بود اقبال با مشیب ز اقبالِ شما
مرغِ اقبالِ شما راشد نشیمن بامِ چرخ    او همای عزت و رفعت پرد بالِ شما
گشت از فضل و کمالِ اقبالتان مشهورِ دهر    عزت و اقبال ازان باشد کنون مالِ شما

آقائے احمد مصدق اپنے ایک مضمون "افکار انقلابی علامہ اقبال" میں لکھتے ہیں کہ

"آغاز میں ادبی رسالوں اور اخباروں میں اقبال کے نام سے چھپے ہوئے اشعار کبھی کبھار میری نظر سے گزرتے تو میں یونہی پڑھ کر آگے گزر جاتا کہ یہ بھی کوئی ایسا ویسا شاعر ہوگا۔ لیکن وہی بات کہ چاند ہمیشہ بادلوں میں نہیں چھپا رہتا، جلد ہی میں اس عظیم انسان سے شناسا ہو گیا۔

میں اقبال کو شاعر، فلسفی، دانشمند، عارف اور ادیب سے قبل عصرِ حاضر کا ایک مردِ انقلابی جانتا ہوں۔"

ڈاکٹر قاسم رسا نے اقبال پر ایک قصیدہ لکھا ہے اس میں ان کو ان الفاظ سے یاد کیا ہے کہ لاہور سے ایک ایسے درخشندہ ستارے نے طلوع کیا جس پر پاکستان کو ناز ہے۔ اس نے نہ صرف پاکستان بلکہ ہندوستان کو بھی آبرو بخشی۔ اور وہ :

شاعرِ شیریں کلام و نکتہ سنج　　　عارفِ روشن دل و پاکیزہ خو
آفریں بر آں سخن داں کز سخن　　　در جہان بگذاشت آثارِ نکو
آبیاری کرد خاکِ ہند را　　　تاکہ آبِ رفتہ باز آید بجو
آنکہ استقلالِ پاکستان دہند　　　در جہانش بود تنہا آرزو
در دلِ عشاق سوزِ خامہ اش　　　آتشِ عشقست نشیند فرو

(عشاق کے دلوں میں اس کے قلم کا سوز ایک ایسی آتشِ عشق ہے جو بجھتی نہیں)

سالکِ راہِ حقیقت بود و گشت　　　از پیِ عطار و رومی کو بکو
در سخن از شاعرِ مغرب زمین　　　شاعرِ مشرق زمین بربود گو

(شاعری میں سرزمینِ مشرق کا شاعر (اقبال) یورپ کے شاعر (گوئٹے) سے بازی لے گیا)

ہر کہ او چوں زندہ گرداند سخن　　　در جہاں ہرگز نمیرد نامِ او

۲۶ر اپریل ۱۹۶۲ء کو ملتان میں یومِ اقبال منایا گیا۔ اس تقریب کی صدارت ایران کے سفیرِ اعلیٰ نے کی۔ انھوں نے اقبال کی شاعری پر مختصر سی تقریر کی اور آخر میں بتایا کہ اقبال ایرانیوں کے یہاں بھی بے حد مقبول ہیں۔ اور عصرِ حاضر کے تمام ادبا و شعرائے بزرگ ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔

مولانا روم اور اقبال کے طرز میں لکھی ہوئی اپنی ایک مثنوی میں ایران کے شاعر ارجمند آقائے احمد گلچین معانی، اقبال کے فلسفہ و عقاید کے متعلق لکھتے ہیں :

بشنو از آں فیلسوفِ پاک زاد　　　مولویِ ثانی آں اقبال راد
کز خودی دارد جہاں نام و نشاں　　　جز خودی چیزی نپاید در جہاں
تا نیابی معرفت بر نفسِ خویش　　　رہ نیابد نفسِ تو گامی بہ پیش
ہر کہ نفسِ خویشتن تسخیر کرد　　　می تواند چارۂ تقدیر کرد
زندگی یعنی دمادم خواستن　　　تر[1] قناعت پیشگی کم خواستن
آرزو کن کارزو مقصود جوست　　　در جہاں عقل و خرد مخلوقِ اوست
آرزومندی ترا بخشد حیات　　　ترکِ عشق و آرزو یعنی ممات
تنگ بگرفتی جہاں را چوں قفس　　　شیوۂ اقوامِ مغلوب است و بس
بال و پر بگشای و در پرواز باش　　　چوں ہزار آوا بلند آواز باش
گر نخواہی تا خودی گردد حقیر　　　خود مشو زاحسانِ کس منت پذیر

[1] تراز

مقصد از خودجوئی و راه از خویشتن ❊ ز آنچہ می خواہی بخواہ از خویشتن
در بلا بگریز و خود را رخنہ کن ❊ با حوادث پنجہ اندر پنجہ کن

اس کے بعد حکیم الامت کا یہ شعر تضمین کے طور پر لائے ہیں:

"از بلا پختہ تر گردد خودی ❊ تا خدا را پردہ در گردد خودی"
بستر ہستی عشق دان و آرزو ❊ کآدمی خود نیز صورت بست از او
از محبت کن خودی را زندہ تر ❊ زندہ تر تابندہ تر سوزندہ تر

این حدیث از نغز و جاویدانی است
فلسفہ اقبال پاکستانی است

ایک رباعی میں کہتے ہیں کہ کب تک اپنے آپ سے دور رہ کر وجود کے معاملے میں سستی برتی جائے۔ اقبال کی بات سنو جو کہتا ہے کہ خود کو پہچانو، خودی کے وسیلے ہی سے خدائی کی جا سکتی ہے:

تا چند ز خویشتن جدائی کردن ❊ در کار وجود سست رائی کردن
ز اقبال شنو کہ گفت خود را بشناس ❊ کز راہ خودی توان خدائی کردن

آقائے مجتبیٰ مینوی، اقبال کی شاعری پر ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ "جب تک میں نے محمد اقبال کی تصنیف و تالیفات کا مطالعہ نہیں کیا تھا، میں یہ نہیں جانتا تھا کہ آخر مسلمانان ہند اقبال کے بارے میں اس قدر زیادہ مبالغے سے کام کیوں لیتے ہیں۔ لیکن اب میں نے تصانیفِ اقبال دیکھ لی ہیں، میں انہیں اس سلسلے میں حق بجانب جانتا ہوں یعنی وہ مبالغہ سے کام نہیں لے رہے اور اس کے متعلق ان کا اعتقاد ہے اور یہ کہ

"اقبال شاعر قادر، حکیم بلند فکری بود کہ خود اہل کار و کوشش و زندگی بود، و میخواست کہ دیگران را نیز بکار و کوشش وادارد و از معنای زندگی متحضر سازد......"

اس کے کلام میں اس قدر قوت و تاثیر تھی کہ اس امر کے باوصف کہ اس نے رسالت کا دعویٰ نہیں کیا اور آج کروڑوں مسلمانان ہند اسے "فرستادہ خدا" نہ جانتے ہوئے بھی اس کا اسقدر احترام کرتے ہیں جتنا کہ ایک صاحبِ الہام نبی اور صاحب کتاب پیغمبر کا اس کے پیرو کرتے ہیں ........
جس وقت میں اس کی زندگی کے تمام مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالتا ہوں تو میں یہ دیکھتا ہوں کہ پچھلے سو برس میں ایران میں مسلمہ طور پر کوئی ایسی شخصیت نہیں گزری جو من حیث المجموع محمد اقبال کی برابری کے قابل ہو اور ہوسکتا ہے دوسرے مشرقی ممالک بھی اس سلسلے میں ہماری طرح ہوں......"

آقائے علی خاوَری نے یوم اقبال کے ایک موقع پر ۵۵ شعروں کا قصیدہ "اقبال" پڑھا۔ اس میں کہتے ہیں:

روز اقبال است روزی دلکش و رعنا بود
جشن در ایران و پاکستان از آن برپا بود
باز عشرت در دو کشور چون ہما گشود بال
بوم محنت را ازین رو عزلت عنقا بود

(یعنی عشرت نے دونوں مملکتوں میں ہما کی طرح پر کھولے۔ اس لئے رنج و غم کا اُلّو عنقا کی طرح گوشہ نشین ہو گیا ہے)

روز اقبال است و یک عالم ورا تقدیس خوان
چونکہ اندر فضل و حکمت عالمی یکتا بود

ان کے ایک اور قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

زہی بزرگِ ہنرور محمدِ اقبال    سپہرِ زہد و ورع مہر برج فضل و کمال
چکامہ ساز دری فیلسوف پاکستان    کہ بس حقائق تفصیل راند در اجمال
ہر آنچہ رفت، طریق نبی علیہ سلام    ہر آنچہ گفت پی کردگار جلّ و جلال
ہزار سالہ سیر کواکبش پرورد    دلی نظیر نمی آردش ہزاران سال
زبانِ اتیش از ہند و پہلویش سخن    بسی جمیل تعالی اللہ از کمال و جمال
معانیش بہ بیانِ بدیع زیور بخش    مطالبش بطراز عجیب ثروت سگال
ہمہ مقالش دلکش، ہمہ کلامش خوش    فہی خجستہ کلام و زہی گزیدہ مقال
بجای یوغِ اسارت بگردن ملّت    نہاد منّت آزادی احسن الابدال
شگفت چامہ سرائی بپارسی دری    کہ خد تصوّر آں عقل را خیال محال

آقائے مطیع الدولہ حجازی عصرِ حاضر کے ایک بلند پایہ انشا پرداز، افسانہ نویس اور ناول نگار ہیں کسی موقع پر حیدرآباد دکن آئے اور بطور سرکاری مہمان کے وہاں کچھ عرصہ رہے۔ دورانِ قیام وہ ایک دعوت میں گئے۔ راستے میں قدرتی مناظر نے ان کے دل کے تاروں کو چھیڑ دیا اور اس طرح وہ اپنے وطن کے دشت و کوہ، سبزہ اور پرندوں کی یاد میں کھو گئے"۔ ملک غلام محمد مرحوم جو ان دنوں دکن کے وزیر مالیات تھے، ان کے ساتھ تھے۔ انھوں نے حجازی کی اس کیفیت ذہنی کو بھانپ کر ان سے حال احوال پوچھا۔ حجازی نے ساری کیفیت بیان کر دی۔ غلام محمد مرحوم نے "تبسم محزون" کیا اور کہا کہ کاش! تم ہر جگہ اور ہر کسی کو اپنا دوست اور وطن سمجھتے۔ حجازی لکھتے ہیں کہ

"میں اس بات سے شرمندہ اور خود سے آزردہ ہوا کیونکہ میں نے دیکھا کہ مجھ میں اور اس مقام میں پرسوں اور کوسوں کا فاصلہ ہے۔ ہم اسی گفتگو میں مصروف تھے کہ ریڈیو کی آواز بلند ہوئی جو میرے دل بیمار کے لئے گویا شفا کا حکم رکھتی تھی۔ یہ فارسی کا پروگرام تھا اور ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم کا پر مغز کلام گایا جا رہا تھا۔ یعنی ندائے آسمانی تھی جو اس

بہشت آسا منظر کو میرا دوست اور ہمزبان بنا رہی تھی۔ ہاں! جہاں کہیں بھی کسی کی زبان میں شعر کہے جائیں وہی اس کا گھر اور وطن ہے۔ جو کوئی بھی ہماری زبان میں شعر کہے وہ ہمارا دوست، محبوب اور ہموطن ہے ......

"میں یہاں لاہور کے فارسی گو شاعر کے کمال و دانش اور روحِ بلند کے بارے میں بات نہیں کہوں گا۔ دوسروں نے ایسی باتیں کہی ہیں اور وہ صحیح طور پر حقِ ستائش بجا لائے ہیں۔ میں اس روانِ پاک (اقبال) کا شکرگزار ہوں کہ اس نے اس روز اور بعد کے دنوں میں مجھے ہندوستان میں خوش و خرم رکھا۔ میں ڈاکٹر اقبال لاہوری کا، کہ اس کی روح مسرت و شادمانی سے ہمکنار رہے، سپاسگزار ہوں کہ وہ اپنے افکارِ بدیع اور فارسی نغز سے ہمارے دوست اور برادر ملک کو، جو زوالِ فارسی کے سبب غیریت کی راہ اختیار کیے ہوئے تھا، دوبارہ ہماری محبت و دوستی کی راہ پر لے آیا۔"

۱۹۵۲ میں یوم اقبال کے موقع پر ڈاکٹر رجائی نے قصیدۂ ذیل پڑھا:

تا زِ پاکی در حقیقت در جہان عنوان بود — جاوداں اندر جہاں عنوان پاکستان بود
گفت دانا اسمہا از آسمان آید فرود — مرد دانا را سخن با حجت و برہان بود
کشوری پاکیزہ، خلقی پاک دل و پاکدل — نام پاکستان بُد از جانب یزدان بود

.............. ..............

یکسر مو نیست در فرہنگ ما ہم اختلاف — فارسی در فارس رایج ہمچو پاکستان بود
پارسی گویان لاہوری ندیدی روح بخش — تا نگوئی کاین کرامت خاص ایرانیان بود
اندریں دعویٰ مراد خلق را اقبال بس — ہر کرا اقبال باشد کوکبش تابان بود
گر شماری شاعران را افتخار شاعران — ور بہ استادان سخن گوئی ز استادان بود
کیست اقبال آنکہ رہ زی مشرب مقصود برد — وز عطایش جرعہ‌ای در ساغر رندان بود
ساحلِ افتادہ را کی نام ہستی درخور است — نام ہستی موج را زیبد کہ در جولان بود[1]

.............. ..............

گوید اقبال ار زِ اسرار خودی آگہ شدی — از رموز بیخودی جان و دولت رخشان بود

---

[1] "پیام مشرق" میں ایک نظم ہے "زندگی و عمل" (در جواب نظم ہائنا موسوم بہ سوالات) اس میں علامہ فرماتے ہیں:

ساحلِ افتادہ گفت گرچہ بسے زیستم — ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من چیستم
موج ز خود رفتہ تیز خرامید و گفت — ہستم اگر میروم، گر نروم نیستم

یہ اشارہ اسی طرف ہے۔

یعنی اوّل خویش را بشناس وانگہ خود شو — اندر آن ملت کہ تار و پودش از ایمان بود
کیست ملت ہر کہ جُوید فرقہ اسلامی است — وآن کسی کآبشخورش[1] از چشمۂ قرآن بود
بود سرمشقِ عمل اقبال و روحش شاد باد — آنکہ آثارش جہان تا ہست جاویدان بود
خرم آن مردی کہ وقتِ رستن آنسان زید — وز پس مرگش بگیتی نام او اینسان بود
مردم دانا و نادان را جدائی فرق چیست — مرد دانا باقی و فانی همی نادان بود

شاعر معروف آقائے منوچہر طالقانی نے اقبال کے بارے میں متعدد قطعات لکھے ہیں - ایک قصیدے میں وہ کہتے ہیں :

یک عمر من بہار بدینسان ندیدہ ام — این خرّمی بباغ و گلستان ندیدہ ام
چون طبع با طراوت اقبال در جہان — فصل بہار پُر گل و ریحان ندیدہ ام
بی شک "بہ دورِ فتنۂ عصرِ روان"[2] ازو — آگہ تری بہ مسلکِ قرآن ندیدہ ام

.................... ....................

ای اوستادِ حکمت وای کوکبِ دری — شمسی چو شمعِ پاکِ تو رخشان ندیدہ ام
اقبال کشوریست کہ اقبال آورد — وآن جُز برای کشورِ پاکان ندیدہ ام
بی شک ز مردمانِ جہان ہیچ کس ازو — مشتاق تر بملتِ ایران ندیدہ ام
حرفش بما ببین کہ جینوای[3] اہلِ شرق — گوید بہ از مدینۂ تہران ندیدہ ام

ڈاکٹر شکیبہ کاظمی ایران کی معروف ہستی اور مشہور ادیبہ ہیں - اقبال کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتی ہیں :

"اقبال کی شاعری میں فارسی شاعری کے مختلف دبستانوں کی پوری زیبائی و رنگینی سمٹ آئی ہے - جس وقت ہم اس ناسازگار ماحول کو دیکھتے ہیں جس میں

---

[1] آبشخور - گھاٹ

[2] علامہ کی اس رباعی کی طرف اشارہ ہے : -

چو رومی در حرم دادم اذان من — از و آموختم اسرارِ جان من
بہ دورِ فتنۂ عصرِ کہن او — بہ دورِ فتنۂ عصرِ روان من

[3] ضربِ کلیم میں ایک نظم ہے "جمعیت اقوام مشرق" - اس میں علامہ مرحوم نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

پانی بھی مسخّر ہے ہوا بھی ہے مسخّر — کیا ہو جو نگاہِ فلکِ پیر بدل جائے
دیکھا ہے ملوکیتِ افرنگ نے جو خواب — ممکن ہے کہ اس خواب کی تعبیر بدل جائے
طہران ہو گر عالمِ مشرق کا جنیوا — شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

اقبال زندگی بسر کر رہے تھے تو اس وقت ان کا فارسی شاعری کے مختلف و متنوع اقسام کو کامیابی سے نبھانا ایک علمی و ادبی معجزہ نظر آتا ہے۔

اقبال کی رباعیات، مثنویات غزلیات اور اخلاقی و ذکاہی قطعات ہمیں نہ صرف عظیم ترین شعرا اور عرفا کی یاد دلاتے ہیں بلکہ ان کی عظمت معنوی کے سلسلے میں ہمارے اشتیاق و شیفتگی کو دوبارہ بیدار کرتے ہیں لیکن جو چیز اقبال کی شاعری کو سب سے زیادہ دلپسند، فرح بخش اور روح پرور بناتی اور اس کی مقبولیت میں اضافہ کرتی ہے وہ ان کا ایجاز کلام، اختصارِ بیان اور طرزِ ادا اور مضامین کا تنوع و ابتکار ہے۔"

مختصر یہ کہ اب اقبال ایرانی ادبا میں بیگانے نہیں رہے۔ ہر روز ان کی مقبولیت و محبوبیت بڑھ رہی ہے۔ اس وقت تک ان پر بے شمار کتب و مقالات لکھے جا چکے ہیں۔ تہران یونیورسٹی میں اقبال پر تحقیقی مقالات لکھنے پر کئی ایک طلبا کو پی ایچ ڈی کی ڈگری مل چکی ہے۔ اس کے علاوہ وہاں کا شاید ہی کوئی نامور ادیب، شاعر اور سیاستدان ہوگا جس نے علامہ مغفور کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار نہ کیا ہو۔ ایسے لوگوں میں مذکورہ بالا شعرا و ادبا کے علاوہ ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا (محقق بزرگ، پروفیسر تہران یونیورسٹی) ڈاکٹر رضا زادہ شفق (پروفیسر تہران یونیورسٹی) ڈاکٹر مقتدری (سابق وزیر) ڈاکٹر منوچہر اقبال (سابق وزیر اعظم) آقائے عبدالحسین نوائی، ڈاکٹر معین، ڈاکٹر لطف علی صورت گر، آقائے صادق نشات، امیر فیروز کوہی، ڈاکٹر حسین خطیبی اور پاکستان میں ایران کے کئی ایک سفرائے کبیر کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

---

محمد عبداللہ قریشی

# اقبال اور انجمن کشمیری مسلمانان

یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ اقبال کی مجلسی زندگی کا آغاز ۱۸۹۶ء میں لاہور کے مشاعروں سے ہوا جو بھاٹی دروازہ کے اندر بازار حکیماں میں ۱۸۹۰ء سے انجمن مشاعرۂ اتحاد کے زیر اہتمام منعقد ہوتے تھے۔ اس سے قبل لاہور میں لوگ اقبال سے واقف نہ تھے[1] اس کے بعد قومی اجتماعات اور ملکی صحافت میں، ان کا نام عزت و احترام سے لیا جانے لگا۔ چنانچہ ۱۸۹۹ء میں اقبال نے 'نالۂ یتیم' کے عنوان سے، ۱۹۰۰ء میں 'یتیم کا خطاب ہلال عید سے' اور ۱۹۰۱ء میں 'ابر گہر بار' کے عنوان سے انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسوں میں چند غیر فانی نظمیں پڑھیں اور شیخ عبدالقادر نے اپنے رسالہ مخزن کے پہلے پرچے میں جو اپریل ۱۹۰۱ء میں جاری ہوا اقبال کی پہلی نظم ہمالہ شائع کی[2] لیکن اقبال کی روئداد زندگی نامکمل رہے گی اگر اس جگہ انجمن کشمیری مسلمانان لاہور کا ذکر نہ کیا جائے جو اقبال کو کشمیری برادری کے بزرگوں سے روشناس کرانے کا ذریعہ بنی اور پھر چراغ خانہ سے شمع انجمن بننے میں ممد و معاون ثابت ہوئی۔

اس کا علم شاید بہت کم لوگوں کو ہوگا کہ فروری ۱۸۹۶ء میں لاہور کی کشمیری برادری کے چند بزرگوں نے ایک 'انجمن کشمیری مسلمانان' کے نام سے قائم کی جس کے اغراض و مقاصد حسب ذیل تھے:

(۱) اصلاح رسوم شادی و غمی۔

(۲) کشمیری مسلمانوں میں تعلیم، تجارت، صنعت و حرفت اور زراعت کو رواج دینا۔

(۳) قوم میں اتحاد و اتفاق بڑھانا۔

اقبال اس وقت سیالکوٹ سے نئے نئے لاہور آئے تھے اور گورنمنٹ کالج میں بی۔ اے کے ایک ہونہار اور ذہین طالب علم تھے۔ وہ انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسوں میں شریک ہونے سے پہلے اس انجمن کی کارروائیوں میں سرگرم حصہ لیتے اور اس کی مجالس میں پرجوش نظمیں پڑھتے تھے۔ اس انجمن کے قیام پر پہلی مجلس میں اقبال نے ایک نظم پڑھی جو ان کے ولایت سے واپس آنے کے بعد مارچ ۱۹۰۹ء کے کشمیری میگزین میں ان کی نظر ثانی اور اجازت کے بعد شائع ہوئی۔

---

[1] مقدمہ بانگ درا از سر عبدالقادر مرحوم

[2] محمد احمد خان: اقبال کا سیاسی کارنامہ، ص ۱۷؛ نیرنگ خیال، اقبال نمبر، ص ۳۱-۳۲

وہ نظم یہ ہے:

کیا تھا گردش ایام نے مجھے محزوں        بدن میں جان تھی کہ جیسے قفس میں صید زبوں

چڑھائی فوج الم کی ہوئی تھی کچھ ایسی        علم خوشی کا مرے دل میں ہو گیا تھا نگوں

کیا تھا کوچ جو دل سے خوشی کی فوجوں نے        لگائے خیمہ تھی واں رنج کے جنود و قشوں

غم و الم نے جگر میں لگا رکھی تھی اک آگ        بنا ہوا تھا مرا سینہ رشک صد کانوں

زبسکہ غم نے پریشاں کیا ہوا تھا مجھے        یہ فکر مجھ کو لگی تھی کہ ہو نہ جائے جنوں

جو سامنے تھی مری قوم کی بُری حالت        اُمڈ گیا مری آنکھوں سے خون کا سیحوں

انہی غموں میں مگر مجھ کو اک صدا آئی        کہ بیت قوم کی اصلاح کے ہوئے موزوں

پئے مریض یہ اک نسخہ مسیحا تھا        کہ جس کو سن کے ہوا خوشی سے دل مشحوں

غبار دل میں جو تھا کچھ فلک کی جانب سے        دبے اسی میں غم و رنج صورت قارون

ہزار شکر کہ اک انجمن ہوئی قائم        یقیں ہے راہ پہ آئے گا طالع واژوں

ملے گا منزل مقصود کا پتا ہم کو        خدا کا شکر کہ جس نے دئے یہ راہ نموں

ہلال وار اگر منہ میں دو زبانیں ہوں        ادا نہ پھر بھی ہو شکر خدائے کن فیکوں

مثال شانہ اگر میری سو زبانیں ہوں        نہ طے ہو زلف رہ شکر ایزد بیچوں

چلی نسیم یہ کیسی کہ پڑ گئی ٹھنڈک        چمن ہوئی مرے سینے میں نار سوز دروں

یہ کیا خوشی ہے کہ دل خود بخود یہ کہتا ہے        بعید رنج سے اور خوشی سے ہوں مقروں

خوشی سے آ کے خدا جانے کیا کہا اس نے        اچھل رہا ہے مثال تموج جیحوں

کرم سے اس کی وہ صورت فلاح کی نکلی        کہ صحن قوم ہر اک شر سے ہو گیا مصئوں

خدا نے ہوش دیا متفق ہوئے سارے        سمجھ گئے ہیں تری چال گنبد گردوں

چراغ عقل کو روشن کیا ہے ظلمت میں        ہمارے ہاتھ میں آ جائے گا دُر مکنوں

مزا تو جب ہے کہ ہم خود دکھائیں کچھ کر کے        جو مرد ہے نہیں ہوتا ہے غیر کا ممنوں

بڑھے یہ بزم ترقی کی دوڑ میں یارب        کبھی نہ ہو قدم تیز آشنائے سکوں

اسی سے ساری امیدیں بندھی ہیں اپنی کہ ہے        وجود اس کا پئے قصر قوم مثل ستوں

دعا یہ تجھ سے ہے یارب کہ تا قیامت ہو        ہماری قوم کا ہر فرد قوم پہ مفتوں

جو دوڑ کے لئے میدان علم میں جائیں        سبھوں سے بڑھ کے رہے ان کے فہم کا گلگوں

کچھ ان کو شوق ترقی کا حد سے بڑھ جائے        ہماری قوم پہ یارب وہ پھونک دے افسوں

دکھائیں فہم و ذکا و ہنر یہ اوروں کو        زمانے بھر کے یہ حاصل کریں علوم و فنوں

جو تیری قوم کا دشمن ہوا اس زمانے میں  اسے بھی باندھ لے اقبالؔ صورت مضموں

یہ نظم اگرچہ بالکل ابتدائی مشق کے زمانے کی ہے اور اس کا انداز بھی پرانا ہے تاہم اس میں ماضی و حال کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں اور مستقبل کے لئے ایک پیغام بھی موجود ہے۔ مگر یہ انجمن تھوڑا عرصہ قائم رہ کر ۱۸۹۷ء کے وسط میں بند ہو گئی اور دسمبر ۱۹۰۱ء میں کشمیری گزٹ لاہور کی تحریکوں سے دوبارہ زندہ ہوئی۔ یہ ماہانہ گزٹ چوہدری جان محمد گنائی نے ستمبر ۱۹۰۱ء میں منشی محمد الدین فوق کی ادارت میں جاری کیا تھا اور کشمیری قوم کا ترجمان تھا۔

انہی دنوں کا ایک واقعہ ہے کہ کارکنانِ انجمن کے پاس چھ تارہ ضلع سیالکوٹ سے کسی صاحب نے شکایت کی کہ ایک تحصیلدار نے اپنے کسی فیصلے میں کشمیریوں کے متعلق لکھا ہے کہ وہ بڑے فسادی اور بہادر ہوتے ہیں۔ فسادی کا لفظ مٹانے اور ہٹانے کے لئے اس فیصلے کے خلاف انجمن کو اپیل دائر کرنی چاہیئے۔ اقبالؔ اس وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم۔اے کے طالب علم تھے آپ نے اس بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ "میں تو اس فیصلے کے خلاف اپیل کرنے کے حق میں نہیں ہوں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جو قوم فساد کرنا نہیں جانتی وہ بہادر نہیں ہو سکتی۔ میرا مطلب فساد سے بہادری کی سپرٹ ہے[1]۔ اگر آپ بہادر اور شجاع نہیں کہلانا چاہتے تو بے شک اس فیصلے کے خلاف اپیل دائر کریں"۔ اس رائے کو سب نے پسند کیا اور آخر اپیل دائر کرنے کی تجویز مسترد کر دی گئی۔

دسمبر ۱۹۰۱ء کے کشمیری گزٹ لاہور میں اقبالؔ کے چند قطعات بھی ملتے ہیں جو انھوں نے انجمن کشمیری مسلمانان لاہور ہی کے کسی اجلاس میں پڑھ کر سنائے تھے۔ ملاحظہ ہوں:

کہکشاں میں آ کے اختر مل گئے  اک لڑی میں آ کے گوہر مل گئے
واہ وا کیا محفل احباب ہے  ہم وطن غربت میں آ کر مل گئے

---

ظلم سہتے ہیں وطن اپنا نہ جن سے چھٹ سکا  شکوۂ حکام پھر اے دل نہیں تیرا بجا
کیا عجب کشمیر میں رہ کر جو ہے اہل پر جفا  پائے گل اندر چمن دائم بُراست از خارہا

---

سامنے ایسے گلستاں کے کبھی گر نکلے  جیب خجلت سے سر طور نہ باہر نکلے
ہے جو ہر لحظہ تجلی گہ مولائے جلیل  عرش و کشمیر کے اعداد برابر نکلے

---

[1] فساد کا لفظ ان معنوں میں کبھی استعمال نہیں ہوا نہ اردو میں نہ عربی میں۔ قرآن مجید میں بھی جہاں کہیں یہ لفظ آیا ہے اس سے بھی اقبال کے خیالات کی تائید نہیں ہوتی بلکہ "فسادی" کہہ کر تحصیلدار کی نیت کشمیریوں کی تعریف کرنا نہیں تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات اس وقت ایک لطیفے کے طور پر بیان کی گئی جو چل گئی اور حاضرین نے اسے پسند کیا۔

موتی عدن سے لعل ہُوا ہے یمن سے دُور · یا نافۂ غزال ہُوا ہے ختن سے دُور
ہندوستان میں آئے ہیں کشمیر چھوڑ کر · بلبل نے آشیانہ بنایا چمن سے دُور

---

کشمیر کا چمن جو مجھے دلپذیر ہے · اس باغ جاں فزا کا یہ بلبل اسیر ہے
ورثے میں ہم کو آئی ہے آدم کی جائداد · جو ہے وطن ہمارا وہ جنت نظیر ہے

---

پنجۂ ظلم و جہالت نے بُرا حال کیا · بن کے مقراض ہمیں بے پر و بے بال کیا
توڑ اس دست جفا کیش کو یارب جس نے · روح آزادئ کشمیر کو پامال کیا

---

بت پرستی کو مرے پیش نظر لاتی ہے · یاد ایام گذشتہ مجھے شرماتی ہے!
ہے جو پیشانی پہ اسلام کا ٹیکہ اقبال · کوئی پنڈت مجھے کہتا ہے تو شرم آتی ہے

---

سو تدابیر کی اے قوم یہ ہے اک تدبیر · چشم اغیار میں بڑھتی ہے اسی سے توقیر
دُرِ مطلب ہے اخوت کے صدف میں پنہاں · مل کے دنیا میں رہو مثل حروف 'کشمیر'

ان قطعات میں اقبال نے اپنے سوز و ساز سے قوم کے سامنے اجتماعی نظام کا ایک ایسا نقشہ پیش کیا ہے جس کے رنگ و آہنگ سے ان کا نور بصیرت جگمگا رہا ہے۔ آخری قطعے کا آخری مصرع "مل کے دنیا میں رہو مثل حروف کشمیر" ساری عمر اخبار کشمیری لاہور کا ماٹو رہا۔

جب اقبال ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد اورینٹل کالج لاہور میں تاریخ، فلسفہ اور سیاست مدن کے لیکچرار مقرر ہوئے تو انہیں اس انجمن کا سیکرٹری بنا دیا گیا۔ منشی محمد الدین فوق، اسسٹنٹ سیکرٹری کی حیثیت سے ان کے دست راست تھے۔

۱۹۰۳ء میں اقبال گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۰۵ء میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے ولایت چلے گئے جہاں سے پی ایچ۔ ڈی اور بیرسٹری کی سندلے کر ۱۹۰۸ء میں واپس آگئے اور آپ نے لاہور میں وکالت شروع کی۔ اس کے ساتھ ہی آپ کو انجمن کشمیری مسلمانان کا جنرل سیکرٹری بنا دیا گیا۔ اس وقت انجمن کے دوسرے عہدہ دار حسب ذیل تھے:

صدر: خان بہادر خواجہ الٰہی بخش۔

نائب صدر: میاں شمس الدین رئیس و میونسپل کمشنر، خواجہ کریم بخش اکونٹنٹ، میاں نظام الدین رئیس، خواجہ کمال الدین بی۔ اے وکیل، شیخ محمد کاظم، سپرنٹنڈنٹ ڈاک خانہ جات، سید محمد شاہ وکیل، حاجی میر شمس الدین۔ ڈاکٹر محمد الدین ناظر۔

جنرل سیکرٹری - ڈاکٹر شیخ محمد اقبال، ایم - اے، پی ایچ - ڈی، بار ایٹ لاء۔
جائنٹ سیکرٹری - منشی حیدر محمد، ہیڈ کلرک ریلوے (برادر کلاں عزت مآب شیخ دین محمد)
اسسٹنٹ سیکرٹری - منشی محمد الدین فوق۔
فنانشل سیکرٹری - منشی معراج الدین، ڈرافٹسمین ریلوے۔
محاسب - منشی قادر بخش، اکاؤنٹنٹ نوٹ گھر۔

ان کے علاوہ خواجہ رحیم بخش ای - اے - سی، منشی محمد حفیظ، شیخ خان محمد ڈپٹی پوسٹ ماسٹر، بابو نبی بخش بی - اے انسپکٹر ڈاک خانہ جات، شیخ دین محمد ایم - اے پروفیسر مشن کالج لاہور (آنریبل جسٹس (سابق گورنر سندھ) شیخ برکت اللہ ڈپٹی انسپکٹر مدارس، منشی احمد دین اکاؤنٹنٹ نہر، بابو نبی بخش ٹھیکیدار ریلوے، خواجہ امیر بخش ہیڈ کلرک محکمہ جنگلات وغیرہ وغیرہ نہ صرف کشمیری برادری کے چند درخشندہ ستارے تھے بلکہ لاہور کی تمام قوم کے سربرآوردہ رکن تھے کیونکہ ان میں اکثر افراد ایسے بھی تھے جن کا کسی نہ کسی حیثیت سے مسلمانوں کی ہر جماعت بالخصوص انجمن حمایت اسلام سے گہرا تعلق تھا۔

۲۷، ۲۸ اور ۲۹ دسمبر ۱۹۰۸ء کو آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس امرتسر میں منعقد ہوا۔ آنریبل نواب بہادر خواجہ محمد سلیم اللہ خان، سی - ایس - آئی، کے - سی - ایس - آئی نواب آف ڈھاکہ اس کے صدر تھے۔ چونکہ وہ بھی کشمیری تھے اس لئے اہل خطہ برادری کے بہت سے بزرگ شوق ملاقات میں پنجاب کے مختلف شہروں سے کھنچ کر امرتسر پہنچے۔ انجمن کشمیری مسلمانان لاہور نے نواب صاحب کی خدمت میں ایک سپاسنامہ پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ ۲۷ دسمبر ۱۹۰۸ء کو ایک وفد غیر رسمی طور پر ایڈریس کا وقت مقرر کرنے کے لئے سرکٹ ہاؤس امرتسر میں حاضر ہوا۔ اس وفد میں خان بہادر خواجہ اللہ بخش، مولوی احمد دین وکیل، خواجہ رحیم بخش ای - اے - سی، خواجہ امیر بخش، حاجی میر شمس الدین جنرل سیکرٹری انجمن حمایت اسلام، منشی غلام محمد خادم، منشی محمد الدین فوق، بابو غلام حسین اور بابو حیدر محمد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

خان بہادر اللہ بخش نے ہر ایک کا تعارف کرایا اور حاضری کی علت غائی بیان کی۔ نواب صاحب نے دست شوق بڑھا کر ہر ایک سے مصافحہ کیا اور وفد سے ملنے کے لئے ۲۸ کی شام کا وقت مقرر کیا۔ چنانچہ دوسرے روز سیالکوٹ، امرتسر، راولپنڈی، گوجرانوالہ، سرگودھا، لائل پور، لدھیانہ، گورداسپور، وزیر آباد، ڈیرہ غازی خاں، جیکب آباد، سندھ وغیرہ مقامات کے نمائندوں کا ایک وفد وقت مقررہ پر سرکٹ ہاؤس امرتسر میں پہنچا۔ اقبال اس وفد میں شامل تھے۔ انہوں نے نہایت بلند آواز سے فارسی زبان میں سپاسنامہ پڑھا جو پہلے سے طبع شدہ تھا۔ راقم الحروف کے پاس اس کی ایک کاپی موجود ہے۔

اس سپاسنامے میں نواب صاحب کے خیر مقدم کے بعد ترک کشمیر کا تذکرہ تھا اور پھر لکھا تھا کہ کشمیری قوم نے باوجود اجنبی ہونے کے علوم و فنون اور حصول مراتب و وجاہت میں وہ کوشش کی ہے کہ مقامی اقوام ان کی ذہانت اور طباعی دیکھ کر دنگ رہ گئی ہیں۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ اپنے قومی بھائیوں یعنی اہل خطہ مسلمانان پنجاب کی سرپرستی قبول فرمائیں تاکہ جمعیت قومی کا شیرازہ بکھرنے نہ پائے اور ہماری ضروریات قومی اور حفاظت حقوق کی کوششیں

جاری رہ سکیں۔

یہ سپاسنامہ چونکہ نایاب ہے اس لئے اقبال کی ایک یادگار سمجھ کر یہاں درج کیا جاتا ہے:

"الحمدللہ امروز ساعت سعید بل روز عید کہ ما اہل خطہ از مختلف مقامات صوبۂ پنجاب بخدمت اقدس برائے خیر مقدم جناب والا حاضر شدیم و از شرف ملاقات مشرف گشتیم:

اے آمدنت باعث آبادیٔ ما ذکر تو بود زمزمہ شادیٔ ما

پوشیدہ نیست کہ اسلاف ما بغرض سیر و سیاحت و ترقی تجارت و حصول روزگار راہ غربت گرفتند و از قطعۂ جنت نظیر خویش انفراق نمودہ دریں ملک ہندوستان بہ مقامات مختلف اقامت ورزیدند و درصورت اجنبی زندگانی می کردند۔

ہنگامیکہ آفتاب اقبال مغربیہ بہ ہندوستان طلوع نمود اقوام مختلف ایں دیار از علوم مغربیہ بہرہ اندوز گشتند۔ دراں زمان ایں بزرگان خطہ باوجود مشکلات مہاجرت در ایں راہ قدم نہادند و اخوان ذخیرۂ ان خویشتن را بجلئے رسانیدند کہ امروز باعتبار علوم و فنون و حصول مراتب و وجاہت دنیویہ و ادائے فرائض دینیہ و بہ نظر تہذیب اخلاق و خیرخواہی دولت انگلشیہ در صف اقوام ترقی یافتہ جا گرفتند۔ ازاں جاکہ اہل خطہ را از فضل ایزد منان در ملک ہندوستان جمعیت قومی بحصول پیوستہ کشمیریان صوبۂ پنجاب بہ کمال آرزومندی برائے قبولیت عہدۂ پیٹرن بحضور والا عرض رسانند و امیدوارند کہ جناب والا از منظوری، ایں درخواست جملہ برادران خطہ را مشکور و ممنون سازند و در انصرام ضروریات قومی و حفاظت حقوق اہل خطہ بیشتر از پیشتر سعی فرمائند۔

ما از ایں خیرخواہی دولت برطانیہ کہ از طریق عمل جناب ظاہر و ثابت شدہ است و مما شود بر خود می نازیم:

از بیم جان و مال ہراساں نہ گشتۂ ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

گورنمنٹ عالیہ کہ از راہ الطاف خسروانہ اعزاز بزرگ یعنی عہدۂ ممبر کونسل ہائے جناب والا صفات را عطا فرمودہ است۔ ما اہل خطہ شکریۂ ایں نعمت ادا کردن نمی توانیم و بدرگاہ خداوند کریم دعا می کنیم کہ حکومت برطانیہ را بر جادۂ مستقیم برقرار داراد۔"

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

نواب صاحب نے اس سپاسنامے کا جواب انگریزی میں دیا جس کا خلاصہ یہ ہے:

"صاحبو! نہیں نہیں بھائیو! میں آپ کے سپاسنامے اور ملاقات سے بہت خوش ہوا۔ میں اس وقت اپنے بھائیوں کے درمیان ہوں اور ان کی ہر خدمت کے لئے جو مجھ سے ممکن ہے حاضر اور تیار ہوں۔ آپ نے خواہش ظاہر کی ہے کہ میں آپ کی قومی انجمن کا پیٹرن (مربی) بنوں۔ میں ہر چند اس

قابل نہیں لیکن آپ کی خوشی کو مدنظر رکھ کر آپ کی خواہش منظور کرتا ہوں اور خوش ہوں کہ میری قوم حکومت کی وفادار اور جاں نثار ہے۔" [1]

ایجوکیشنل کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں نواب صاحب نے اعزازِ صدارت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا:

"اگرچہ میری حالتِ صحت اجازت نہیں دیتی تھی کہ میں اتنی دُور کا سفر اختیار کروں اور اس شاندار مجمع میں شریک ہوں مگر آپ حضرات کے اخلاص نے مجھے مجبور کیا اور ڈھاکہ سے یہاں تک کھینچ لیا۔ ڈھاکہ امرتسر سے سینکڑوں منزل پر واقع ہے مگر میں یقین کرتا ہوں اور یقین کرنے کے کافی وجوہ میرے پاس موجود ہیں کہ میں اپنے وطن میں ہوں۔ میرا خیال ہے کہ امرتسر کی آبادی پنجاب میں بہ لحاظ کشمیری آبادی کے بہت زیادہ ہے اور اپنے خواص اور پیداوار و صنائع کے اعتبار سے ثانی سری نگر ہے اور شاید آپ حضرات واقف ہوں گے کہ میں کشمیری الاصل ہوں۔ اس حیثیت سے اپنے موجودہ وطن سے جس قدر آگے بڑھوں گا اصلی وطن یعنی کشمیر مجھ سے قریب تر ہوتا جائے گا۔"

اقبال کی تحریک سے نواب صاحب نے ۵ فروری ۱۹۰۹ء کو وائسریگل لیجسلیٹو کونسل کے اجلاس میں حکومت ہند سے یہ سوال بھی پوچھا کہ "آیا کشمیری فوج میں بھرتی ہو سکتے ہیں یا نہیں۔ اگر ہو سکتے ہیں تو آج کل کتنے کشمیری سرکاری فوجوں میں ہیں؟ نیز امرتسر اور سرحد کشمیر پر جو کشمیری آباد ہیں کیا وہ پنجاب کے قانون انتقالِ اراضی کی تعریف میں شامل ہیں یا نہیں؟"

اس سوال کے جواب میں لارڈ کچنر نے حکومت ہند کی طرف سے کہا کہ "کشمیری قوم کے فوج میں بھرتی ہونے پر کوئی روک ٹوک نہیں مگر رجمنٹوں میں چونکہ ان کی کلاس کمپوزیشن نہیں یعنی کوئی کمپنی پلٹن میں یا کوئی ٹروپ رسالہ میں کشمیریوں کے لیے مخصوص نہیں اس لیے ہندوستانی فوج میں کوئی کشمیری بھرتی نہیں ہوتا۔"

اسی طرح مسٹر ملز نے حکومت کی طرف سے جواب دیا کہ "جو کشمیری امرتسر اور حدود کشمیر میں رہتے ہیں پنجاب کے قانون انتقالِ اراضی کے رو سے ان پر کچھ خراب اثر نہیں پڑا۔ پنجاب میں کاشتکار قوم مشتہر ہونے کے لیے کشمیریوں کو حکومت پنجاب سے درخواست کرنی چاہیے۔ پنجاب گورنمنٹ کو حکومت ہند سے دریافت کیے بغیر ہر قوم کو کاشتکار مشتہر کر دینے کا اختیار ہے۔" [2]

اس سلسلے میں اقبال کے کئی مراسلے اس وقت کے اخباروں میں نظر آتے ہیں جن کے ذریعے سے فوجی بھرتی اور حصولِ اراضی کی ضرورت اور اہمیت برادری اور حکام دونوں پر واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نمونے کے طور پر ایک مراسلے کا مضمون یہ ہے:

"برادر مکرم و معظم۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔ آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ ہمارے مربی و محسن جناب

---

[1] خلاصہ از کشمیری میگزین لاہور بابت جنوری ۱۹۰۹ء [2] سول اینڈ ملٹری نیوز لدھیانہ۔ کشمیری میگزین بابت مارچ ۱۹۰۹ء

نواب سر آنریبل خواجہ محمد سلیم اللہ صاحب نواب بہادر کے۔ سی۔ ایس۔ آئی، سی۔ آئی۔ ای نواب ڈھاکہ نے ۵ فروری ۱۹۰۹ء کی وائسریگل کونسل میں کشمیریوں کے متعلق فوج اور زمینداری کی بابت سوالات پیش کئے تھے۔ فوج کے متعلق تو لارڈ کچنر صاحب بہادر کمانڈر انچیف افواج ہند نے فرمایا کہ "کشمیری مسلمانوں کو فوج میں بھرتی ہونے کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں ہے اگرچہ کشمیریوں کی کوئی کمپنی یا سکواڈرن علیحدہ موجود نہیں"۔ اس امر کے متعلق انجمن کشمیری مسلمانان لاہور علیحدہ کوشش کر رہی ہے مگر فی الحال میں آپ کی توجہ دو سوالوں کی طرف منعطف کرنا چاہتا ہوں۔ زراعت پیشہ اقوام کے متعلق جو جواب نواب صاحب کے سوال کا دیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ لوکل گورنمنٹ جس قوم کو مناسب سمجھتی ہے اقوام بندی زمینداری میں شامل کر لیتی ہے۔ گورنمنٹ پنجاب کو یہ دونوں سوال اور جواب زمینداری کے متعلق حضور وائسرائے بہادر نے بھیج دئے تھے۔ گورنمنٹ ممدوح نے حکم جاری فرمایا ہے کہ کمشنر اپنے اپنے علاقے کی مفصل رپورٹ کریں کہ آیا کشمیری مسلمان اقوام بندی زمینداری میں شامل کر لئے جائیں یا کئے جانے کے لائق ہیں۔ کمشنر صاحب بہادر نے ڈپٹی کمشنروں کے نام حکم صادر فرمایا ہے کہ وہ ان کو اس معاملہ میں مدد دیں۔ ڈپٹی کمشنروں نے تمام کشمیری زمینداروں کی ایک فہرست مرتب کرائی ہے جس سے ان کو معلوم ہوگا کہ پنجاب میں کتنے کشمیری زراعت پیشہ ہیں۔ ڈپٹی کمشنر صاحب سیالکوٹ کا حکم نہایت صاف ہے۔ انھوں نے تحصیلداروں سے چار امور دریافت فرمائے ہیں یعنی۔

(۱) قوم کشمیری کے افراد کا عموماً کیا پیشہ ہے؛

(۲) کس قدر کشمیری ایسے ہوں گے جن کا گذارہ صرف زراعت کاری پہ ہے؛

(۳) اگر وہ مالکان اراضی ہیں تو کب سے انھوں نے زمین حاصل کی ہے؛

(۴) کوئی کشمیری دخیل کار ہے یا نہیں؛

اس حکم سے معلوم ہوتا ہے کہ مفصلات اور شہروں میں بود و باش رکھنے والے زراعت پیشہ کشمیریوں کی جو فہرست تیار ہوگی اس میں مندرجہ بالا چار امور کا خیال رکھا جائے گا۔

آپ مہربانی فرما کر تحصیلدار صاحبوں کو اس فہرست کے مرتب کرنے میں خود بھی امداد دیں اور دیکھیں کہ یہ فہرست بموجب حکم صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر تیار کی جاتی ہے یا نہیں۔ تمام اہل خطہ کو جو آپ کے علاقہ میں رہتے ہیں اچھی طرح سمجھا دیا جائے کہ وہ اپنے اپنے گاؤں میں فہرست تیار کرنے میں امداد دیں تا کہ مکمل فہرست تیار ہو اور ہماری گورنمنٹ کو معلوم ہو جائے کہ کشمیری کس قدر پنجاب میں زمیندار ہیں اور زمینداری کا کام کرتے ہیں۔ اگر آپ کو معلوم ہو کہ یہ فہرست بموجب حکم صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر تیار نہیں ہوئی تو صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر کی خدمت میں مؤدبانہ درخواست کریں کہ وہ ان کے بموجب حکم تیار کرنے کا صادر فرمائیں۔

جو نقشہ کہ تیار ہو رہا ہے اس کی ایک نقل انجمن کشمیری مسلمانان لاہور کے پاس جس قدر جلد ممکن ہو سکے ارسال فرمانے کی کوشش کریں۔

یہ چٹھی اپنے بھائیوں کو جو مفصلات میں رہتے ہیں جلدی بھیج دیں تا کہ ان کو معلوم ہو جائے کہ کس قسم کی فہرست

تیار ہونی چاہیئے۔ اگر وہ دیکھیں کہ فہرست بموجب حکم بالا تیار نہیں ہوئی یا نہیں ہوتی تو وہ آپ کی معرفت صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر سے خط و کتابت کریں۔

اس غرض کے لئے کہ مندرجہ بالا امر میں تمام قوم کے افراد متفقہ طور پر اپنی بہبودی کے لئے کوشش کریں، نیز دیگر امور کے لئے جو قوم سے بحیثیت مجموعی تعلق رکھتے ہوں۔ میں تحریک کرتا ہوں کہ آپ اپنے سنٹر (مرکز) میں ضرور کشمیری مجلس قائم کریں۔ اس کے علاوہ ہر ایسے مقام میں جہاں آپ کا اثر ہو اپنے دیگر بھائیوں کو کشمیری مجلس قائم کرنے کی ترغیب بھی دیں کیونکہ اس طریق سے نہ صرف قوم کے افراد میں اتحاد و یگانگت کی صورت پیدا ہوگی بلکہ قومی حقوق کی حفاظت اور توسیع میں بھی سہولت ہوگی۔"[1]

خاکسار

محمد اقبال بیرسٹر ایٹ لا، جنرل سیکرٹری

انجمن کشمیری مسلمانان، لاہور

دوسری چٹھی جو اقبال نے بعض قومی کمیٹیوں اور بزرگان قوم کی خدمت میں چھاپ کر بھیجی یہ تھی:

"فوجی، زمینداری اور مردم شماری کا مسئلہ"

"برادر مکرم و معظم۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ!

انجمن کشمیری مسلمانان لاہور کی طرف سے پہلے بھی مسئلہ زمینداری کے متعلق ایک مطبوعہ چٹھی بعض قومی کمیٹیوں اور بزرگان قوم کی خدمت میں ارسال کئے جانے کے علاوہ کشمیری میگزین بابت مئی ۱۹۰۹ء میں شائع ہوئی ہے جو امید ہے تمام بھائیوں کی نظر سے گذری ہوگی۔ اس مسئلہ پر دیگر قومی کمیٹیوں کے علاوہ انجمن کشمیری مسلمانان لاہور بھی غور کر رہی ہے بلکہ اس نے ایک چٹھی بخدمت صاحب سینئر سیکرٹری جناب لفٹننٹ گورنر صاحب بہادر صوبہ پنجاب بدیں مضمون ارسال کی ہے کہ کشمیری زمینداروں کی فہرست اقوام بندی صرف ضلع سیالکوٹ و گورداسپور تک ہی محدود نہ رہے بلکہ یہ حکم از راہ الطاف خسروانہ دیگر اضلاع مثلاً گوجرانوالہ۔ لاہور، امرت سر، جہلم، راولپنڈی، لدھیانہ، اٹک، ہزارہ وغیرہ میں بھی جہاں کشمیری آبادی کثرت سے ہے نافذ فرمایا جائے۔ صاحب ممدوح کی خدمت میں ایک نقشہ بھی اس مضمون کا ارسال کیا گیا ہے کہ فہرست کس طریق سے تیار ہونی چاہئے۔ جواب آنے پر سب بھائیوں کو بذریعہ میگزین اطلاع دی جائے گی۔

فوجی مسئلہ کی ضرورت اور اہمیت سے بھی انجمن غافل نہیں ہے اس مسئلے کے متعلق خاموشی اس لئے ہے کہ ہمارے مربی و محسن نواب بہادر سر خواجہ محمد سلیم اللہ صاحب بہادر کے۔ سی۔ ایس۔ آئی، سی۔ آئی۔ ای نواب آف ڈھاکہ نے اپنی ایک تازہ چٹھی بنام جنرل سیکرٹری انجمن کشمیری مسلمانان لاہور میں وعدہ فرمایا ہے کہ وہ صاحب کمانڈر انچیف بہادر افواج

---

[1] کشمیری میگزین لاہور بابت مئی ۱۹۰۹ء

ہند سے ملاقات کرکے اس مسئلے کی نسبت فیصلہ فرمائیں گے۔ اب نواب صاحب ممدوح کو تمام امور متعلقہ خدمات فوجی سے آگاہی کی ضرورت ہے تاکہ پوری واقفیت حاصل کرکے حضور کمانڈر انچیف بہادر سے گفتگو کرسکیں اور صراحت و وضاحت سے اپنے بھائیوں کی مردانگی اور جاں نثاری اور ان کی فوجی خدمات کا تذکرہ کرسکیں۔ ایسا مصالحہ ہم پہنچانا معمولی بات نہیں ہے اور نہ ہی ایک شخص یا ایک کمیٹی کا کام ہے جب تک تمام برادری متفقہ کوشش سے اس میں ہاتھ نہ بٹائے گی یہ کام سرانجام نہ ہوگا۔ اس لئے سب بھائیوں کی خدمت میں گذارش ہے کہ وہ کشمیری انجمن لاہور کو اس معاملہ میں مدد دیں اور نقشہ ملازمان اہل خطہ فوج کو جو لف ہذا ہے اچھی طرح سے پُر کرکے جتنی جلدی ہو سکے جنرل سیکرٹری کو واپس ارسال فرمائیں تاکہ نواب صاحب بہادر کی خدمت میں افواج ہند کے کشمیری بہادروں کی مکمل فہرست ارسال کردی جائے۔ آپ ہرگز یہ خیال نہ فرمائیں کہ اس نقشہ سے کسی طرح ہمارے ان بھائیوں کو جو اس وقت صیغۂ فوج میں ملازم ہیں نقصان پہنچے گا۔ نقصان پہنچنے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ گورنمنٹ آف انڈیا اور خود کمانڈر انچیف بہادر تسلیم کرچکے ہیں کہ کشمیری مسلمان فوجوں میں ملازم ہیں۔ ان کے لئے کوئی بندش اور کوئی رکاوٹ نہیں ہے البتہ ان کی تعداد تھوڑی ہے۔

لاہور کی کمیٹی جس میں ہماری برادری کے اکثر اہل الرائے اور قانون دان بزرگ شامل ہیں اپنے بھائیوں کے اس خیال پر کافی سے زیادہ غور کرچکی ہے اور وہ ہر طرح مطمئن ہے۔ بلکہ ایسی فہرستوں کے مرتب ہونے سے قومی فائدہ کی بہت بڑی توقع رکھتی ہے۔

کمیٹی کوشش کررہی ہے کہ ہمارا ایک ڈیپوٹیشن جس میں ہماری برادری کے معزز فوجی پنشنر عہدہ دار خصوصیت سے شامل ہوں بسرپرستی نواب بہادر آف ڈھاکہ صاحب بہادر کمانڈر انچیف کی خدمت میں اس غرض سے حاضر ہو کہ کشمیری مسلمانوں کی رجمنٹ یا مختلف رجمنٹوں میں یا رسالوں میں کمپنی علیحدہ بنائی جانے کا حکم صادر فرمایا جائے۔ اگر برادران قوم نے فہرستیں اور نقشے مکمل کرکے جلد تر واپس کردیے تو غالب توقع ہے کہ گورنمنٹ ضرور ہماری گذارش پر توجہ فرمائے گی۔

اس چٹھی کے ساتھ علاوہ نقشہ ملازمان اہل خطہ فوج کے ایک نقشہ مردم شماری اہل خطہ کا بھی ہے۔ اس کی خانہ پری بھی ضروری ہے۔ اس نقشے سے نہ صرف اپنی برادری کی صحیح مردم شماری ہی دریافت کرنا مقصود ہے بلکہ یہ امر بھی جیسا کہ نقشہ کے ملاحظہ سے آپ کو معلوم ہو جائے گا مدنظر ہے کہ قوم کے خواندہ اور ناخواندہ اور بیکار اور باکار اصحاب کا حال بھی معلوم ہوجائے تاکہ کمیٹی حتی المقدور اپنے بھائیوں کو کسی قسم کی امداد پہنچا سکے۔ دنیا اس بات کو تسلیم کرچکی ہے کہ بغیر تعلیم کے کوئی قوم زندہ قوموں میں شمار نہیں ہوسکتی۔ جس قدر قومیں آج آپ کو مہذب، شائستہ اور ترقی یافتہ نظر آتی ہیں وہ سب علم کے زینہ ہی سے آسمان عروج و کمال پر پہنچی ہیں۔ آپ کو یاد رہے کہ آپ میں بھی وہ سچے موتی اور جواہر موجود ہیں جن کی چمک دمک سے دُنیا حیران اور خیرہ ہوسکتی ہے لیکن صرف جلا کی ضرورت ہے اور جلا تعلیم کے ذریعے ہی سے ہوسکتی ہے۔

آخر میں پھر یہ گذارش کرتا ہوں کہ دونوں نقشے فوجی اور مردم شماری بہت جلد پر کرکے واپس ارسال فرمائیں۔

اگر یہ نقشے ختم ہو جائیں تو آپ لاہور کمیٹی سے اور طلب فرما سکتے ہیں یا اسی نمونے کے اور نقشے دستی بنا سکتے ہیں۔[1]

قوم کا خادم، (ڈاکٹر شیخ) محمد اقبال ایم اے بیرسٹر ایٹ لاء لاہور

انجمن کشمیری مسلمانان لاہور کی بنیادوں پر بعد میں آل انڈیا مسلم کشمیری کانفرنس لاہور عالم وجود میں آئی جس نے کشمیر میں بیداری پیدا کرنے اور تعلیمی پستی دور کرنے میں بڑا کام کیا۔ اس کانفرنس کے بھی پہلے جنرل سیکرٹری اقبال تھے بعد میں سید محسن شاہ بی اے، ایل ایل بی اس کے سیکرٹری ہو گئے تھے۔ آج مقبوضہ کشمیر اور آزاد کشمیر میں جو مسلمان اعلیٰ عہدوں پر ممتاز نظر آ رہے ہیں ان میں اکثر اس کانفرنس کے تعلیمی وظائف کے رہین منت ہیں۔

اس کانفرنس کے ابتدائی دو اجلاس تو لاہور ہی میں ہوئے جو زیادہ تر لاہور، امرتسر، گوجرانوالہ اور سیالکوٹ وغیرہ چند شہروں کے اصحاب تک محدود تھے۔ لیکن راولپنڈی، سیالکوٹ اور گوجرانوالہ کے اجلاس مجمع اور اثر و اہمیت کے لحاظ سے بے نظیر تھے۔ سیالکوٹ کے اجلاس کے صدر خان بہادر نواب خواجہ محمد اعظم رئیس ڈھاکہ تھے — ان اجتماعوں میں کشمیری الاصل فوجی سردار بھی شامل ہوتے تھے جن میں کئی لفٹننٹ، صوبیدار اور جاگیردار تھے۔

ان ایام میں خواجہ احمد شاہ رئیس لدھیانہ اور خواجہ یوسف شاہ رئیس امرتسر پنجاب کونسل کے ممبر تھے۔ وہ دونوں کشمیری تھے اور قومی معاملات میں خوب دل چسپی لیا کرتے تھے۔ خواجہ احمد شاہ کی طرف سے لاہور میں انگریزی اخبار پنجاب آبزرور جاری تھا جس کے ایڈیٹر مختلف وقتوں میں شیخ عبدالقادر، شیخ عبدالعزیز اور ملک برکت علی رہے ہیں۔ شیخ عبدالعزیز بی اے اپنے آپ کو آنریری (اعزازی) کشمیری کہا کرتے تھے۔ وہ بعد میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے آنریری سیکرٹری اور پنجاب گورنمنٹ پریس برانچ کے سپرنٹنڈنٹ بھی ہو گئے تھے۔ ادھر وہ اپنے اخبار میں کشمیریوں کے مطالبات کی زبردست حمایت کرتے تھے، اُدھر فوق صاحب کشمیری میگزین میں کشمیری مسلمانوں کی بے کسی اور حکومت کشمیر کی بے توجہی کا قصہ چھیڑتے رہتے تھے۔ لیکن اخباروں کی چیخ پکار اور کشمیری کانفرنس کے مقرروں کی دھواں دھار تقریروں کے باوجود دربار کشمیر کسی مطالبے پر کان نہ دھرتا تھا بلکہ قراردادوں اور شکایتوں کے پہنچنے کی رسید تک نہ دیتا تھا۔

یہ حالات نہایت یاس انگیز اور حوصلہ شکن تھے لیکن ارکان کانفرنس نے ہمت نہ ہاری۔ آخر ان کے عزم و استقلال کی بدولت ایک وقت آیا جب قراردادوں کی رسیدیں بھی آنے لگیں۔ حکام سے ملاقاتیں بھی ہونے لگیں اور کانفرنس کے وفد مہاراجہ سرپرتاپ سنگھ کے سامنے اصالتاً اپنی شکایات پیش کرنے لگے۔ دو ایک موقعوں پر اقبال نے بھی ان میں شامل ہو کر کشمیری کانفرنس کی ترجمانی کا حق ادا کیا۔

۱۹۰۹ء یا ۱۹۱۰ء کی بات ہے کہ ایک مرتبہ کشمیری کانفرنس کا وفد مہاراجہ سرپرتاپ سنگھ والئے کشمیر کی خدمت میں بمقام کشمیر ہاؤس (لاہور) جانے والا تھا۔ فوق صاحب اقبال کو بلانے گئے۔ اقبال ان دنوں انارکلی والی بیٹھک میں رہتے تھے۔ انھوں نے یہ کہہ کر جانے سے انکار کر دیا کہ "جو مہاراجہ دن کے بارہ بجے سے پہلے کسی مسلمان کا منہ دیکھنا

---

[1] کشمیری میگزین بابت جون ۱۹۰۹ء

گوارا نہیں کرتا میں کسی وقت بھی اس کی شکل دیکھنا نہیں چاہتا۔ غضب خدا کا ایک ایسا شخص جس نے شہر جموں کا نام صبح ہی صبح لینا نہ صرف مسلمان بلکہ ہندو تک منحوس سمجھتے ہیں، اس منحوس شہر کا رہنے والا مسلمان کو منحوس سمجھ کر اس کی شکل سے نفرت کرتا ہے۔"

فوق صاحب نے کہا۔ یہ بات تو صحیح ہے کہ مسلمان بارہ بجے سے پیشتر اس کے پاس نہیں جا سکتے لیکن اس کی ایک وجہ بھی ہے وہ یہ کہ مہاراجہ صبح سویرے اُٹھ کر اشنان کرنے کے بعد پوجا پاٹ کرتے ہیں، یہ ہمن ان کے گرد ہوتے ہیں اس میں کافی وقت صرف ہو جاتا ہے پھر حقہ بھرا جاتا ہے جس کے کش لگاتے لگاتے کھانے کا وقت آ جاتا ہے اور خواہ مخواہ بارہ بج جاتے ہیں۔ تب کہیں جا کر ان کو برہمنوں اور رسوئی کے کاموں سے فرصت نصیب ہوتی ہے۔ اسی لئے وہ اپنے وزیروں اور بڑے بڑے اہل کاروں کو بھی بارہ بجے دوپہر سے ایک بجے تک ہی جے جے اور سلام کا موقع دیا کرتے ہیں۔ لیکن ان باتوں سے اقبال کی تسلی کب ہو سکتی تھی، انھوں نے ایک نہ سُنی اور نہ آئے۔[1]

وفد کے باقی ممبر وقت مقررہ پر کشمیر ہاؤس پہنچے، انھیں ایک چھوٹے سے خیمے میں بٹھایا گیا۔ دیوان امرناتھ چیف منسٹر تھے وہ کچھ گھبرائے ہوئے سے تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد باہر جاتے اور پھر خیمے میں آ کر باتوں میں مشغول ہو جاتے۔ ملاقات کا وقت آٹھ بجے شام تھا، مگر جب نو بج چکے تو ایک آدمی دوڑا ہوا آیا اور دیوان صاحب کو خیمے سے باہر لے گیا۔ معلوم ہوا کہ مہاراجہ صاحب جو کسی کو اطلاع دئے بغیر اپنے گرو جی کے پاس چلے گئے تھے اور جن کی تلاش میں دیوان صاحب پریشان ہو رہے تھے تشریف لے آئے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد سب کو بڑے کمرے میں بلایا گیا، غالباً اواخر دسمبر کے دن تھے، کمرے میں انگیٹھی جل رہی تھی اور مہاراجہ صاحب گاؤ تکیہ لگائے بیٹھے تھے۔ سب سلام کر کے فرش پر بیٹھ گئے کچھ معروضات پیش کیں۔ مہاراجہ صاحب نے یہ کہہ کر ٹال دیا "کہ دیوان صاحب آپ سے گفتگو کر چکے ہیں وہ آپ کی باتوں کا خیال رکھیں گے۔ سرکار کو خود بھی خیال ہے" اس کے بعد خاموشی ہو گئی۔ سب سلام کر کے چلے آئے لیکن حیران تھے کہ یہ کیسی ملاقات ہے۔ ایک طرف تو دن گنے جاتے تھے اس دن کے لئے اور دوسری طرف نشستند و گفتند و برخاستند کا معاملہ ہے۔

پہلے وفد کی ناکامی کے بعد جب دوسرے سال مہاراجہ صاحب لاہور آئے تو کانفرنس نے پھر وفد لے جانے کا فیصلہ کیا۔ اس دفعہ ایک میموریل بھی تیار کیا گیا جس کا لہجہ کسی قدر تلخ تھا۔ دیوان بشن داس ہوم منسٹر اور وزیر تعلیمات تھے۔ انھوں نے کہا کہ اس تحریر سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ بہتر یہ ہے کہ جو کچھ کہنا ہو زبانی کہہ دیجئے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اس وفد میں آنریبل خواجہ یوسف شاہ ممبر کونسل پنجاب، خان بہادر شیخ غلام صادق رئیس امرتسر، شیخ غلام حسین ای اے سی، خان بہادر اللہ بخش اور سید محسن شاہ وغیرہ شامل تھے۔ ریاست کی طرف سے اس موقعہ پر دیوان بشن داس ہوم منسٹر، خان بہادر شیخ مقبول حسین ریونیو منسٹر اور ایک دو اور معزز افسر موجود تھے۔ جب مہاراجہ کے ایماء سے سب کرسیوں پر بیٹھ گئے تو آپ نے چھوٹتے ہی فرمایا "سرکار ہمیشہ فرشی دربار کیا کرتے ہیں لیکن آپ کی خاطر آج

---

[1] سرگذشت فوق (قلمی) ص ۱۳۰-۱۳۱۔

کرسیوں کا دربار لگایا گیا ہے۔"

ارکان وفد نے شکریہ ادا کیا پھر خان بہادر شیخ غلام صادق، آنریبل خواجہ یوسف شاہ اور خان بہادر خواجہ اللہ بخش باری باری مسلمانان کشمیر کی تعلیمی اور اقتصادی پسماندگی کا ذکر کرتے رہے اور مہاراجہ کو ان کی فلاح و بہبود کی طرف توجہ دلاتے رہے۔

مہاراجہ صاحب نے جو کچھ جواب میں ارشاد فرمایا اس سے معلوم ہوتا تھا کہ دیوان بشن داس صاحب ان سے میموریل کے تند و تلخ لہجہ کا ذکر کر چکے ہیں۔ آپ نے فرمایا "سرکار کو ساری خبر ہے کہ لیڈر کس طرح بنا کرتے ہیں۔ جو شخص بہت باتیں کرتا ہے، بس وہ لیڈر ہے۔ جو تقریر یا تحریر میں تلخ لہجہ اختیار کر کے ادب و تمیز کی عنان ہاتھ سے چھوڑ دیتا ہے، بس وہ لیڈر ہے۔ جو ہندو مسلم فساد پیدا کرنے میں سب سے پیش پیش ہے۔ بس وہ لیڈر ہے۔ جو فرقہ وار مطالبات پر زور دیتا ہے یا حکومت اور فرمانروا پر فرقہ پرستی کا الزام لگاتا ہے، بس وہ لیڈر ہے۔ آپ لوگوں کو اگر اپنے کشمیری بھائیوں کے ساتھ ایسی ہی ہمدردی ہے تو کشمیر ہاؤس آجانا تو آسان ہے ذرا تکلیف اٹھا کر کشمیر آیئے ہم آپ کو دعوت دیتے ہیں۔ گھر بیٹھ کر باتیں بنانے سے کیا فائدہ؟ وہ کشمیر ہے پنجاب نہیں ہے۔ ہم وہاں ہندو مسلم سوال پیدا نہ ہونے دیں گے۔"

مہاراجہ صاحب ایک ہی سانس میں یہ سب باتیں کہہ گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انھوں نے زبانی یاد کر رکھی تھیں۔ خان بہادر خواجہ اللہ بخش تو ریڈیکل مذاق کے آدمی تھے۔ انھوں نے فوراً کہا کہ سرکار کے عہد میں آج تک ہم نے ریاست میں ہندو مسلم فساد کا ذکر نہیں سُنا یہ الفاظ سرکار کے منہ ہی سے پہلی مرتبہ سُنتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ کبھی ایسا ناخوشگوار واقعہ پیش آیا تو ہم اس فساد کو مٹانے اور امن قائم کرنے میں اپنی جانیں تک لڑا دیں گے اور کشمیر آنے کی جو دعوت دی گئی ہے اس کے لئے اہل وفد دل و جان سے شکرگذار ہیں اور بندہ تو بن بلائے ہی ہر سال حاضر ہو جاتا ہے صرف ان لوگوں کے اطمینان کی ضرورت ہے۔

مہاراجہ صاحب نے فرمایا، کیا سرکار کی زبان پر اعتبار نہیں؟ بس ہم نے کہہ دیا ہے۔ یہی ہماری زبان اور یہی ہماری تحریر ہے۔

وفد کے لوگ حیران تھے کہ کس قسم کے مطالبات و معروضات لے کے آئے تھے اور کس قسم کا جواب لے کے جا رہے ہیں۔[۱]

آخر ایک مرتبہ اقبال کے دوست انہیں بھی مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے پاس لے ہی گئے۔ یہ بھی لاہور ہی کا واقعہ ہے، مہاراجہ کشمیر ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا مہاراجہ سے تعارف کرایا گیا۔ بعض دوستوں نے اس ملاقات سے پہلے ہی مہاراجہ سے ڈاکٹر صاحب کی علمی شہرت اور ان کی شاعرانہ عظمت کا کچھ ذکر کر رکھا تھا مہاراجہ صاحب بے تکلف کہنے لگے۔

[۱] سرگذشت ذوق (قلمی) صفحہ ۷۹ - ۸۰

"ڈاک دار صاحب! سنا ہے آپ بیت بناتے ہیں"۔

ڈاکٹر صاحب نے بھی شوخی سے جواب دیا: "سرکار بیت نہ کبھی میں نے بنائے ہیں نہ میرے باپ دادا نے۔ اس کے علاوہ میں ڈاک دار بھی نہیں، نہ میں نے کبھی ڈاک کا کام کیا ہے نہ میرے بزرگوں نے"۔

مہاراجہ صاحب اقبال کے ساتھیوں کا منہ دیکھنے لگے۔ انھوں نے کہا: "حضور! یہ شاعر ہیں اور شعر کہا کرتے ہیں۔ شعر کو بیت بھی کہتے ہیں، انھوں نے بیت کو وہ بیت (بید) سمجھا جس سے کرسیاں بنی جاتی ہیں"۔

مہاراجہ صاحب۔ "ٹھیک کہا آپ نے، انھوں نے وہی بیت سمجھا ہوگا۔ کوئی شعر سنائیے"۔

ڈاکٹر صاحب شعر پڑھنے لگے تو مہاراجہ نے فرمایا "نہیں صاحب! یوں نہیں۔ گا کر پڑھئے، اسی لئے میں جس کی تمیز کے درست تعریف کرتے ہیں"۔

ڈاکٹر صاحب نے منشی محمد الدین فوق کی طرف دیکھا اور دبی زبان میں کہا۔ جی تو یہی چاہتا ہے کہ کہوں کہ میرے دوستوں کے پاؤں میں گھنگرو باندھیئے تو میں گاؤں۔ لیکن مہاراجہ کے احترام نے شوخی کا منہ بند کر دیا۔ اس کے بعد پانچ سات شعر ترنم ہی سے پڑھے۔ آپ کے بعد مہاراجہ نے خود بھی فارسی کے چند شعر سنائے پھر کہا "ڈاکٹری میں آپ نے کون سا امتحان پاس کیا ہے"؟

ڈاکٹر صاحب نے کہا "میں تو فلسفہ کا ڈاکٹر ہوں۔ فزیشن و سرجن ڈاکٹر نہیں ہوں"۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب کے ساتھیوں میں سے ایک نے کہا "سرکار! یہ بھی آپ کی رعایا ہیں"۔

مہاراجہ نے پوچھا "وہ کیسے؟ یہ لاہور کے رہنے والے ہماری رعایا کس طرح ہو گئے"؟

ساتھی نے کہا "ان کے آباؤ اجداد کشمیر کے رہنے والے تھے۔ ان کی ذات سپرو ہے۔ پنجاب میں ان کا وطن سیالکوٹ ہے"۔

مہاراجہ "بہت اچھا۔ ڈاکٹر صاحب! سرکار آپ کو کشمیر آنے کی دعوت دیتے ہیں۔ آپ ضرور آئیں"۔

یہ واقعہ ڈاکٹر صاحب نے ایک مرتبہ خود سنایا تھا۔ مگر وہ مہاراجہ کی دعوت پر کشمیر نہ جا سکے[1]۔

اقبال کشمیریوں کو یہودی تصور کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ان کے عادات و خصائل اور شکل و شمائل افغانوں سے ملتے جلتے ہیں جو بنی اسرائیلی ہیں۔ احساس معاملے میں ان کو یہاں تک غلو تھا کہ ایک مرتبہ انھوں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ لارڈ ریڈنگ وائسرائے ہند کے پاس ایک یادداشت بھیجنی چاہئے جس کا مضمون یہ ہو کہ تم بھی بنی اسرائیلی ہو اور کشمیر کے لوگ بھی، ان کو دہری غلامی سے نجات دلا کر نیکی اور بھلائی کی مستقل یادگار چھوڑ جائیے۔ لیکن وہ کشمیر کے روشن اور درخشندہ مستقبل سے کبھی مایوس نہیں ہوئے۔ انھوں نے جب کبھی کہا یہی کہا کہ ایسا زرخیز ملک، ایسے روشن دماغ اور ذہین و ذکی لوگ اور ایسی صناع و ہوشیار قوم ہمیشہ کے لئے کبھی غلام نہیں رہ سکتی۔ ان کی امید کا دامن یہاں

---

[1] سرگزشت فوق (قلمی)، صفحہ ۱۲۱۔

تک بڑھا ہوا تھا کہ کہا کرتے تھے کہ اگر کشمیر کے لوگ بیدار ہو گئے ان کو زمانے کا ساتھ دینے کی توفیق ہوئی اور آزادی کی فضا میں سانس لینے کا موقع ملا تو یہ سارے ہندوستان کو بیدار کریں گے اور ان کے راہنما ثابت ہوں گے۔ چنانچہ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ ہندوستانی ریاستوں کی چھ کروڑ آبادی میں سب سے پہلے کشمیر کے لوگوں ہی نے جبر و استبداد کے خلاف آواز اٹھائی اور ان کی دیکھا دیکھی باقی ریاستوں کی رعایا نے قدیم نظام حکومت بدلوانے کے لئے ہاتھ پاؤں مارے۔

اس طرح کشمیری برادری کے تنظیمی اور اصلاحی کاموں میں دلچسپی لیتے ہوئے جب آپ نے دیکھا کہ مسلمان عالمگیر اخوت کے نصب العین کو نظرانداز کر کے برادریوں کے فریب میں مبتلا ہو گئے ہیں اور ان کی اس فریب خوردگی سے ملکی سیاست بُری طرح متاثر ہو رہی ہے تو آپ نے کشمیری کانفرنس کے کاموں میں دلچسپی لینی چھوڑ دی اور کہا کہ ایک سچے مسلمان اور محب نوع انسان کا حقیقی فرض سارے بنی آدم کی نشر و ارتقا ہے۔ نسل اور حدود ملک کی بنیاد پر قبائل اور اقوام کی تنظیم حیات اجتماعی کی ترقی اور تربیت کا ایک ہنگامی اور عارضی پہلو ہے۔ اگر اس کی اتنی ہی کائنات تسلیم کر لی جائے تو مجھے اعتراض نہیں۔ لیکن جب اسے انسانی قوت کا مظہر اتم سمجھا جاتا اور ارتقائے انسانیت کی آخری اور انتہائی منزل قرار دیا جاتا ہے تو مجھے اس کے بدترین لعنت قرار دینے میں مطلق تامل نہیں ہوتا۔ چنانچہ ۲۸ اور ۲۹ اپریل ۱۹۱۸ء کو جب آل انڈیا مسلم کشمیری کانفرنس کا بارہواں سالانہ اجلاس سیالکوٹ میں منعقد ہوا تو آپ اس میں شامل نہ ہوئے۔ معمولی سا ایک پیغام لکھ کر سیکرٹری استقبالیہ کمیٹی کے نام بھیج دیا اور معذرت طلب کر لی۔ اس پیغام کو عام کھلے اجلاس میں پیش کرتے ہوئے حاجی میر شمس الدین مرحوم نے کہا:۔

"آج میں نہایت خوشی سے ایک ایسی ہستی کا پیغام سناتا ہوں جو ہماری برادری میں ارفع و اعلیٰ ہے اور جس پر ہم سب کو نازھے جیسے یہ بات ہے تو جہاں انھوں نے جنم لیا ان کو خاص طور پر فخر ہونا چاہئے۔ علامہ اقبال کو ہماری اس کانفرنس کے ساتھ عرصہ سے اختلاف رہا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ایسی انجمنیں جن کا تعلق برادریوں کے ساتھ ہو نقصان دہ ہیں ہم نے بارہا ان سے اس بارے میں گفتگو کی، متعدد دلائل پیش کئے اور یہ بات ان پر واضح کرنے کی کوشش کی کہ ہمارا مقصد یہ نہیں کہ بقیہ مسلمانوں سے علیحدہ رہیں بلکہ ہمارا مقصد خود اپنی اور اپنے بھائیوں کی اصلاح و فلاح اور بہبود کا کام ایک محدود دائرے کے اندر رہ کر کرنا ہے اور اس کا نتیجہ جلد اچھا برآمد ہونا یقینی ہے مثلاً سب سے پہلے میں اپنے گھر کی اور اپنے محلے کی اصلاح کرنا چاہوں گا تو آسانی سے کر سکوں گا بجائے اس کے کہ سارے شہر کی اصلاح کا کام شروع کر دوں۔ الحمد للہ کہ ڈاکٹر صاحب نے مان لیا ہے اور آئندہ کانفرنس کے کاموں میں دلچسپی لینے پر رضامندی کا اظہار کیا ہے چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ "میں کانفرنس کے ہر ایک معاملے میں ہم خیال ہوں اور کانفرنس کے کاموں میں شامل ہو کر عملی طور پر حصہ لینے کی کوشش کروں گا، میں ہر طرح امداد کو تیار ہوں۔ خدا مجھے اپنی قوم کے نیک کاموں میں حصہ لینے کی توفیق عطا کرے۔ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ کانفرنس کے اجلاس میں شریک ہو سکوں لیکن افسوس کہ انہی تاریخوں پر مجھے شملہ ایک ضروری کام ہے۔ میری دلی دعائیں کانفرنس کی کامیابی کے لئے وقف ہیں۔"[1]

[1] روئداد مسلم کشمیری کانفرنس ۱۹۱۸ء صفحہ ۲۰-۲۸

محمد عبداللہ قریشی

# اقبال اور کشمیر

کشمیر اور کشمیریوں سے محبت رکھنے کے باوجود اقبال ۱۹۲۱ء تک کشمیر نہ دیکھ سکے تھے۔ چنانچہ ۱۹۱۷ء میں جب آپ نے منشی محمد الدین فوق کی کتاب راہنمائے کشمیر مطالعہ کی جس میں کشمیر کے دلچسپ تاریخی و جغرافیائی حالات اور قابل دید مقامات کا تذکرہ تھا تو آپ نے اپنے ۸ جون ۱۹۱۷ء کے خط میں منشی صاحب کو لکھا کہ :۔

"رسالہ راہنمائے کشمیر جو حال میں آپ کے قلم سے نکلا ہے نہایت مفید ہے۔ طرز بیان بھی دلکش ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ رسالہ عام لوگوں کے لئے نہایت مفید ہوگا۔ افسوس ہے کہ میں آج تک کشمیر کی سیر نہیں کر سکا لیکن اس سال ممکن ہے کہ آپ کا رسالہ مجھے بھی ادھر کھینچ لے جائے۔"

مگر راہنمائے کشمیر نے کشمیر دیکھنے کا جو شوق پیدا کیا تھا وہ اس سال بھی پورا نہ ہوا۔ البتہ ۱۹۲۱ء کی گرمیوں میں اس کے لئے خود بخود اسباب پیدا ہو گئے۔

ریاست جموں و کشمیر میں شیخ محمد بخش اور سیٹھ کریم بخش[1] نامور تاجر اور رئیس تھے۔ زمانہ کے انقلابات ہر ملک اور ہر قوم بلکہ ہر خاندان پر کسی نہ کسی وقت اور کبھی نہ کبھی اپنا اثر ڈالتے رہتے ہیں۔ یہی انقلابات ان کو بھی پیش آئے۔ پنجاب نیشنل بنک کی شاخ سرینگر نے حساب کتاب اور لین دین کے معاملے میں ان کی ڈگریاں اور قرقیاں کرائیں اور ہزارہا روپے کی جائداد سینکڑوں میں نیلام کرا دی۔ چونکہ نیلام اور قرقیوں وغیرہ میں بہت سی بے ضابطگیاں تھیں اور بنک کا رسوخ بھی بہت کام کر رہا تھا اس لئے شیخ محمد بخش مرحوم کے داماد منشی سراج الدین نے جو اس وقت مہتمم بندوبست کے مثل خواں تھے اور بعد میں اپنی قابلیت کی وجہ سے خود افسر مال کے عہدہ سے سبکدوش ہو کر ریونیو ایجنٹ (وکیل) ہو گئے تھے، ڈاکٹر اقبال کی قانونی قابلیت سے مستفید ہونے کے لئے ان کو اس مقدمے میں کشمیر بلایا۔ ڈاکٹر صاحب جون ۱۹۲۱ء میں پہلی مرتبہ مولوی احمد دین وکیل اور اپنے منشی شیخ طاہر دین مرحوم کے ہمراہ کشمیر گئے اور قریباً دو ہفتہ تک سرینگر میں رہے۔ ہاؤس بوٹ میں ان کا قیام تھا۔ مقدمات ڈی حکیم سشن جج کی عدالت میں تھا جو بمبئی کے ایک پارسی تھے۔ اردو اور کشمیری تو بالکل ہی نہ جانتے

---

[1] شیخ محمد امین رئیس جموں و سابق رکن اسمبلی کشمیر اور شیخ محمد حنیف ٹھیکیدار شیخ محمد بخش مرحوم کے فرزند ہیں۔ تقسیم ہند و پاکستان سے پہلے اپنے کاروبار کی رونق اور ترقی کے لحاظ سے نہایت امیرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔

تھے، البتہ کشمیریوں کی بدقسمتی سے حکومت ہند کے محکمہ سیاسیہ و خارجہ میں "حکیم" کی رعایت سے مسلمان سمجھے جاتے تھے ۔ چنانچہ ۱۹۲۴ء میں ریشم خانہ کشمیر کے فسادات کے بعد جب حاجی میر شمس الدین مرحوم اور سید محسن شاہ بی اے ایل ایل بی، جنرل سیکرٹری مسلم کشمیری کانفرنس لاہور مسلم حقوق و مطالبات اور جلا وطنان کشمیر کی شکایات لے کر ایک وفد کے ہمراہ پولیٹیکل سیکرٹری اور وائسرائے ہند سے شملہ میں ملے اور کشمیر کے اعلیٰ عہدہ داروں میں مسلمانوں کی کمی کا اظہار کیا تو پولیٹیکل سیکرٹری نے کہا کہ کشمیر کے جوڈیشل ڈیپارٹمنٹ میں سیشن جج اے ڈی حکیم مسلمان موجود ہے ۔ کیا اس سے انصاف کی توقع نہیں ؟ مگر جب انہیں اصل حقیقت سے آگاہ کیا گیا تو وہ کچھ خفیف سے ہوئے ۔ وہ حکیم کے لفظ سے اس پارسی کو مسلمان سمجھتے تھے حالانکہ اُن کے زمانہ میں ہندو سررشتہ دار من مانی کارروائیاں کرتے تھے اور کسی کی کوئی پیش نہ جلنے دیتے تھے ۔ اس لئے چند ابتدائی غلطیوں کی وجہ سے اس مقدمہ کا فیصلہ حسب منشا نہ ہو سکا، جس کا اقبال کو افسوس رہا۔ چنانچہ آپ نے ۳ اگست ۱۹۲۱ء کے خط میں منشی سراج الدین کو لکھا :-

مخدومی منشی صاحب ۔ السلام علیکم ۔ آپ کی علالت کی خبر معلوم کر کے تردد ہے ۔ اللہ تعالیٰ اپنا فضل کرے ۔ نقل فیصلہ مرسلہ سیٹھ کریم بخش صاحب مل گئی ہے اور میں نے فیصلہ بغور پڑھا ہے ۔

دفعہ ۷ کے متعلق جج صاحب بہادر نے جو کچھ لکھا ہے میری رائے میں غلط ہے ۔ ہائی کورٹ میں اس کی چارہ جوئی ہو سکتی ہے ۔ لیکن اگر عدالت عالیہ اس امر میں ہم سے متفق ہو اور واقعات پر متفق نہ ہو تو ہمیں کوئی فائدہ نہیں ۔ اس واسطے زیادہ ضروری امر واقعات کے متعلق ہے ۔

واقعات کے متعلق یہ عرض ہے کہ جج صاحب نے وہی بات لکھی ہے اور اپنے فیصلے کو اسی بات پر مبنی کیا ہے جس کا احساس ہمیں پہلے ہی سے تھا ۔ یعنی یہ بات کہ واقعات اور بے ضابطگیوں سے ڈگری دار کی بدنیتی ثابت نہیں ہوتی ۔ میں نے یہ تمام باتیں پہلے ہی عرض کر دی تھیں ۔ سب سے بڑی کمزوری اس مقدمہ میں یہی ہے ۔ مجھے امید نہیں کہ ہائی کورٹ، جہاں تک بے ضابطگیوں اور غلطیوں کا تعلق ہے اے ڈی حکیم صاحب سے مختلف تجویز کرے ۔

شیخ صاحبان اپنی جگہ سوچ لیں اور تمام زیر باری کا اندازہ کر لیں، جو اپیل وغیرہ کا نتیجہ ہو گی ۔ اگر معمولی مالیت کا مقدمہ ہوتا تو مضائقہ نہ تھا ۔ مقدمے کی مالیت بھی بڑی ہے اور اخراجات وکلا وغیرہ بھی اسی حیثیت سے ہوں گے ۔ غرض ان تمام امور کو ملحوظ رکھ کر آخری فیصلہ کرنا چاہئے ۔ میں نہیں چاہتا کہ ان کی زیر باری میں اور اضافہ ہو ۔ وجوہات اپیل دو چار روز تک لکھ کر ارسال خدمت کر دوں گا ۔ اگر آپ کی مرضی ہو تو آپ اپیل دائر کر دیں ۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے ۔ مجھے افسوس ہے کہ چند ابتدائی غلطیوں کی وجہ سے اس مقدمہ کا فیصلہ آپ کے حق میں نہ ہو سکا ۔ مگر خدا تعالیٰ کی درگاہ سے مایوس نہ ہونا چاہیئے ۔ اگر یہ صورت نہیں تو اللہ تعالیٰ سیٹھ صاحبان کے لئے کوئی اور صورت پیدا کر دے گا ۔ سیٹھ صاحبان کی خدمت میں السلام علیکم"۔

مخلص محمد اقبال

یہاں اقبال کو ایک اور مقدمہ بھی ملا ۔ یہ رحمان راہ کا تھا جو سری نگر کا باشندہ تھا اور قتل کے الزام میں ماخوذ تھا ۔ اقبال کی بحث سے یہ شخص پھانسی سے تو بچ گیا مگر قید ہو گیا ۔ اقبال کو جب اس مقدمے کے فیصلے کی اطلاع ملی تو آپ نے

اپنے ۲۰ اپریل ۱۹۲۲ء کے خط میں منشی سراج الدین سابق افسر مال کشمیر کو لکھا:-

ڈیر منشی صاحب - السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ الحمدللہ کہ خیریت ہے - انشاء اللہ آپ کے ارشاد پر غور کیا جائے گا۔

افسوس کہ رحمان راہ کامل طور پر نہ بچا، گو پھانسی سے بچ گیا۔

لالہ کنور سین[1] صاحب سے لاہور میں میں نے اس مقدمہ کا مفصل ذکر کیا تھا اور تمام بڑی بڑی باتیں ان کو سمجھا دی تھیں اور یہ بھی درخواست کی تھی کہ مقدمہ کی سماعت جموں میں کریں تو میں بغیر مزید فیس کے بحث کروں گا۔ مگر افسوس کہ وہ مقدمہ کشمیر میں سنا گیا۔

بہرحال میں نے منشی اسداللہ کی تحریر پر اپنی بحث کے مفصل نوٹ ان کو بھیج دیئے ہیں جو عدالت میں پیش کر دیے گئے تھے۔ لالہ کنور سین صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہاری بحث کے مفصل نوٹ مثل پر موجود ہیں۔ اس وقت اگر میعاد کا نہ اٹھایا جاتا تو مقدمہ مہاراجہ[2] کے سامنے ہی غالباً فیصلہ ہو جاتا۔ مگر منشی اسداللہ صاحب یہ خیال کرتے رہے کہ بار دیگر کونسل کے سامنے پیش ہوگا جہاں رحمان راہ کی بریت کی توقع ہے۔ اس واسطے اس وقت التوا کو غنیمت سمجھا گیا۔ ورنہ میں نے تو مہاراجہ صاحب سے بھی کہہ دیا تھا کہ آپ ابھی فیصلہ کر دیں کیونکہ دو بارہ یہاں آنے کا خرچ مؤکل اپنی غریبی کی وجہ سے نہ اٹھا سکیں گے۔ مگر منشی اسداللہ صاحب کا یہ خیال تھا کہ التوا بہتر ہے۔ مگر افسوس کہ بعد میں ان کا خیال پورا نہ ہوا اور کونسل اب تک نہ بن سکی۔ وہ غلطی سے یہ سمجھتے رہے کہ اس فیس میں جو انہوں نے مجھ کو دی تھی، میں دوبارہ کشمیر آؤں گا مگر یہ کیونکر ممکن تھا؟

اس کے علاوہ مہاراجہ صاحب کے سامنے میں نے ان سے یہ کہہ بھی دیا تھا۔ بہرحال اب میں نے سنا ہے وہ گورنمنٹ آف انڈیا میں لالہ کنور سین صاحب کے فیصلہ کے خلاف اپیل کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے مندرجہ بالا طویل حالات لکھ کر آپ کو تکلیف دی ہے۔ اس سے غرض یہ ہے کہ اگر رحمان راہ کے وارثوں کا ارادہ اپیل کرنے کا مصمم ہو تو میں بغیر کسی مزید فیس کے ان کی اپیل لکھ دوں گا۔ آپ یہ امر ان کے گوش گزار کر دیں۔

چونکہ کشمیر میں یہ معاملہ ہندو مسلمان سوال بن گیا ہے، اس واسطے ممکن ہے کہ رحمان راہ کے وارثوں کو یہ خیال ہو کہ گورنمنٹ آف انڈیا کا قانونی مشیر بھی تو ایک کشمیری پنڈت ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور دقت بھی ہے اور وہ یہ کہ جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے مہاراجہ کی طرف سے اگر کسی کو پھانسی کا حکم ہو تو اس کی اپیل نہیں ہوتی۔ بہرحال اگر ان کا ارادہ

---

[1] جسٹس کنور سین ایم۔ اے (سابق پرنسپل لاء کالج لاہور) جموں و کشمیر میں جج ہائی کورٹ تھے۔ مولوی سید میر حسن سیالکوٹی کے ممتاز شاگرد ہونے کے علاوہ علمی ذوق سے مالا مال تھے اور فارسی، عربی سے اچھی خاصی واقفیت رکھتے تھے۔ آخری عمر میں چیف جج ہو گئے تھے۔

[2] اس وقت مہاراجہ پرتاپ سنگھ کی حکومت تھی، جن کا انتقال ۱۹۲۵ء میں ہوا۔

تو مجھے اس میں کچھ عذر نہ ہوگا۔ اس صورت میں آپ ان سے کہہ دیں کہ میری بحث کے مفصل نوٹ اور دیگر کاغذات بھیج دیں۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ اُمید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ والسلام"[1]

مخلص محمد اقبال۔ لاہور

قانونی کام سے فارغ ہونے کے بعد کشمیر کی سیر کا لطف بھی اُٹھایا گیا۔ چنانچہ ایک دن اقبال، منشی سراج الدین احمد، میر منشی ریذیڈنسی کشمیر، مولوی احمد دین، سیٹھ کریم بخش، منشی نور الٰہی تحصیلدار اور چند دیگر علم دوست احباب شکارے (ہلکی کشتی) میں بیٹھ کر ڈل کی سیر کو گئے، نشاط اور شالامار باغ میں کافی وقت گذار کر شام کو یہ قافلۂ ادب واپس آیا۔ یہی وہ وقت تھا جب آفتاب دن بھر میں ساری دُنیا کا چکر لگا کر آرام کرنے کے لئے کوئی جائے پناہ تلاش کرتا ہے۔ اسی موقعہ پر مولانا محمد حسین آزاد مرحوم نے آفتاب کو مخاطب کر کے کہا تھا:۔

اے آفتاب صبح سے نکلا ہؤا ہے تو     شب بھر کے کاروبار میں دن بھر پھرا ہے تو
دامان کوہسار میں اب جا کے سو رہو     دن بھر کا کام شام کو سمجھا کے سو رہو

مولانا آزاد شملہ کی پہاڑیاں دیکھ چکے تھے اور دامان کوہسار میں سورج کے غروب و غائب ہونے کا منظر ان کے سامنے تھا۔ لیکن وہ چونکہ کشمیر نہ جا سکے تھے اور ڈل کی اس کیفیت سے بے خبر تھے کہ

کوہ پانی میں، چمن پانی میں بن پانی میں ہیں

اس لئے وہ یہ نہ بتا سکے کہ دن بھر کا تھکا ماندہ مسافر (آفتاب) سفر کے گرد و غبار سے کس طرح اپنے آپ کو پاک صاف کر کے پردۂ شب میں گم ہو جاتا ہے۔ یہ مضمون اقبال کے حصہ میں آیا۔ صاحبزادہ محمد عمر (سابق منصف جموں و مصنف کتاب ناٹک ساگر) فرماتے ہیں:

"دونوں وقت مل رہے تھے کہ شکارہ (ہلکی کشتی) اس انجمن ادب کو لئے ڈل میں پہنچ گیا۔ اس وقت آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ شفق پھولی ہوئی تھی اور اس منظر کا عکس ڈل کے شفاف پانی میں شرر افشانی کر رہا تھا۔ اس کیف آور منظر نے عجیب کیفیت پیدا کر رکھی تھی جس نے علامہ ممدوح کے دل پر خاص اثر کیا۔ تھوڑی دیر صحیفۂ قدرت کے اس سنہری ورق کا مطالعہ کرنے کے بعد خلاق معانی بحر فکر میں غوطہ زن ہوئے اور دو در شاہوار نکال لائے۔ نقاش فطرت کی قدرت دیکھنا! دو شعروں میں سارے منظر کی تصویر کھینچ دی ہے"[2]

تماشائے ڈل کن کہ ہنگام شام     دہد شعلہ را آشیاں زیر آب
بشوید ز تن تا غبار سفر     زند غوطہ در آب ڈل آفتاب

جولائی ۱۹۲۱ء کے پہلے عشرہ میں اقبال لاہور واپس آگئے۔ جنت ارضی کے اس مختصر سے سفر میں آپ نے کشمیر اور

---

[1] یہ خط غیر مطبوعہ ہے۔ اس کی نقل مجھے منشی محمد الدین فوق مرحوم کی یادداشتوں سے ملی ہے۔
[2] رسالہ ہزار داستان لاہور۔ بابت اکتوبر ۱۹۲۲ء

کشمیر کے خستہ حال لوگوں کو جن مصائب و آلام میں مبتلا دیکھا، اس کا اظہار آپ نے اپنی کئی نظموں میں مختلف پیرایوں سے کیا۔ پیام مشرق جو اس سفر کے بعد ۱۹۲۳ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی، اس میں اقبال کی تین نظمیں "کشمیر" "غنی کشمیری" اور "ساقی نامہ" ملتی ہیں، جن کے ذریعہ سے حسن فطرت اور حقائق نمود جبات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

پہلی نظم میں اقبال نے کشمیر کے سرسبز و شاداب پہاڑوں، مرغزاروں، اس کی گلریز و گل پوش وادیوں اور گل عذاروں کے دلکش حسن کی منظر کشی کر کے اپنی شاعرانہ مصوری اور مرقع نگاری کا کمال دکھایا ہے اور آخر میں "باز بخویشتن نگر" کی چٹکی لے کر اپنے مخاطب سے کہا ہے کہ پہلے ان نعمتوں کو دیکھ، پھر اپنے آپ پر نظر کر کہ تو ان کے لائق بھی ہے؟

اس نظم کے پہلے چار شعروں میں اقبال نے وادیٔ کشمیر کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

رخت بہ کاشمر کشا کوہ و تل و دمن نگر
سبزہ جہاں جہاں بہ بیں لالہ چمن چمن نگر
باد بہار موج موج مرغ بہار فوج فوج
صلصل و سار زوج زوج بر سر نارون نگر
تا نہ فتد بہ زینتش چشم سپہر فتنہ باز
بستہ بچہرۂ زمیں برقع نسترن نگر
لالہ ز خاک بردمید موج بآبجو تپید
خاک شرر شرر بہ بیں آب شکن شکن نگر

پانچویں شعر میں ناظر کو راگ رنگ کی چینک لگائی ہے:

زخمہ بہ تار ساز زن بادہ بہ ساتگیں بریز
قافلۂ بہار را انجمن انجمن نگر

آخری شعر میں جو اس ساری نظم کی جان ہے، حسینۂ کشمیر کا ذکر اس طرح کیا ہے:

دخترکے برہمنے لالہ رخے سمن برے
چشم بروے او کشا باز بخویشتن نگر

میر ولی اللہ ایبٹ آبادی اپنی ایک نظم "نشاط باغ" میں منظر کشی کا حق ادا کرنے کے بعد یہ کہہ کر رہ گئے تھے کہ

پھر اس پہ قہر ہو جب گوشۂ چمن سے کوئی
عدوے دین و دل و عقل و ہوش پیدا ہو

مگر اقبال نے ان دو لفظوں میں اس کا سراپا بیان کرنے کے بعد کہ اس کے رخسار گل لالہ کی طرح سرخ اور اس کا جسم چنبیلی کی طرح سفید اور خوشبودار ہے، اپنے مخاطب کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ:

(۱) پہلے اسے دیکھ پھر اپنی حالت پر غور کر کہ تو اسے حاصل کر سکتا ہے؟

(۲) اس کے حسن دلستاں کو دیکھ کر اپنی خوش نصیبی پر ناز کر کہ کارکنان قضا و قدر نے تجھے حوران بہشتی کے انتظار کی زحمت سے نجات دے دی۔

(۳) اس کو ایک نظر دیکھنے کے بعد اپنے دل سے پوچھ کہ تو جنت کشمیر سے واپس جانا چاہتا ہے؟

(۴) اس کا جلوہ دیکھ کر اپنی حالت کا جائزہ لے کہ اب تو ہوش میں بھی ہے یا نہیں؟ دل ترے قابو میں بھی ہے یا نہیں؟

کیوں چپ ہو نسیم؟ کچھ تو بولو
آنکھیں تو ملاؤ، دل کہاں ہے؟

(۵) ایک مفہوم اور بھی پوشیدہ ہے جو اکبر الہ آبادی کے اس شعر کو پڑھ کر واضح ہو سکتا ہے:

شیخ جی اس بت کا جلوہ دیکھ ساکت ہو گئے
ماسٹر صاحب بہت کمزور تھے چت ہو گئے[1]

دوسری نظم میں کشمیر کے مشہور شاعر ملا طاہر غنی کے استغنا کا ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ جب وہ گھر میں ہوتا تھا تو دروازہ بند رکھتا تھا اور جب گھر سے باہر جاتا تھا تو دروازہ کھلا چھوڑ دیتا تھا۔ جب لوگوں نے اس کی وجہ دریافت کی تو اس نے جواب دیا:

زمن آنچہ دیدند یاراں رواست          دریں خانہ جز من متاعے کجاست
غنی تا نشیند بہ کاشانہ اش          متاعے گرانے ست در خانہ اش

چو آں محفل افروز در خانہ نیست
تہی تر ازیں ہیچ کاشانہ نیست

یعنی اس گھر کی سب سے قیمتی شے میں ہوں۔ جب میں گھر میں ہوتا ہوں تو اس کی حفاظت کرتا ہوں اور جب باہر چلا جاتا ہوں تو گھر میں باقی ہی کیا رہ جاتا ہے جس کی حفاظت کی جائے۔

ساقی نامہ اقبال نے نشاط باغ کشمیر میں بیٹھ کر لکھا تھا۔ اس کی تشبیب میں انھوں نے بہار کا منظر پیش کیا ہے۔ اس کے بعد گریز کی ہے اور ساقی (خدا) سے دعا کی ہے کہ شراب حریت کے چند قطرے ٹپکا کر کشمیریوں کے دلوں کو گرما دے تاکہ اس خاکستر سے چنگاریاں پیدا ہو جائیں، مردہ جسموں میں سوز کی لہر دوڑ جائے اور ہر بے خود دلے جان خودی اور زندگی کی لذت سے آشنا ہو جائے۔ دیکھئے:

خوشا روزگارے خوشا نو بہارے
نجوم پرن رست از مرغزارے

بہار کا موسم بھی کس قدر دلفریب ہے! باغ میں ہر طرف ستارے (خوشۂ پروین) اُگ رہے ہیں!

---

[1] یہ تصریحات پروفیسر یوسف سلیم چشتی کی کتاب شرح پیام مشرق سے لی گئی ہیں۔ دیکھو صفحات ۲۷۴ - ۲۷۷

زمیں از بہاراں چو بالِ تدروے
ز فوارہ الماس بار آبشارے

بہار کی وجہ سے زمین تدرو[1] کے پروں کی طرح خوشنما ہو گئی ہے۔ آبشاروں کا جو پانی فواروں سے نکل رہا ہے وہ الماس کی طرح سفید ہے گویا فواروں سے ہیرے برس رہے ہیں۔

نہ پیچد نگہ جز کہ در لالہ و گل
نہ غلطد ہوا جز کہ بر سبزہ زارے

جس طرف نظر اٹھاؤ لالہ اور گلاب کے پھول کھلے ہوئے ہیں اور ہر طرف سبزہ لہلہا رہا ہے۔

لبِ جو خود آرائیِ غنچہ دیدی؟
چہ زیبا نگارے چہ آئینہ دارے

نہر کے کنارے کلیاں کس قدر حسین معلوم ہوتی ہیں گویا ایک حسینہ آئینہ میں اپنا منہ دیکھ رہی ہے۔

چہ شیریں نوائے چہ دلکش صدائے
کہ می آید از خلوتِ شاخسارے
بر تن جاں بہ جاں آرزو زندہ گردد
ز آوائے سارے ز بانگِ ہزارے

درختوں کی خلوت سے خوشنوا پرندوں کے گانے کی کیسی سریلی آوازیں آ رہی ہیں! بلاشبہ سار اور ہزار (بلبل) کی آواز سے جسم میں روح اور روح میں وصل کی آرزو پیدا ہو جاتی ہے۔

نواہائے مرغِ بلند آشیانے
در آمیخت با نغمۂ جوئبارے

پرندوں کے گانے کی آوازیں اور آبشار اور جوئبار کے نغمے مل کر عجیب دلکشی کا عالم پیدا کر رہے ہیں۔

تو گوئی کہ یزداں بہشتِ بریں را
نہاد است در دامنِ کوہسارے
کہ تا رحمتش آدمی زادگاں را!
رہا سازد از محنتِ انتظارے

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے کشمیر کے اس بے نظیر خطے میں جنت لا اتاری ہے تاکہ انسان اس کے انتظار کی زحمت سے رہائی حاصل کر سکے یعنی جیتے جی جنت کا لطف اٹھا سکے۔

چہ خواہم دریں گلستاں گر نہ خواہم
شرابے، کتابے، ربابے، نگارے

---

[1] تدرو ماژندران میں ایک نہایت خوش رنگ پرندہ ہوتا ہے۔

باغ میں سماں ایسا ہے کہ طبیعت خواہ مخواہ شراب، کتاب (غزل)، رباب (موسیقی) اور نگار (محبوب) کی طرف راغب ہو جاتی ہے۔

یہاں سے گریز شروع ہوتا ہے اور شاعر ساقی (خدا) سے التجا کرتا ہے کہ:-

سرت گردم اے ساقیٔ ماہ سیما
بیار از نیاکان ما یادگارے

اے ساقی ماہ طلعت، تیرے قربان! بزرگوں کی یاد دلوں میں از سر نو تازہ کر دے!

بہ ساغر فرو ریز آبے کہ جاں را
فروزد چو نورے بسوزد چو نارے

ہمارے ساغر میں ایسی شراب ٹپکا دے جو قلب کو تڑپا دے اور روح کو گرما دے۔ یعنی ہمارے دلوں میں آزادی کا ایسا جذبہ پیدا کر دے جو ہمیں سرفروشی پر آمادہ کر دے۔

شقائق بروياں ز خاک نژندم
بہشتے فرو چیں بہ مشت غبارے

مری سرنگوں اور خوار قوم میں مجاہد نوجوان پیدا کر دے تاکہ یہ مشت غبار دنیا میں عیش و عشرت سے ہمکنار ہو جائے۔

نہ بینی کہ از کاشغر تا بہ کاشاں
ہماں یک نوا بالد از ہر دیارے

تو دیکھتا نہیں کہ کاشغر (ترکستان) سے کاشان (ایران) تک ہر شہر سے ایک ہی آواز بلند ہو رہی ہے۔

ز چشم امم ریخت آں اشک نابے
کہ تاثیر او گل دماند ز خارے

قوموں کی آنکھ نے اپنی پستی اور ذلت پر ایسے آنسو گرائے ہیں کہ ان کی تاثیر سے کانٹوں سے پھول اُگ آئے ہیں۔

کشیری کہ با بندگی خو گرفتہ
بتے می تراشد ز سنگ مزارے

غلامی نے کشمیریوں کی فطرت ایسی مسخ کر دی ہے کہ اُنھوں نے بت پرستی کو اپنا شعار بنا لیا ہے۔

ضمیرش تہی از خیال بلندے
خودی ناشناسے ز خود شرمسارے

پست ہمتی سے ان میں کوئی بلند خیالی پیدا نہیں ہوتی۔ وہ اپنی خودی سے بیگانہ اور ذلت و رسوائی کی اس منزل میں ہیں جہاں انسان کو اپنی ہستی سے خود شرم آتی ہے۔

بریشم قبا خواجہ از محنت او
نصیب تنش جامۂ تار تارے

ان کی محنت کے صدقے میں آقا ریشمی قبا پہنتے اور شال دوشالے اوڑھتے ہیں لیکن ان کے اپنے مقدر میں تن پر پھٹے چیتھڑوں کے سوا کچھ نہیں۔

نہ در دیدۂ او فروغ نگاہے
نہ در سینۂ او دل بے قرارے

نہ ان کی آنکھ میں روشنی ہے نہ ان کے سینے میں دل، یعنی نہ ان کی عقل ہے نہ عزم۔

ازاں مے فشاں قطرۂ بر کشیری
کہ خاکسترش آفریند شرارے

اے خدا! اس شراب یعنی جذبۂ حریت سے کشمیری مسلمانوں کو بھی سرشار کردے تاکہ وہ آزادی کی نعمت سے مالا مال ہو سکیں۔

اقبال کو یقین تھا کہ اگر ان کے ہم وطن ان کے اقوال پر عامل ہوئے تو ایک دن اُن کی حالت یقیناً بہتر ہو جائے گی۔ مگر بعض لوگوں نے شکوہ کیا کہ اس نظم میں کشمیریوں کی ہجو کی گئی ہے۔ اقبال نے اس کی تردید کرتے ہوئے اپنے ۲۶ مئی ۲۳ء کے خط میں میر خورشید احمد (فارن آفس دہلی) کو لکھا:۔

"ساقی نامہ کشمیر کے متعلق بعض لوگوں کا گلہ سن کر تعجب ہوا۔ افسوس ہے ہندوستان سے فارسی رخصت ہو گئی۔ سعدی نے محض قومی رقابت سے کشمیریوں کی ہجو کی ہوگی کیونکہ ایک زمانے میں کشمیر ایران کا ہمسر رہ چکا ہے۔ میں نے تو دکھڑا رو دیا ہے اور یہ بات سیاق اشعار سے صاف ظاہر ہے۔ دکھڑے کی بنا بھی واقعات پر ہے جس کا میں نے کشمیر میں خود مشاہدہ کیا۔ پنجاب کے کشامرہ کی حالت کشمیر کے کشامرہ سے بدرجہا بہتر ہے۔ نظم کا موضوع کشامرۂ کشمیر ہیں نہ کشامرۂ پنجاب۔ جو لوگ میرے اشعار کو کشمیریوں کی ہجو تصور کرتے ہیں وہ شعر کے مذاق اور مقاصد سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ ان کے لئے یہی جواب کافی ہے کہ میرے آباد اجداد اہل خطہ میں سے ہیں"۔

## ادبیاتِ کشمیر

کشمیر کے فارسی لٹریچر کی اقبال کے دل میں بڑی قدر و منزلت تھی۔ ملا طاہر غنی کشمیری کی شخصیت سے وہ اس قدر متاثر تھے کہ ان کے استغنا کا ذکر کرنے کے علاوہ ان کے بعض اشعار پر تضمینیں بھی لکھیں۔

کشمیر کے متعلق کتابیں لکھنے والوں کی بھی اقبال ہر طرح حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ بعض دوستوں کو خود بھی بعض عنوانات پر قلم اٹھانے کے لئے ابھارتے رہتے تھے۔ چنانچہ ۸ جون ۱۹۱۷ء کے ایک خط میں منشی محمد الدین فوق مدیر اخبار کشمیری لاہور کو لکھتے ہیں:۔

"کشمیر اور اہل کشمیر پر مختلف کتابیں لکھ کر آپ نے مسلمانوں پر اور ان کے لٹریچر پر احسان کیا ہے۔ البتہ کشامرہ کی قبر پرستی ایک ایسا مضمون ہے جس پر جہاں تک مجھے معلوم ہے آپ نے اب تک کچھ نہیں لکھا۔ اس طرف سب سے زیادہ

توجہ کی ضرورت ہے۔
رسالہ رہنمائے کشمیر جو حال میں آپ کے قلم سے نکلا ہے، نہایت مفید اور دلچسپ ہے۔ طرز بیان بھی دلکش ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ رسالہ عام لوگوں کے لئے نہایت مفید ہوگا۔ افسوس ہے میں آج تک کشمیر کی سیر نہیں کر سکا، لیکن امسال ممکن ہے آپ کا رسالہ مجھے بھی اُدھر کھینچ لے جائے۔"

۱۹۲۲ء میں جب کشمیر کے مشہور شاعر غلام احمد مہجور نے تذکرہ شعرائے کشمیر لکھنے کا ارادہ کیا اور اقبال سے اس سلسلے میں مدد اور مشورہ طلب کیا تو آپ نے اپنے ۱۲ مارچ ۱۹۲۲ء کے خط میں ان کی حوصلہ افزائی ان الفاظ میں کی:۔

مجھے یہ معلوم کر کے کمال مسرت ہوئی کہ آپ تذکرہ شعرائے کشمیر لکھنے والے ہیں۔ میں کئی سالوں سے اس کے لکھنے کی تحریک کر رہا ہوں مگر افسوس کسی نے ادھر توجہ نہ کی۔ آپ کے ارادوں میں اللہ تعالیٰ برکت دے۔

افسوس کہ کشمیر کا لٹریچر تباہ ہوگیا۔ اس تباہی کا باعث زیادہ تر سکھوں کی حکومت اور موجودہ حکومت کی لاپروائی، نیز مسلمانان کشمیر کی غفلت ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ وادیٔ کشمیر کے تعلیم یافتہ مسلمان اب بھی موجودہ لٹریچر کی تلاش وحفاظت کے لئے ایک سوسائٹی بنائیں؟ ہاں تذکرہ شعرائے کشمیر لکھتے وقت مولانا شبلی کی شعرالعجم آپ کے پیش نظر ہونی چاہیئے۔ محض حروف تہجی کی ترتیب سے شعرا کا حال لکھ دینا کافی نہیں ہوگا۔ کام کی چیز یہ ہے کہ آپ کشمیر میں فارسی شعر کی تاریخ لکھیں۔ مجھے یقین ہے کہ ایسی تصنیف نہایت بار آور ہوگی اور اگر کبھی خود کشمیر میں یونی ورسٹی بن گئی تو فارسی زبان کے نصاب میں اس کا کورس ہونا یقینی ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ کشمیر کی قسمت عنقریب پلٹا کھانے والی ہے۔

امید ہے جناب کا مزاج بخیر ہوگا۔

میرے پاس کوئی رسالہ تذکرہ شعرا کے لئے نہیں ہے۔ ورنہ آپ کی خدمت میں ارسال کرتا۔ والسلام"

اسی طرح ۱۹ دسمبر ۱۹۲۲ء کے ایک خط میں منشی محمد الدین فوق کو لکھا:۔

"شباب کشمیر ضرور لکھئے، بہت مفید کتاب ہوگی۔ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ کشمیر کے لوگوں میں خودداری کی روح پیدا کی جائے۔ میں نے بھی ایک نظم اس مضمون پر لکھی ہے جو عنقریب فارسی مجموعہ (پیام مشرق) میں شامل ہوگی۔ افسوس ہے مجھے تاریخ کشمیر سے بہت کم آگاہی ہے۔ ممکن ہے پنڈت شیو نرائن شمیم آپ کی مدد کر سکیں۔ راج ترنگنی غالباً ان کے پاس ہے۔ اگر نہ ہوئی تو پنجاب پبلک لائبریری سے ضرور مل جائے گی۔"

کشمیر میں جس قدر صوفیائے کرام تبلیغ اسلام کی خاطر آئے ان میں حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی کو سب سے زیادہ شہرت اور کامیابی حاصل ہوئی۔ اقبال ان کی عظمت، بزرگی، غیر معمولی شخصیت اور ان کے شاندار کارناموں سے بہت متاثر تھے۔ انھوں نے جاوید نامہ میں ان کا ذکر بڑے پرخلوص الفاظ میں کیا ہے جن کے حرف حرف سے عقیدت ٹپکتی ہے۔

حضرت سید علی ہمدانی ولی کامل ہونے کے علاوہ ایک بلند پایہ عالم دین اور صاحب قلم بھی تھے۔ آپ نے کشمیر میں بیٹھ کر وہاں کی ضرورت کے مطابق بہت سی کتابیں تصنیف کیں اور اس طرح جہالت کے عفریتوں کے خلاف زبردست قلمی جہاد کیا۔ آپ نے اپنے وعظ و تبلیغ سے اسلام پھیلایا اور لوگوں کو سیدھا راستہ دکھا کر مسلمان کیا۔ کشمیر کے لوگ آج

تک ان کی عزت کرتے اور ان کا نام بڑے ادب و احترام سے لیتے ہیں۔ سری نگر کی خانقاہ معلی جہاں بیٹھ کر آپ عبادت الٰہی کیا کرتے تھے، بڑی متبرک خیال کی جاتی ہے۔ اقبال کو ان کی تصنیفات دیکھنے کا کس قدر شوق تھا اس کا اندازہ آپ کے ایک خط کی مندرجہ ذیل عبارت سے کیا جا سکتا ہے:۔

"ذخیرۃ الملوک (مصنفہ امیر کبیر سید علی ہمدانی) کے دیکھنے کا میں بھی مشتاق ہوں۔ سنا ہے کوئی شخص کشمیر میں اس کا ترجمہ اُردو میں کر رہا ہے۔" [1]

یہ کتاب سید صاحب نے غالباً کشمیر کے سلاطین کی ہدایت کے لئے لکھی تھی۔ اس کا ایک عمدہ قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن میں موجود ہے جس کے ۲۵۰ صفحات ہیں اور ہر صفحہ میں پندرہ سطریں۔ ۱۳۲۱ھ میں یہ کتاب مطبع افغانی امرتسر نے شائع کی تھی۔ اس میں معرفت الٰہی، دین حقانی، معرفت بشری، نفس انسانی، مکارم اخلاق، حسن معاشرت، لوازم حکومت اور جملہ امور مزدوری پر بحث کی گئی ہے۔ اس کا اُردو ترجمہ بھی منہاج السلوک کے نام سے ۱۳۳۴ھ میں لاہور سے شائع ہوا تھا۔

سید صاحب کے کمالات کا اعتراف اقبال نے جاوید نامہ میں بھی کیا ہے۔ اقبال کی یہ ہمیشہ زندہ رہنے والی فارسی کتاب ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ ایک قسم کا خیالی سفر نامہ ہے جس میں شاعر نے مختلف آسمانوں کی سیر کا حال بیان کیا ہے۔ وہ چاند ستاروں میں پہنچتا ہے جہاں اسے دنیا کی مشہور ہستیاں ملتی ہیں۔ شاعر ان سے باتیں کرتا ہے اور باتوں ہی باتوں میں اپنے قیمتی خیالات پیش کرتا چلا جاتا ہے۔

اس کے بعد شاعر ایک ایسی اونچی جگہ پہنچ جاتا ہے جس کی کوئی حد نہیں۔ اس جنت میں اسے کشمیر کے دو بزرگ نظر آتے ہیں جن میں ایک تو سید علی ہمدانی ہیں اور دوسرے ملا طاہر غنی۔ سید علی ہمدانی کا تعارف اقبال ان الفاظ میں کراتے ہیں:

| | |
|---|---|
| سید السادات، سالار عجم | دست او معمار تقدیر امم |
| تا غزالی درس اللہ ہو گرفت | ذکر و فکر از دودمان او گرفت |
| مرشد آں کشور مینو نظیر | میر و درویش و سلاطیں را مشیر |
| خطہ را آں شاہ دریا آستیں | داد علم و صنعت و تہذیب و دیں |

یعنی وہ سیدوں کے سردار، عجمیوں کے سالار اور امتوں کی تقدیر کے معمار تھے۔ امام غزالی جیسے بزرگوں نے انھی کے خاندان سے علمی اور روحانی فیض حاصل کیا۔ انھوں نے کشمیر کے باشندوں کو راہ حق دکھا کر مسلمان کیا۔ وہ سردار بھی تھے، درویش بھی اور بادشاہوں کے مشیر و صلاح کار بھی۔ انھوں نے کشمیر کو علم، صنعت، تہذیب اور دین کی نعمت سے مالا مال کیا۔

ملا طاہر غنی کشمیر کا ایک مشہور شاعر تھا۔ وہ بڑا خود دار، غیرت والا اور ریاضت کا یکتا تھا۔ اس نے ساری عمر کسی بادشاہ

---

[1] یہ خط ۵ مئی ۱۹۲۶ء کو منشی محمد الدین فوق کے نام لکھا گیا۔

کی مدح نہیں کی۔ اس کا فارسی کلام آج تک لوگوں میں مقبول ہے۔

شاعر یعنی اقبال ان دونوں بزرگوں سے ملتا ہے اور کشمیر کے متعلق بات چیت کرتا ہے۔ باتوں باتوں میں اس دردناک تاریخی سانحہ کا ذکر بھی آتا ہے جب کشمیر کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ کئے بغیر اس کے بد اندیش انگریز حکمرانوں نے پچھتر لاکھ روپیہ لے کر یہ علاقہ ڈوگروں کے راجہ گلاب سنگھ کے ہاتھ بیچ دیا اور اس نے کشمیریوں کو اپنا غلام بنا لیا۔

دہقان و کشت و جوئے و خیابان فروختند     قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

اقبال نے شاہ ہمدان سے سوال کیا: "میں آپ سے یہ بھید معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اگر خدا کی مرضی یہ تھی کہ بندے اس کی اطاعت کریں تو اس نے شیطان کو کیوں پیدا کیا۔ جب اسے یہ بھی معلوم تھا کہ شیطان اس دنیا میں بدی اور برائی ایسی خوبصورت شکل میں پیش کرے گا کہ بندے خود بخود اس کی طرف مائل ہو جائیں گے۔ برائی بڑی دل کش ہوتی ہے اس لئے کمزور انسان کس طرح اس سے بچ کر اچھے کام کر سکتے ہیں"؟

شاہ ہمدان نے اس کے جواب میں فرمایا: "اے اقبال! تیرے دل میں یہ خیال اس لئے پیدا ہوا کہ تو انسان کی ان قوتوں سے واقف نہیں جو پوشیدہ ہیں اور نظر نہیں آتیں۔ بات یہ ہے کہ جو شخص ان قوتوں سے واقف ہو جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کی ذات میں چھپا رکھی ہیں تو وہ برائی سے بھی اپنے لئے بھلائی پیدا کر لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو پیدا تو کیا ہے اور دیکھنے میں یہ برائی ہے، مگر اس لئے نہیں کہ انسان اس سے دوستی پیدا کرے بلکہ اس لئے کہ وہ اس سے جنگ کرے۔ اگر اس نے ایک طرف شیطان کو پیدا کیا ہے تو دوسری طرف یہ بھی بتا دیا ہے کہ جو چیز انسان کے حق میں بری ہے وہ شیطان نہیں بلکہ اس سے دوستی ہے۔ اگر انسان اس سے لڑے تو یہی برائی اس کے لئے بھلائی بن سکتی ہے"۔

"شاید اس مثال سے یہ بات تیری سمجھ میں آ جائے۔ تو انسان کو تلوار سمجھ اور شیطان کو سان کا پتھر۔ انسان جس قدر اس کی مخالفت کرے گا اسی قدر اس کی پوشیدہ قوتیں چمکیں گی۔ کبھی تو نے اس شخص کو دیکھا ہے جو تلوار کو سان پر چڑھاتا ہے۔ اگر وہ تلوار کو سان کا دوست بنا دے یعنی تلوار کو سان کی حرکت کے ساتھ حرکت دے تو قیامت تک تلوار میں دھار نہیں آ سکتی۔ لیکن وہ اس کے خلاف عمل کرتا ہے۔ تلوار کو سان کی حرکت کے خلاف حرکت دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تلوار میں دھار پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لئے جس طرح تلوار سان سے جنگ کرتی ہے اور اس جنگ ہی کی بدولت کاٹ کرنے والی شمشیر بن جاتی ہے، اسی طرح انسان شیطان سے جنگ کر کے خدا کا فرماں بردار بندہ بن جاتا ہے"۔

"مسلمان کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ ہر وقت شیطان سے جنگ کرتا رہے۔ پس تو اس کی مخالفت کر کے روز بروز اپنی تلوار کی دھار تیز کرتا چلا جا تاکہ تیری ضرب کاری ہو۔ اگر تو اس بھید سے بے خبر رہے گا اور مخالفت کی بجائے شیطان سے دوستی پیدا کرے گا تو دنیا اور آخرت دونوں میں رسوا ہو جائے گا"۔

شاہ ہمدان کو مہربان پا کر اقبال نے دوسرا سوال کیا: "اے مرشد! دنیا کی حالت یہ ہے کہ انسان کو انسان کھائے جاتا ہے۔ ایک قوم دوسری قوم کے خون کی پیاسی ہے۔ آج کل کشمیر کے لوگوں کی حالت نہایت خراب ہے۔

ان کے چاروں طرف مشکلات کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ ہر شخص مصیبت میں گرفتار ہے۔ اگرچہ کشمیر کے مسلمان علم، فن، عقل، فہم اور صنعت و حرفت میں کسی سے پیچھے نہیں، لیکن وہ اپنے آپ سے غافل ہیں اور اپنے ہی وطن میں ذلت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ایک مدت سے کافروں کے غلام ہیں اور اس غلامی کی وجہ سے ان کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا ہے حالانکہ یہ قوم ہمیشہ سے ایسی ذلیل نہ تھی۔ کبھی فوجوں کے منہ پھیرنے والی اور حکومت چلانے والی تھی۔ مجھے یہ بتایا جائے کہ اس ذلت کا سبب کیا ہے؟ کیا وجہ ہے کہ صدیوں سے اس ملک میں کوئی شہاب الدین پیدا نہیں ہوا جس نے بہت سے ملک فتح کئے تھے؟

شاہ ہمدان نے جواب دیا: "اے اقبال! میں تجھے ایک باریک نکتہ سمجھاتا ہوں۔ پوری توجہ سے سن۔ اگر مسلمان دنیا میں دوبارہ عزت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انھیں اس حقیقت کو ذہن میں رکھنا چاہئے کہ انسان دو چیزوں سے مل کر بنا ہے۔ ایک روح، دوسرے بدن۔ تن سراسر مٹی ہے اور جان ایک قیمتی جوہر۔ اس لئے جان کی حفاظت کے لئے جسم کو قربان کرنا زندہ رہنے کی پہلی شرط ہے۔ اگر تو جسم کے کسی حصّہ کو جسم سے جدا کر دے تو وہ تیرے ہاتھ سے جاتا رہے گا یعنی ضائع ہو جائے گا۔ لیکن اگر تو اپنی جان کو اپنے سے جدا کر دے تو وہ تجھے پھر حاصل ہو جائے گی۔"

"ہر انسان جسم کا قیدی ہے لیکن جو شخص اپنے آپ سے آگاہ ہو جاتا ہے وہ جسم کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اور پھر یہ جان جس کو بچانے کے لئے وہ پناہ ڈھونڈتا ہے اس کی نگاہ میں ہوا سے بھی سستی ہو جاتی ہے اور وہ نہایت اطمینان کے ساتھ کفن سر سے باندھ کر میدان جنگ میں کود پڑتا ہے اور ہمیشہ کی زندگی حاصل کر لیتا ہے۔"

"اے اقبال! یاد رکھ کہ اگر تو اپنی جان قربان کر دے تو تیری جان ہمیشہ کے لئے تیری ہو جائے گی اور اگر تو موت کے ڈر سے گھر میں چھپ کر بیٹھ رہے گا تو غور سے سن لے کہ تیری جان تیرے پاس تھوڑے عرصہ کی مہمان ہے، آخر ایک دن مرنا ہے۔"

اک موت کا بھی دن ہے دو دن کی زندگی میں

جو لوگ خدا کی راہ میں جان دینے سے جی چراتے ہیں، ان سے پوچھو کہ کیا تم اسی طرح ہمیشہ زندہ رہ سکو گے؟ کیا تم موت کو کسی طرح ٹال سکتے ہو؟ جو شخص جان دیتا ہے وہ دراصل اسے واپس لیتا ہے اور ہمیشہ کے لئے زندہ ہو جاتا ہے۔ اور جو اپنی جان نہیں دیتا وہ اسے ضائع کرتا ہے اور فنا ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد اقبال بھرتری ہری، نادر شاہ، احمد شاہ ابدالی اور سلطان ٹیپو شہید سے ایک ایک کر کے ملتا ہے اور اس جوش و خروش کا نظارہ کرتا ہے جو ان کے سینوں کو گرمائے ہوئے تھا۔

یہاں سے شاعر لوٹنے کی ٹھانتا ہے کہ غیب سے کچھ آوازیں آتی ہیں اور آخر میں نور کی شعاعیں کچھ اس طرح ہر طرف ابھرتی ہیں کہ شاعر نور کے سیلاب میں ڈوب کر گم ہو جاتا ہے اور اس طرح یہ دلچسپ روحانی سفر ختم ہو جاتا ہے۔

## تحریک کشمیر

اقبال نے ہندوستان اور اس کے مختلف خطوں کی تعریف میں بہت سی نظمیں کہی ہیں۔ ایک نظم میں یہ دعویٰ کیا

ہے کہ ہندوستانیوں کو آزادی کی دعوت سب سے پہلے کشمیریوں نے دی :-

ہند را ایں ذوقِ آزادی کہ داد — صید را سودائے صیادی کہ داد

ایں برہمن زادگانِ زندہ دل — لالۂ احمر ز روئے شاں خجل

تیز بین و پختہ کار و سخت کوش — از نگاہ شاں فرنگ اندر خروش

اصل شاں از خاکِ دامنگیر ماست — مطلعِ ایں اختراں کشمیر ماست

اقبال خود نو مسلم کشمیری برہمن تھے۔ پنڈت موتی لعل اور جواہر لعل بھی کشمیری برہمن ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے اس دعوے کی صداقت میں کیسے شبہ کیا جا سکتا ہے ؟

۱۹۳۱ء کی تحریکِ حریت کشمیر کے دنوں میں اقبال کشمیر کے حالات کا بڑے غور سے مطالعہ کیا کرتے اور کشمیری مسلمانوں کے سب سے بڑے ہمدرد تھے۔ فرماتے تھے کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے' توقع کے خلاف نہیں۔ ممکن ہے کبھی اس سے بھی زیادہ انقلاب کشمیر میں آئے[1] چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

ریاستی نظم و نسق کی خرابی اور مسلمانوں کی زبوں حالی کے باعث کشمیر میں پہلے ہی سے بے چینی موجود تھی۔ لیکن ایکا ایکی ایک دو ایسے واقعات پیش آئے جن سے مسلمان بھڑک اٹھے۔ ایک واقعہ تو یہ تھا کہ مسلمان ایک جگہ نماز کے لئے جمع تھے اور امام خطبہ پڑھنے والا تھا کہ ایک ہندو سب انسپکٹر پولیس نے امام کو خطبہ پڑھنے سے روک دیا۔

دوسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ جموں سنٹرل جیل میں ایک ہندو کانسٹیبل نے قرآن مجید کی بے حرمتی کی۔ اس پر ایک شخص نے اشتعال انگیز تقریر کی۔ پولیس نے اسے گرفتار کر لیا۔ ۱۳ جولائی ۳۱ء کو مقدمہ عدالت میں پیش تھا کہ وہاں بھی مسلمان کثیر تعداد میں جمع ہو گئے۔ اس ہجوم کو منتشر کرنے کے لئے پولیس نے گولی چلائی جس سے دس بارہ اشخاص شہید ہو گئے۔ اس کے بعد کشمیر کے مختلف مقامات پر مسلمانوں نے مظاہرے کئے اور پولیس نے انہیں سختی سے دبا دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان مظاہروں نے فرقہ وار فسادات کی صورت اختیار کر لی۔ جب حالات حکومت کشمیر کے قابو سے باہر ہو گئے تو اس نے برطانوی فوج کی مدد طلب کی[2]

اب کشمیر میں تشدد اور سخت گیری کا دور دورہ شروع ہوا اور مسلمانوں کو پکڑ پکڑ کر جیلوں میں ٹھونسا جانے لگا ان کی تعلیمی حالت پہلے ہی پست تھی، افلاس و جہالت نے برا حال کر رکھا تھا، سرکاری ملازمتوں کے دروازے ان پر بند تھے، مذہبی آزادی نام کو نہ تھی، پریس اور پلیٹ فارم پر پابندیاں عائد تھیں، کئی عبادت گاہیں حکومت کے قبضہ میں تھیں غرض ہر طرح ان پر عرصۂ حیات تنگ تھا۔ ایسے ناگفتہ بہ حالات میں ریاست کے اندر کشمیر مسلم کانفرنس کا قیام عمل میں آیا جس نے مسلمانوں میں سیاسی شعور اور بیداری کا احساس پیدا کیا لیکن حکومت نے اس پر بھی پابندیاں لگا دیں۔

کشمیریوں کی اس بے بسی اور بے چارگی سے پنجاب کے مسلمان متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ ایک طرف تو جلسوا

---

[1] تاریخ اقوام کشمیر، جلد دوم صفحہ ۲۳۲ [2] بریف نوٹ ان ایڈمنسٹریشن آف جموں و کشمیر بابت ۱۹۳۱ء بحوالہ اقبال کا سیاسی کارنامہ

نے کشمیر کے ان مظالم کے خلاف عملی مظاہرے کئے اور ہزاروں کی تعداد میں جتھے بھیج بھیج کر کشمیر کی جیلیں بھر دیں، دوسری طرف کشمیر کمیٹی نے اہل کشمیر کی ہمدردی میں ایک دستوری اور پر امن تحریک چلائی اور آئینی ذرائع سے ان کو جائز انسانی حقوق دلانے کی کوشش کی۔ اقبال کشمیر کمیٹی کے ایک سرگرم رکن تھے۔ بلکہ جب مرزا بشیر الدین محمود (امیر جماعت احمدیہ قادیان) نے آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی صدارت ترک کر دی تو اقبال ہی ان کی جگہ اس کمیٹی کے صدر چنے گئے۔

کشمیر کمیٹی نے پہلا کام یہ کیا کہ جو مسلمان کشمیر کی جیلوں میں قید و بند کی مصیبتیں جھیل رہے تھے، ان کو ہر ممکن قانونی امداد بہم پہنچائی۔ اس سلسلہ میں اقبال نے اپنے ذاتی اثر و رسوخ سے بعض نامور وکلاء کو کشمیر روانہ کیا۔ پٹنہ کے مولوی نعیم الحق محض اقبال سے تعلق خاطر کے باعث کشمیریوں کی مدد کو پہنچ گئے۔ لاہور سے بھی بعض وکیل گئے جنھوں نے مقدمات کی پیروی کی۔ لیکن حکومت کشمیر نے بعض مسلم وکلاء کو حدود ریاست سے خارج کر دیا اور بعض کے داخلے پر امتناع عائد کر کے مسلمان سیاسی قیدیوں کو حقوق مدافعت اور مراعات سے محروم کر دیا۔

اقبال ہی کی مساعی سے حکومت کشمیر نے گلانسی کمیشن مقرر کیا جس نے تحقیقات کے بعد اپنی رپورٹ میں سفارش کی کہ کشمیر میں مکمل مذہبی آزادی ہو، مذہبی عبادت گاہوں سے سرکاری قبضہ ہٹا کر انہیں عوام کے سپرد کیا جائے تعلیم کی اشاعت عام کی جائے، ابتدائی مدارس زیادہ کھولے جائیں، مسلم اساتذہ کی تعداد بڑھائی جائے، ایک خاص عہدہ دار مسلمانوں کی تعلیم کے انتظام کے لئے مقرر کیا جائے، تمام ملازمتوں کی باقاعدہ تشہیر ہو اور ہر فرقہ کے لوگوں کو اس کے تناسب سے حصہ دیا جائے[۱]۔

ان دنوں اقبال آل انڈیا مسلم کانفرنس کے بھی صدر تھے۔ آپ نے کشمیر کے مسئلہ کو مسلم کانفرنس کے پلیٹ فارم سے بھی پیش کیا اور اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا:

"جہاں تک کشمیر کا تعلق ہے، میرے لئے یہ ضروری نہیں کہ اس ملک میں جو واقعات ابھی حال ہی میں رونما ہوئے ہیں، ان کا تاریخی پس منظر بیان کروں۔ ایسے لوگوں کی بظاہر یکایک بیداری، جن کی خودی کا شعلہ تقریباً بجھ چکا تھا، ان تمام اشخاص کے لئے جنھیں موجودہ ایشیائی عوام کی اندرونی کشمکش کے متعلق بصیرت حاصل ہے، ایک مژدہ جاں فزا ہونا چاہیئے۔ کشمیر کے عوام کے مقاصد بالکل درست ہیں اور مجھے اس معاملہ میں کوئی شک نہیں کہ اس ذہین اور ہوشیار قوم میں اپنی شخصیت کے احساس کا احیاء نہ صرف ریاست کی تقویت کا باعث ہوگا بلکہ پورے ہندوستان کے عوام کے لئے ایک ذریعۂ قوت بنے گا۔"

"تمام دنیا میں عوام کے اندر جو احساس خود آگاہی پیدا ہو گیا ہے، وہ اپنے آپ کو تیار کروانا چاہتا ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ اس نظم و نسق میں جو ان پر حکمرانی کر رہا ہے، حصہ دیا جائے۔ سیاسی تربیت غیر ترقی یافتہ عوام کے لئے مناسب ہے۔ لیکن جب عوام کا بدلا ہوا نقطۂ نظر نظم و نسق میں انقلاب آفریں اصلاح کا طالب ہو تو نظم و نسق کا مفاد یہ ہے کہ اس سے انکار نہ کیا جائے۔ کشمیر کے خاص حالات کے باعث دیگر امور کے علاوہ اس ملک کے عوام ایک قسم کی عوامی مجلس مقننہ کا

---

[۱] خلاصہ رپورٹ گلانسی کمیشن صفحہ ۵۱

مطالبہ کر رہے ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ ریاست کے والی اور حکومت ہند دونوں عوام کے اس مطالبہ پر مناسب غور کریں گے۔ مجھے اس میں شبہ نہیں کہ نئے وزیر اعظم[1] اپنی برطانوی نظم و نسق کی ماہرانہ خصوصیات کے ساتھ معاملات کی تہ تک پہنچ جائیں گے اور خوش مزاج لیکن رو ندے ہوئے عوام — ایسے عوام جنھوں نے قدیم ہندوستان کو بعض بہترین دماغ عطا کئے تھے اور بعد میں مغل ثقافت کو حقیقی دلکشی بخشی تھی — کی کارفرمائی کے لئے کوئی نہ کوئی دائرہ عمل متعین کر دیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ ہمارے ملک کی طرح کشمیر میں بھی دستوری اصلاحات کی راہ میں دشواریاں ہوں لیکن دیرپا امن اور نظم و ضبط کا تقاضا ہے کہ ان دشواریوں پر جلد از جلد قابو پا لیا جائے۔ اگر موجودہ بحران کے مضمرات کو پوری طرح نہیں سمجھا گیا اور اس کے اسباب کا ان گوشوں میں پتہ چلانے کی کوشش کی گئی جہاں وہ نہیں پائے جاتے، تو مجھے ڈر ہے کہ حکومت کشمیر اپنے مسئلہ کو اور زیادہ پیچیدہ بنانے کی[2]

گلانسی کمیشن کی رپورٹ کی بنا پر حکومت کشمیر نے ایک اعلامیہ کے ذریعے کشمیر میں مکمل مذہبی آزادی کا اعلان کیا اور جن جن مساجد پر سرکاری قبضہ تھا ان کو واگذار کیا۔ اذان میں مداخلت کو جرم قرار دیا اور گلانسی کمیشن کی دیگر سفارشات کو روبہ عمل لانے کا وعدہ کیا۔

اس سلسلے میں حضرت علامہ کے بہت سے بیانات اس وقت کے اخباروں میں نظر آتے ہیں جن میں سے چند ایک کتاب 'حرف اقبال' میں محفوظ کر دیئے گئے ہیں۔ ۷ جون ۱۹۳۳ء کے ایک بیان میں مسلمانان کشمیر کو مشورہ دیا گیا ہے کہ "وہ ان تحریکوں سے خبردار رہیں جو ان کے خلاف کام کر رہی ہیں اور اپنے درمیان اتفاق اور اتحاد پیدا کریں، کیونکہ جب تک کشمیر کو ایک سیاسی خیال پر متفقہ حمایت حاصل نہ ہوگی، ریاست کے لوگوں کے مفاد کی ترقی کے لئے لیڈروں کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔"[3]

اس کے بعد کچھ ایسا پیچ پڑا کہ کشمیر کمیٹی کے احمدی ارکان نے میرزا بشیر الدین محمود کے استعفا کے بعد کشمیر کے معاملات میں دلچسپی لینا کم کر دی، اور کشمیر کمیٹی کا کام سست پڑ گیا۔ کیونکہ احمدی کشمیر کمیٹی سے زیادہ اپنے امیر کے وفادار تھے اور امیر کے مشورہ اور حکم کے بغیر کوئی کام سرانجام دینا نہ چاہتے تھے۔ ان حالات میں اقبال نے اس کمیٹی سے استعفا دے دیا اور ۲۰ جون ۳۳ء کو ایک بیان میں فرمایا:

"کشمیر کمیٹی میں میری صدارت محض عارضی تھی۔ یاد رہے کہ کمیٹی کی تشکیل کشمیر میں غیر متوقع واقعات کے اچانک رونما ہونے پر صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے ہوئی تھی اور اس وقت یہ خیال تھا کہ اس قسم کی کمیٹی کی ضرورت بہت جلد ختم ہو جائے گی۔ اس لئے کمیٹی کا کوئی نظام مرتب نہیں کیا گیا تھا اور صدر کو آمرانہ اختیارات دے دیئے گئے تھے۔"

"یہ خیال کہ کشمیر کمیٹی کی ایک مستقل ادارہ کی حیثیت سے ضرورت نہ ہوگی، ریاست میں پیدا ہونے والے واقعات نے غلط ثابت کر دیا۔ بہت سے ممبروں نے اس لئے سوچا کہ کمیٹی کا ایک باقاعدہ نظام ہونا چاہئے اور عہدہ داروں کا نیا انتخاب

---

[1] کرنل کاوُن [2] اسپیچز اینڈ اسٹیٹمنٹس آف اقبال صفحہ ۵۰-۵۲ [3] حرف اقبال صفحہ ۲۱۹ - ۲۲۰۔

عمل میں آنا چاہیئے۔ کمیٹی کے ارکان اور اس کے طریق کار کے متعلق کچھ لوگوں کے اختلافات نے، جس کے اسباب کا بیان ذکر کرنا مناسب نہ ہوگا، اس خیال کی مزید تائید کی۔ چنانچہ کمیٹی کا ایک اجلاس طلب کیا گیا جس میں کمیٹی کے صدر نے اپنا استعفا پیش کیا اور وہ منظور ہو گیا۔"

"پچھلے ہفتہ کے آخری دنوں میں کمیٹی کا ایک اور اجلاس ہوا۔ اس میں ممبران کے سامنے نظام کا مسودہ پیش کیا گیا جس کی غرض و غایت یہ تھی کہ کمیٹی کی حیثیت ایک نمائندہ جماعت کی سی ہو۔ لیکن کچھ ممبروں نے اس سے اختلاف ظاہر کیا۔ بعد کے بحث مباحثہ اور گفتگو سے مجھے یہ پتہ چلا کہ یہ لوگ دراصل کمیٹی کو دو ایسے حصّوں میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں جن میں اتحاد صرف برائے نام ہی ہوگا۔ چنانچہ میں نے اپنا استعفا پیش کرنے سے پہلے ممبران کو اپنی رائے سے اچھی طرح آگاہ کر دیا تھا۔"

"بد قسمتی سے کمیٹی میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے مذہبی فرقے کے امیر کے سوا کسی دوسرے کا اتباع کرنا سرے سے گناہ سمجھتے ہیں۔ میں کسی صاحب پر انگشت نمائی نہیں کرنا چاہتا۔ ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے دل و دماغ سے کام لے اور جو راستہ پسند ہو اسے اختیار کرے۔ حقیقت میں مجھے ایسے شخص سے ہمدردی ہے جو کسی روحانی سہارے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے کسی مقبرہ کا مجاور یا کسی زندہ نام نہاد پیر کا مرید بن جائے۔ ان حالات کے پیش نظر مجھے اس امر کا یقین ہے کہ کمیٹی میں اب ہم آہنگی کے ساتھ کام نہیں ہو سکتا اور ہم سب کا مفاد اسی میں ہے کہ موجودہ کشمیر کمیٹی کو ختم کر دیا جائے۔"

"ساتھ ہی ساتھ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانان کشمیر کی راہنمائی اور مدد کے لئے برطانوی ہند میں ایک کشمیر کمیٹی ضرور ہونی چاہیئے، اس لئے اگر برطانوی ہند کے مسلمان اپنے کشمیری بھائیوں کی مدد کرنا چاہتے ہیں تو وہ مجاز ہیں کہ ایک کھلے عام اجلاس میں نئی کشمیر کمیٹی کی تشکیل کر لیں۔ موجودہ حالات کے پیش نظر مجھے صرف یہی ایک راستہ دکھائی دیتا ہے۔"

کشمیر کمیٹی کی تحلیل کے بعد بھی اس مسئلہ سے اقبال کی دلچسپی اور ہمدردی میں فرق نہ آیا۔ چنانچہ ۳۰ جون ۳۳ء کو آپ نے مسلمانان ہند سے مخلصانہ اپیل کرتے ہوئے فرمایا:

"گذشتہ چند سال سے مسلمانان خطہ جن مصائب و مشکلات میں مبتلا ہیں ان کے تذکرہ کی چنداں ضرورت نہیں، اس لئے کہ یہ وہ مصائب اور مشکلات ہیں جن کا چرچا نہ صرف آپ کے ہر شہر، ہر گاؤں اور ہر گھر میں ابتدا ہی سے رہا ہے اور اب تک موجود ہے بلکہ ان کا قومی احساس اکثر مواقع پر افراد قوم کے سوئے ہوئے ملی جذبات کو بیدار کر کے انہیں اخوت اسلامیہ کے بھولے ہوئے سبق از سر نو یاد دلانے اور ملت مرحوم کے فعال عناصر بنانے کا موجب بن چکا ہے۔ موجودہ زمانے میں ہندوستان کے اندر تحریک خلافت کے بعد تحریک کشمیر ہی ایک ایسی تحریک ہے جس سے خالص اسلامی جذبات کو عملی تشکیل کا موقع ملا اور اس نے قوم کے تن مردہ میں حیات تازہ کی لہر ایک دفعہ پھر دوڑا دی۔"

"جن قومی جماعتوں نے اہل خطہ کے ساتھ ہمدردی میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا ہے، آپ کو تسلیم ہوگا کہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کا نام ان کی صف اوّل میں ہے۔ مقصد ایک ہو تو مختلف جماعتوں اور اداروں کے عملی طریق ہائے کار کے اختلافات بجائے ضرر رساں ہونے کے بسا اوقات بے حد مفید ثابت ہوتے ہیں اور حصول مقصد کی سچی دھن میں انہیں

جس قدر نظر انداز کیا جائے اسی قدر بہتر ہے"۔

"آل انڈیا کشمیر کمیٹی نے اپنے مخصوص طریق کار کے مطابق نہ صرف اہل خطہ کے حالات و جذبات کی ایسی ترجمانی کی ہے کہ خود اہل خطہ بحالات موجودہ ویسی نہ کر سکتے، بلکہ کمیٹی نے کئی قسم کی گتھیوں کو سلجھانے، مصیبت زدوں کو مالی امداد بہم پہنچانے اور فسادات کے مقدمات کو اپنے ہاتھ میں لے کر ان کی پیروی کرنے میں نہایت قابل قدر خدمات انجام دی ہیں اور اب تک دے رہی ہے"۔

"ابتدائے کار سے کمیٹی نے حکومت ہند، برطانیہ اور برطانوی قوم پر اس حقیقت کو ظاہر کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی کہ کشمیر کا مسئلہ تمام مسلمانان ہندوستان کی سیاسی حیات و موت کا مسئلہ ہے۔ اہل کشمیر سے ناروا سلوک، ان کی جائز اور دیرینہ شکایات سے بے اعتنائی اور ان کے سیاسی حقوق کا تسلیم نہ کرنا، مسلمانان ہند کے حقوق کو تسلیم کرنے سے انکار ہے۔ حق بات بھی یہی ہے۔ اہل خطہ ملت اسلامیہ کا جزو لاینفک ہیں کہ ان کی تقدیر کو اپنی تقدیر نہ سمجھنا تمام ملت کو تباہی و بربادی کے حوالہ کر دینا ہے۔ اگر مسلمانوں کو ہندوستان میں ایک مضبوط و مستحکم قوم بننا ہے تو دو نکتوں کو ہر وقت ذہن میں رکھنا ہوگا۔ اوّل یہ کہ شمال مغربی سرحدی صوبہ کو مستثنیٰ کرتے ہوئے حدود ہندوستان کے اندر جغرافیائی اعتبار سے کشمیر ہی وہ حصّہ ہے جو مذہب اور کلچر کی حیثیت سے خالصتاً اسلامی ہے۔ اور ایسا اسلامی کہ اسلام نے وہاں خدا نخواستہ جبر و اکراہ سے گھر پیدا نہیں کیا بلکہ یہ بار ور پودا حضرت شاہ ہمدان جیسے نیک و کامل بزرگان دین کے پاک ہاتھوں کا لگایا ہؤا ہے اور انھی کی مساعی تبلیغ دین کا نتیجہ ہے جنھوں نے گھر بار اور وطن محض اس لئے ترک کئے کہ رسول اللہ کے لائے ہوئے پیغام سے ان دیار و ممالک کے بسنے والوں کو بہرہ ور کریں اور الحمد للہ کہ وہ بدرجۂ اتم کامیاب ہوئے۔ دوسری بات جسے، مسلمانان ہند کبھی نظر انداز نہیں کر سکتے یہ ہے کہ ان کی تمام قوم میں سب سے بڑھ کر اگر صناعی و ہنرمندی اور تجارت کو بخوبی پھیلانے کے جوہر نمایاں طور پر کسی طبقہ میں موجود ہیں تو وہ یہ اہل خطہ کا گروہ ہے۔ افسوس ہے کہ اہل کشمیر کی زبوں حالی انہیں اپنی قوم کا مفید عنصر بننے کے راستے میں مانع آ رہی ہے، بلکہ اقوام عالم کی اس نوع کی ترقی ان کی خدمات سے محروم ہے۔ ورنہ اگر ان کی زندگی بھی زندہ قوموں کی زندگی ہو تو ان کی صناعی و ہنرمندی کے طبعی جوہر ہندوستان کی اقتصادی حالت کو بدل دینے میں ممد ثابت ہوں"۔

"بہر حال اہل خطہ قومیت اسلامیۂ ہند، کے جسم کا بہترین حصّہ ہیں اور اگر وہ حصّہ درد و مصیبت میں مبتلا ہے تو ہو نہیں سکتا کہ باقی افراد ملت فراغت کی نیند سو سکیں"۔

"آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی جن مساعی کا ذکر ہؤا ان میں ہر ایک اہم ہے اور ہر ایک کی تکمیل ابھی بیسیوں عملی تدابیر کی محتاج ہے۔ لیکن تمام بھائیوں پر واضح رہنا چاہیئے کہ فسادات کے ماخوذین کی کہانی بے حد درد ناک ہے۔ ان کے مقدمے ابھی تک چلے جا رہے ہیں اور ان کی مصیبتوں کا سلسلہ ایک حد تک لا متناہی ہو رہا ہے۔ ہر چند ریاست کو اس امر پر آمادہ کیا جا رہا ہے کہ وہ مقدمات واپس لے کر ان مصیبت زدوں کو آلام سے نجات حاصل ہونے دے لیکن ظاہر ہے کہ یہ تصفیے کچھ طولانی سے ہیں۔ ریاست کے اندر پھر سے ایک ہیجان پیدا ہو گیا ہے۔ نہ معلوم یہ ہیجان اب کونسی راہ اختیار کرتا ہے۔

یہ ایک نیا مرحلہ آگیا ہے اور اس کے لئے نئی قربانیوں کی ضرورت ہوگی ۔ جو لوگ گذشتہ انقلاب سے ماخوذ ہیں اور ان پر مقدمات چل رہے ہیں ان کی طرف بھی توجہ میں ہرگز کوئی کمی نہیں آنی چاہیئے ۔ اب تک ان مقدمات کی پیروی خوش اسلوبی سے ہوئی ہے ۔ لیکن قوم کو اس حقیقت سے بے خبر نہیں رہنا چاہیئے کہ کشمیر کمیٹی کے پاس جو روپیہ فراہم شدہ تھا وہ خرچ ہوچکا ہے اور جب تک قوم روپیہ سے اعانت پر کمربستہ نہ ہوگی ، نہ تو نئی پیدا شدہ صورت حالات میں کوئی اہم کام سرانجام پاسکے گا اور نہ ان سینکڑوں ماخوذین کو قانونی امداد بہم پہنچانے کا کوئی ذریعہ ہوگا ۔ اس لئے تمام گذشتہ حالات اور موجودہ حالات کے آئندہ امکانات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم ملت اسلامیۂ ہند سے نہایت مخلصانہ پرزور اپیل کرتے ہیں کہ وہ حالات کی نزاکت کا صحیح اندازہ کرتے ہوئے اپنی پہلی قربانیوں میں مزید اضافہ کے لئے کمربستہ ہوجائیں اور جو اعانت وہ پہلے کرچکے ہیں اس کا اصلی نتیجہ بھی اسی وقت نیک ثابت ہوگا جب ان موجودہ مراحل پر پھر وہ اسلامی ایثار کا ثبوت دیں ۔ یہ افراد کی امداد نہیں بلکہ امت رسول کی امداد ہے ۔ اس اپیل کا اختتام حضور پر نور صلعم کی اس حدیث پر کرتا ہوں : ان اللہ متخلص ھذا الدین نفسا ولا یصلح لدینکم الا سخاء وحسن الخلق ، الافزینو دینکم بھا ( خدا نے دین اسلام کو اپنے لئے مخصوص کیا ہے اور دین کی درستی سخاوت اور حسن اخلاق سے ہے مسلمانو! اپنے دین کو ان ہر دو اوصاف سے آراستہ کرو)" ۔

## اقبال کے دل میں کشمیر کی اتنی محبت کیوں تھی ؟

اقبال نے اپنے اردو اور فارسی کلام میں جہاں کہیں کشمیر کا ذکر کیا ہے ، محبت اور دل سوزی سے کیا ہے ۔ پیام مشرق کی چند نظمیں پیش کی جاچکی ہیں ۔ جاوید نامہ کے کئی اشعار بھی دیدنی و شنیدنی ہیں ۔ آپ کی آخری کتاب ارمغان حجاز میں "ملازادہ ضیغم لولابی کا بیاض" ایک خاص عنوان ہے جس کے ماتحت کشمیریوں کی حالت زار بیان کرکے ان کو خودی و خودشناسی کی تعلیم دی گئی ہے ۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ آخر کیا وجہ تھی کہ ایک ایسا عظیم المرتبت اور عالمگیر شہرت رکھنے والا شاعر اور فلسفی جس کی تعلیم وطنیت اور ذات پات کی تقسیم سے بالاتر تھی ایک محدود خطہ کے مسلمانوں کی زبوں حالی اور مظلومیت کی داستانیں سن کر تڑپ اٹھتا اور کہتا تھا :

توڑ اس دست جفا کیش کو یارب جس نے ۔۔۔ روح آزادیٔ کشمیر کو پامال کیا

---

سرما کی ہواؤں میں ہے عریاں بدن اس کا ۔۔۔ دیتا ہے ہنر جس کا امیروں کو دوشالہ

---

نصیب خطہ ہو یارب وہ بندۂ درویش ۔۔۔ کہ جس کے فقر میں انداز ہو کلیمانہ

پھر ان کو عمل کے لئے اس طرح ابھارتا تھا :

نکل کر خانقاہی سے ادا کر رسم شبیری — کہ فقر خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری
ترے دین و ادب سے آ رہی ہے بوئے رہبانی — یہی ہے مرنے والی امتوں کا عالم پیری
شیاطین ملوکیت کی آنکھوں میں ہے وہ جادو — کہ خود نخچیر کے دل میں ہو پیدا ذوق نخچیری
چہ بے پروا گذشتند از نوائے صبحگاہ من
کہ برد آں شور و مستی از سیہ چشمان کشمیری

اور پھر یہ کہ :

سمجھا لہو کی بوند اگر تو اسے تو خیر ! — دل آدمی کا ہے فقط اک جذبۂ بلند
گردش مہ و ستارہ کی ہے ناگوار اسے — دل آپ اپنے شام و سحر کا ہے نقشبند
جس خاک کے ضمیر میں ہے آتش چنار
ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاک ارجمند

یہ بات تو یقیناً ہر شخص تسلیم کرے گا کہ اقبال کے ذہن کا حقیقی اور پختہ رنگ وہی تھا جو آخری زمانے میں نظر آتا ہے یعنی وہ جغرافیائی حدود اور قومی و نسلی بتوں کو توڑ کر ایک عالمگیر انسانی برادری قائم کرنا چاہتے تھے ۔ اس سے پہلے وہ جو کچھ کہتے تھے اس کی حیثیت محض تجربے کی سی تھی ۔ ان تجربات و نظریات میں بعض تو ایسے ہیں جنھیں انھوں نے اپنے بلند معیار کے مطابق پایا اور آخر تک نباہا اور اکثر ایسے ہیں جنھیں پست یا وقتی سمجھ کر چھوڑ دیا ۔ لیکن کشمیر اور اہل کشمیر سے محبت و ہمدردی کا معاملہ کسی پہلو سے بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہ تھا ۔ وہ خود کشمیری الاصل تھے ، کشمیر ان کے آباد اجداد کا وطن تھا ، کشمیر کی محبت وطن کے لحاظ سے بھی اور وہاں کے باشندوں کی تباہی و پامالی کے لحاظ سے بھی ان کی رگ رگ میں سمائی ہوئی تھی :

کشمیر کا چمن جو مجھے دلپذیر ہے — اس باغ جاں فزا کا یہ بلبل اسیر ہے

اسی بنا پر ان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرنے اور ان کے حقوق و مطالبات منوانے کے لئے اپنے معجز نما کلام کا کچھ حصہ وقف رکھتے تھے ۔ بلکہ بعض اوقات یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے کہ ظالموں سے بازپرس کرنے والی ہستی فوراً اپنی گرفت مضبوط کیوں نہیں کرتی اور بداعمالیوں کی سزا دینے والے دن (قیامت) کے لمحے نزدیک کیوں نہیں آ جاتے ؟ وہ حیران ہو کر کہتے تھے :

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر — کل جسے اہل نظر کہتے تھے ایران صغیر
سینۂ افلاک سے اٹھتی ہے آہ دردناک — مرد حق ہوتا ہے جب مرعوب سلطان و امیر
کہہ رہا ہے داستاں بے دردیٔ ایام کی — کوہ کے دامن میں وہ غم خانۂ دہقان پیر
آہ یہ قوم نجیب و چرب دست و تر دماغ — ہے کہاں روز مکافات اے خدائے دیر گیر !

دراصل وطن سے محبت انسان کا ایک فطری جذبہ ہے ۔ پھر اقبال جیسا بلند رتبہ انسان جس کے دل میں عالمگیر تڑپ تھی اس جذبے سے کیونکر خالی رہ سکتا تھا ۔ ان کے کلام میں متعدد جگہ ہندوستان کا ذکر بانداز دلسوزی و محبت آیا ہے ۔

ہندوستان کا ہمالہ، اس کی گنگا، اس کی سرسبزی و شادابی، اس کی حسین فضا، اس کے آسمان اور اس کی زمین سے انہیں الفت ہے۔ ایک مقام پر تو وہ یہاں تک کہہ دیتے ہیں:

خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے

وہ اپنے آبائی وطن کشمیر، وطن ثانی سیالکوٹ اور وطن اقامت لاہور سے بھی والہانہ محبت رکھتے تھے۔ ہندوستان کی غلامانہ پامالی پر ان کے دردناک نالے ہر گوش شنوا نے سنے ہوں گے:

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو — کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
نشاں برگ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں — تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے — تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو — تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

ایک درد آشنا انسان جو ساری دنیا کو آزاد دیکھنے کا متمنی ہو، جو غلامی کو عذاب زندگی خیال کرتا اور کسی قوم کے لئے بھی اسے پسند نہ کرتا ہو، جو مزدوروں کا مختار نقیب، آقائی و سرمایہ داری کا کھلم کھلا مخالف، غلام قوموں کو آزادی حاصل کرنے پر ابھارنے والا ہو، اس کے متعلق یہ خیال کرنا ہی بے انصافی ہے کہ وہ اپنے ملک و وطن سے محبت نہیں کرتا تھا جسے صدیوں کی غلامی نے پامال اور سرمایہ داری نے بدحال کر رکھا تھا۔ ہاں یہ سچ ہے کہ وہ مروجہ سیاسی وطن پرستی کا سخت دشمن تھا کیونکہ وہ دیکھ رہا تھا کہ دنیا میں تمام خونریزیاں وطنی حدود اور رنگ و نسل کے امتیازات کی بنا پر ہو رہی ہیں۔ ہر قوم اپنے سوا دوسری تمام اقوام کو زیر اور اپنا غلام بنانے کی جدوجہد میں مبتلا ہے، ہر حکومت اپنے ملکی حدود کی توسیع کے لئے کفن بردوش نظر آتی ہے۔ نظام سرمایہ داری آمریت اور جمہوریت کے لباس میں کمزور قوموں اور بے بس مزدور جماعتوں کو کچل رہا ہے اور اس درندگی اور لوٹ کھسوٹ کا نام حب الوطنی پڑ گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی وطنیت و قومیت کے سامنے بیں مذہب، اخلاق، شرافت اور نیکی کی کوئی قدر بھی سلامت نہیں رہ سکتی۔ اقبال ایسی ملعون وطن پرستی کا مخالف تھا۔ وہ دراصل وطن کا نہیں بلکہ وطنیت کا دشمن تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ وطن ایک مرکز اتحاد ہے ان تمام لوگوں کے لئے جو اس میں رہتے بستے ہیں۔ یہ وطنیت اسلام سے ٹکراتی ہے لیکن وطن اور اسلام میں کوئی تصادم نہیں۔ اقبال نے خود اس نکتہ کی تشریح کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"اگر قومیت (وطنی قومیت) کے معنے حب الوطنی اور ناموس وطن کے لئے جان قربان کرنے کے ہیں تو ایسی قومیت مسلمانوں کے ایمان کا ایک جزو ہے۔ اس قومیت کا اسلام سے اس وقت تصادم ہوتا ہے جب کہ وہ ایک سیاسی تصور بن جاتی ہے اور اتحاد انسانی کا بنیادی اصول ہونے کا دعویٰ کرتی ہے اور یہ مطالبہ کرتی ہے کہ اسلام شخصی عقیدے کے پس منظر میں چلا جائے اور قومی زندگی میں حیات بخش عنصر کی حیثیت سے باقی نہ رہے[۵]"

اقبال سچ کہتا تھا:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے — جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

---

[۵] مضامین اقبال صفحہ ۱۷۶۔

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے — ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ :

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے — تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے

خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے — کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے — قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

بقول ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم "اقبال کی سیاست کے تین پہلو تھے ۔ ایک طرف تو وہ تمام بلند پایہ مفکرین اور مصلحین کی طرح تمام نوعِ انسان کی بہتری کے متعلق سوچتا تھا ۔ اس کی شاعری کا بیشتر حصہ انسانی زندگی کے نصب العین سے تعلق رکھتا ہے اور براہ راست ملکی سیاست سے بے تعلق معلوم ہوتا ہے ۔ محض مخصوص گروہوں کے متعلق سوچنا عملی سیاست دانوں کا کام ہے ۔ اعلیٰ درجہ کا شاعر، حکیم یا نبی مخصوص گروہوں کو اپنی نظرگاہ نہیں بناتا ۔ اقبال کے متعلق بھی صورت حال اسی قسم کی ہے ۔ اس نے شروع میں حب الوطنی کے عام جذبات کے ماتحت بڑی پر جوش نظمیں وطن پر لکھیں جن سے بہتر آج تک کوئی ہندوستانی شاعر نہیں لکھ سکا ۔ لیکن اس دور کے بعد اس کی نظر وطن سے بے تعلق تو نہیں ہوئی لیکن وطن سے بلند ہو گئی اور وہ اس نقطۂ نظر پر آ گیا جو قرآن میں بیان کیا گیا ہے کہ کسی قوم میں تغیر حقیقی طور پر پیدا نہیں ہو سکتا جب تک اس قوم کے نفوس میں تغیر نہ ہو ۔ لہذا وہ اہلِ وطن کے دلوں میں ایسے جذبات پیدا کرنا چاہتا تھا جن میں محض یورپ کی حب الوطنی کی تقلید نہ ہو بلکہ عدل و انصاف کا راستہ صالحانہ جد و جہد سے سب کے لئے کھل جائے ۔ وطن کی صحیح محبت اس کے دل میں آخر تک موجود تھی اور وہ اس کو ایک فطری جذبہ خیال کرتا تھا ۔ اس کی سیاست کا دوسرا پہلو اسی امر کے ساتھ وابستہ تھا کہ وہ صرف ہندی نہیں بلکہ ہندی مسلمان تھا ۔ اس نقطۂ نظر میں وہ تمام ہندوستانی مسلمانوں کا نمائندہ تھا اور تمام اسلامی دنیا کی آزادی اور اس کی ترقی کا متمنی تھا ۔ جب تک اسلام کے نصب العین میں کوئی قوت باقی ہے ہر سلیم القلب ہندی مسلمان کی طبیعت میں یہ دونوں جذبے بیک وقت موجود رہیں گے ۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ان میں سے ایک جذبہ دوسرے کے منافی ہے؟ اقبال بھی وطن کی آزادی کا ایک پرجوش مجاہد تھا لیکن مغربی انداز کی وطن پرستی کو بُت سمجھتا تھا ۔ جہاں دوسرے قسم کے اصنام کو توڑنے کا کام اس نے اپنے ذمہ لیا وہاں یہ بڑا بت بھی اس کی ضرب و حرب سے نہیں بچ سکتا تھا"[1]

مختصر یہ ہے کہ حب الوطنی اور مروجہ وطن پرستی میں فرق ہے ۔ اقبال کسی وطن دوست سے کم محبِ وطن نہیں البتہ وہ وطن پرست نہیں بلکہ خدا پرست تھے ۔ وہ خدا کے بعد بے امتیاز رنگ و نسل تمام خلقِ خدا سے محبت رکھتے تھے اور جغرافیائی حدود کو توڑ کر سارے عالمِ انسانیت کو محبت و اخوت کے رشتۂ استوار میں منسلک دیکھنے کے متمنی تھے :

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے — میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

اسی جذبے کے ماتحت ان کا دل ہندوستان اور کشمیر کی تباہی پر کڑھتا اور وہ اپنے خیالات کے اظہار پر مجبور ہو جاتے تھے اور کبھی کبھی وہ رزمِ سیاست کی کمان اپنے ہاتھ میں لے کر قوم کی رہبری و راہنمائی کے لئے میدانِ کارزار میں بھی کود پڑتے تھے ۔

(بشکریہ مجلہ اقبال لاہور)

---

[1] اقتباس از مضمون "اقبال کی زندگی" مندرجہ "آثارِ اقبال" صفحہ ۲۹ - ۳۴

محمد عبداللہ قریشی

# اقبال اور فوق

علامہ اقبال اور منشی محمد الدین فوق مرحوم دو دوست تھے۔ دونوں کا خمیر محبت کے عناصر سے اٹھایا گیا تھا۔ دونوں کے آباؤ اجداد کشمیر سے ہجرت کر کے پنجاب آئے اور سیالکوٹ کے ضلع میں آباد ہوئے۔ دونوں فطری شاعر تھے۔ دونوں نے شاعری میں فصیح الملک بہادر نواب مرزا داغ دہلوی کی شاگردی اختیار کی جو اس وقت زبان کی خوبی کے لحاظ سے فن غزل میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ دونوں کی دوستی لاہور میں ہوئی اور دونوں اسی خاک میں آسودہ خواب ہیں۔

اقبال بی اے کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہو چکے تھے کہ فوق صاحب ۳۱ جنوری ۱۸۹۶ء کو گھڑتل (ضلع سیالکوٹ) سے ملازمت کی تلاش میں لاہور آئے اور بھاٹی دروازہ بازار حکیماں کی انجمن اتحاد کے مشاعروں کی دھوم سن کر وہاں پہنچے اور ان میں شریک ہو کر داد سخن دینے لگے۔ ایک مشاعرے میں جس کے لئے یہ طرح تجویز کی گئی تھی ؏

مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا

اقبال نے وہ غزل پڑھی جس کے مقطع میں داغ کی شاگردی پر یوں فخر کا اظہار کیا گیا ہے:

نسیم و تشنہ[1] ہی اقبال کچھ اس پر نہیں نازاں ... مجھے بھی فخر ہے شاگردیٔ داغ سخنداں کا

فوق صاحب نے یہ چند شعر پڑھے:

دیا ہر چند میں نے واسطہ گیسوئے جاناں کا ... نہ چھوڑا تار کوئی دست وحشت نے گریباں کا
بہائے آنکھ نے شرم گنہ سے اس قدر آنسو ... کہ ہر اشک ندامت نے دکھایا جوش طوفاں کا
کلیجہ بھی ہے زخمی، دل بھی ہے مجروح سینے میں ... مزہ ہم نے اٹھایا ہے تمہارے تیر دپیکاں کا

اس جگہ اقبال سے ملاقات ہوئی۔ ذوق و مشرب سے یگانگی کی بنا پر دونوں کی طبیعت مل گئی اور ان میں کچھ ایسی الفت و محبت ہو گئی جسے جیتے جی زمانے کی دستبرد کوئی گزند نہ پہنچا سکی نہ بُعدِ مکانی و مفارقت زمانی کا امتداد ان کی گرمی اور جوش میں افسردگی پیدا کر سکا۔

فوق صاحب نے بعد میں ایک شاعر سے بڑھ کر اخبار نویس، ادیب اور مؤرخ کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔

---

[1] نسیم بھرت پوری اور تشنہ بلند شہری داغ کے ارشد تلامذہ تھے۔

پہلے 'پیسہ اخبار' لاہور میں ملازمت اختیار کر کے منشی محبوب عالم سے اخبار نویسی کا فن سیکھا۔ پھر ۱۹۰۱ء میں اپنا ہفتہ وار اخبار 'پنجۂ فولاد' نکالا جو ملک میں بے حد مقبول ہوا۔ اس کے بند ہونے پر ۱۹۰۶ء میں 'کشمیری میگزین' جاری کیا جو ۱۹۱۲ء میں ترقی کر کے ماہوار سے ہفتہ وار 'اخبار کشمیری' کی صورت اختیار کر گیا اور ۱۹۳۵ء تک کشمیر اور کشمیریوں میں زندگی کی روح پھونکتا رہا۔ کچھ عرصہ اخبار کوہ نور رسالہ طریقت اور نظام وغیرہ بھی ان کی ادارت میں شائع ہوتے رہے۔

فوقؔ صاحب پہلے اخبار نویس ہیں جنھوں نے اقبال میں ترقی پسندی کے جوہر دیکھ کر ان کے نام کو اچھالنا شروع کیا اور اپنے اخبار کے صفحات ان کی تعریف و توصیف کے لیے وقف کر دئے۔ وہ پیسہ اخبار، پنجۂ فولاد، کشمیری میگزین اور اخبار کشمیری کے علاوہ دوسرے اخباروں اور رسالوں میں بھی اقبال کا ذکر اکثر چھیڑتے رہتے تھے اور ان کے کلام کی نشر و اشاعت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے تھے۔ اقبالؔ سے ان کی اکثر ملاقاتیں بھی ہوتی رہتی تھیں جن میں عموماً شعر و شاعری کے تذکرے رہتے تھے یا معاملات کشمیر پر بحث ہوتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ دونوں کی طبیعت میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور اس کا اظہار اکثر موقعوں پہ ہوتا رہتا تھا۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ ایک روز فوق صاحب ملنے گئے تو اقبال کتابوں کی الماری کے پاس کھڑے کتابوں کو اس طرح ٹٹول رہے تھے جیسے کسی خاص کتاب کی تلاش ہے۔ جب ذرا دیر لگی تو فوق صاحب نے پوچھا: حضرت! کس چیز کی تلاش ہو رہی ہے۔ فرمایا: "انگوری شربت" کی ایک بوتل رکھی تھی۔ کل شمس العلماء مفتی عبداللہ ٹونکی آئے تھے۔ دیکھ رہا ہوں کہیں وہ نہ لے گئے ہوں[1]۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ بیرسٹری پاس کرنے کے بعد اقبال نے پہلے میل موہن لعل روڈ پر (جسے اب اردو بازار کہتے ہیں) ایک کوٹھی کرایہ پر لی۔ فوق صاحب جب ان سے ملنے گئے تو خلاف معمول اور یہ سمجھ کر کہ شاید ولایت جا کر حالات بدل گئے ہوں اور بن پوچھے سیدھے دندناتے ہوئے چلے جانا گستاخی میں داخل ہو، اپنا ملاقاتی کارڈ ان کے آدمی کو دیا۔ آدمی واپس آیا اور کہنے لگا: فرماتے ہیں ابھی فرصت نہیں، ذرا تشریف رکھیے۔ چنانچہ چار پانچ منٹ کے بعد انھیں بلایا۔ فوق صاحب نے کہا: یا حضرت! یہ کیا؟ فرمایا: آپ خود ہی سوچیں آپ نے کیا کیا؟ ایک بے تکلف دوست تکلف کرے تو اس کے ساتھ یہی سلوک ہونا چاہیے ورنہ آپ کے لیے تو میں اس شعر کی صورت میں حاضر ہوں[2]۔

بصحن گلشن ما صورت بہار بیا     کشادہ دیدۂ گل بہر انتظار بیا

مئی ۱۹۱۰ء کا واقعہ ہے کہ فوق صاحب اور منشی وجاہت حسین صاحب وجاہت جھنجھانوی نے ایک ہی طرح میں غزلیں کہیں۔ فوق صاحب کی غزل صوفیانہ رنگ میں تھی اور وجاہت کی دوسرے رنگ میں۔ دونوں اقبال کے پاس گئے اور ان کو اپنا کلام سناتے رہے۔ اسی اثنا میں ان کے منشی طاہر دین آ گئے جنھوں نے بعد میں حکیم طاہر دین ہو کر لرزہ کی دوا ایجاد کر کے خوب نام پیدا کیا۔ آخری عمر میں وہ اقبال کی جائداد کے ٹرسٹی بھی تھے۔ مئی ۱۹۴۰ء میں انتقال کیا۔ منشی

---

[1] سرگزشت فوق (قلمی)، صفحہ ۱۳۰    [2] سرگزشت فوق (قلمی)، صفحہ ۱۲۹

طاہر دین نے کہا: ایک مؤکل آیا ہے اور وہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ آپ نے فرمایا: اس کو بٹھاؤ، یہاں سے فارغ ہو کر ان کو بلاؤں گا۔ فوق صاحب نے کہا: بابا! پہلے پیٹ کی فکر چاہیے، یہ شغل تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ فرمایا: یہی شغل تو غذائے روح ہے، اور روح ہے تو سب کچھ ہے۔ مؤکل اگر میرا نام سُن کر آیا ہے تو وہ کہیں بھاگ نہیں جائے گا۔ چنانچہ فوق اور وجاہت کے بعد اقبال نے اپنا تازہ کلام سنایا اور پھر مجلس برخاست ہوئی[1]

ایک مرتبہ اقبال دردِ گردہ میں مبتلا تھے۔ تکلیف بے حد تھی۔ فوق صاحب عیادت کو گئے تو دیکھا کہ سخت اضطراب اور بے چینی کی حالت میں ہیں، تڑپ رہے ہیں اور درد کی شدت سے زار زار رو رہے ہیں۔ فوق صاحب نے تسلی دی تو فرمایا۔ اللہ میاں سے بصد عجز و زاری کہہ رہا ہوں کہ بار الٰہا اگر دوزخ سے نجات دینی ہے تو بے شک اس تکلیف میں مبتلا رکھ ورنہ یہاں اس عذاب سے نجات دے۔ فوق صاحب نے کہا اچھا تو اس حال میں بھی خدا تعالیٰ سے راز و نیاز کی باتیں ہو رہی ہیں[2] اسی ظالم مرض کی صعوبت سے بے قرار ہو کر آپ نے یہ اشعار کہے تھے:

زہ مرا فرصت ہو حق دو سہ روزے دگرے      کہ دریں دیر کہن بندۂ بیدار کجاست

پیر و مرزا بہ سیاست دل و دیں باختہ اند      جز برہمن پسرے محرم اسرار کجاست

حرف ناگفتہ مجال نفسے می خواہد      ورنہ مارا بہ جہانِ تو سروکار کجاست

اقبال بڑے شوق سے فوق صاحب کے اخبار، رسالے اور کتابیں پڑھتے اور اپنے مفید مشوروں اور کلام سے ان کے کاروبار کو ترقی دینے میں ہر وقت کوشاں رہتے تھے۔ چنانچہ ۲۹ اگست ۱۹۰۸ء کے ایک خط سے اس کی تصدیق ہوتی ہے لکھتے ہیں:۔

ڈیر فوق! السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ مجھے کل ملا۔ میں ایک دو روز کے لئے بغرض مشورہ لاہور گیا تھا کیونکہ وہیں کام شروع کرنے کا ارادہ ہے۔ کشمیری میگزین دیکھتا ہوں۔ اس میں جو کامیابی آپ کو ہوئی اور ہو رہی ہے اس کے لئے مبارک باد دیتا ہوں اور جو کچھ آپ کا ہے گا ہے میری نسبت اپنے کالموں میں تحریر فرماتے ہیں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

آپ جموں کے راستے کشمیر جائیں تو ضرور سیالکوٹ تشریف لائیں تاکہ مجھے آپ کی دوستانہ قدر و منزلت کرنے کا موقع ملے۔ افسوس ہے کہ میں ابھی کچھ عرصہ تک آپ کے لئے کچھ نہ لکھ سکوں گا کیونکہ قانونی کتب کی طرف متوجہ ہوں۔

چونکہ اس کام کو شروع کیا ہے اس واسطے ارادہ ہے کہ اس کو حتی الامکان پورے طور پر کروں۔ روٹی تو خدا ہر ایک کو دیتا ہے۔ میری آرزو ہے کہ میں اس میں کمال پیدا کروں۔ آپ بھی دعا

---

[1] سرگذشت فوق (قلمی) صفحہ ۱۳۰    [2] سرگذشت فوق (قلمی) صفحہ ۱۲۹

کریں کہ خدا تعالیٰ اس مہم میں میرا شامل حال ہو۔

انشاء اللہ نومبر میں لاہور آ کر مستقل طور پر کام شروع کروں گا۔ اس وقت آپ سے خوب خوب ملاقاتیں ہوا کریں گی جیسے کبھی پہلے ہوا کرتی تھیں اور وہیں کشمیری میگزین کی ترقی اشاعت کے لیے بھی چند باتیں آپ سے کروں گا۔ باقی خیریت ہے۔

اللہ یار صاحب جوگی کی خدمت میں میرا شکریہ پہنچا دیجیے۔ علاوہ ازیں تارا چند صاحب (تارا) (حلوائے سوہن فروش دہلی دروازہ) کی خدمت میں بھی۔ والسلام

محمد اقبال

از شہر سیالکوٹ ۲۹ اگست ۱۹۰۸ء

اقبال نے فوق صاحب کی بعض کتابوں کی تصنیف کی تاریخیں بھی کہی ہیں اور دیباچے بھی لکھے چنانچہ ۱۹۰۱ء میں جب فوق صاحب نے پیسہ اخبار کی ملازمت ترک کر کے اپنا ہفتہ وار اخبار "پنجۂ فولاد" جاری کیا تو اقبال نے اس کا تعارف اس طرح کرایا:

پنجۂ فولاد کیا ہے؟

پنجۂ فولاد اک اخبار ہے  جس سے سارا ہند واقف کار ہے
دفتر اخبار ہے لاہور میں  جس کا کوچہ کوچہ کوئے یار ہے
ہے روش اس کی پسند خاص و عام  واہ وا کیا معتدل اخبار ہے
غیر سے نفرت نہ اپنوں سے بگاڑ  اپنے بیگانے کا ہر دم یار ہے
سطر سطر اس کی مفید ملک و قوم  کوئی کہہ دے یہ خبر بے کار ہے؟

اس کے بعد اخبار کے چند مستقل کالموں مثلاً بزم فوق، مذاق سخن، ضامن صحت، تجارت، مشاہیر ہند، لیت کی خبریں اور لطائف وغیرہ کا ذکر ہے:

دید کے قابل نہ ہو کیوں بزم فوق  شمع اس محفل کی یہ اخبار ہے
ضامن صحت کا ایسا ہے عمل  وہ ضمانت کے لیے تیار ہے
ہے تجارت کا بھی کالم کیا مفید  یوسف معنی کا یہ بازار ہے
وہ لطائف ہیں کہ پڑھتے ہی جنہیں  لوٹنے میں دل کبوتر وار ہے
کیوں نہ نظم و نثر کا چرچا رہے  جب ایڈیٹر ناظم و نثار ہے
سیٹلمنٹ و آفس کا بھی ہے بندوبست  شاہد ان دعووں کا خود اخبار ہے

پھر اس کی پالیسی، قیمت اور ایڈیٹر کے متعلق اظہار خیال ہے:

ہے مدلل رائے اس اخبار کی  ہے وہ کافر جس کو کچھ انکار ہے

رائے زن اس سے نہیں بڑھ کر کوئی — مضمونوں کو اس کا خود اقرار ہے
جتنے ہیں ہم عصر دیکھیں غور سے — فقرے فقرے سے ٹپکتا پیار ہے
تین روپے سکہ قیمت سال کی — اس سے سستا کون سا اخبار ہے
اور پھر انعام میں ناول ہیں مفت — واہ کیا سودا ہے کیا بیوپار ہے
آٹھویں دن حاضری لے لیجئے — تابع فرمان و خدمت گار ہے
سیر اس گلشن کی کر کے دیکھئے — ایک گلشن رشک صد گلزار ہے
رنگ آزادی ہے ہر مضمون میں — سرو ہو کر بھی یہ میوہ دار ہے
کون ہے اس بانکے پرچے کا مدیر؟ — بات یہ بھی قابل اظہار ہے
لیجئے مجھ سے جواب مختصر — یہ معما کچھ نہیں دشوار ہے
نام ہے اس کا محمد دین فوق — عمر چھوٹی ہے مگر ہشیار ہے
شوق ہے مضمون نویسی کا اسے — طبع گویا ابر گوہر بار ہے
گشت کے عالم میں دیکھا تھا اسے — آدمی ہشیار واقف کار ہے

اس نظم پر اگرچہ اس وقت کسی کا نام شائع نہیں ہوا تھا مگر فوق صاحب بتاتے تھے کہ یہ اقبال نے ارتجالاً کہی تھی۔

اقبال کا بہت سا ابتدائی کلام اس اخبار میں چھپا جن میں سے کئی نظمیں اور غزلیں بانگ درا کی ترتیب کے وقت اقبال نے خود رد کر دیں۔

فوق صاحب نے بھی اقبال کے متعلق اس تواتر سے لکھا ہے کہ شاید ہی کوئی لکھ سکے۔ آپ نے جہاں کہیں اقبال کا ذکر کیا ہے احترام کے پاکیزہ جذبات کے ساتھ کیا ہے جس کے حرف حرف سے محبت کا آب حیات ٹپکتا ہے۔ اگر آج کوئی آپ کی تحریروں کو جمع کرنے بیٹھے تو اقبال کی طالب علمی کے زمانے سے لے کر وفات تک کے حالات کا بالکل ایک نیا مرقع تیار ہو سکتا ہے۔ اقبال کو آپ کے لکھے ہوئے حالات پر کامل اعتماد ہوتا تھا۔ اس لئے جب کوئی آپ کے حالات طلب کرتا تو آپ فوق صاحب ہی کا پتہ دیتے تھے۔ چنانچہ ۲۲ جولائی ۱۹۱۵ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"ڈیر فوق! آپ آج کل لاہور میں ہیں یا امرتسر میں؟ ایک دفعہ آپ نے کشمیری میگزین میں
میرے حالات شائع کئے تھے۔ اگر اس نمبر کی کوئی کاپی آپ کے پاس رہ گئی ہو تو ارسال فرمائیں۔ پھر
واپس کر دی جائے گی۔ اگر آپ کے پاس نہ ہو تو کہیں سے منگوا دیجئے۔"

فوق صاحب کی تصانیف اور اخبار کشمیری کی خدمات سے خوش ہو کر اقبال ہمیشہ انہیں مجدد کشمیر کہا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ "اگر آپ کے قلم کے زور سے کشمیر کے باشندوں اور پسماندہ مسلمانوں میں کچھ زندگی پیدا ہو گئی تو یہی خدمت آپ کی نجات کا ذریعہ بن جائے گی۔"

تصنیف و تالیف کی ابتدا میں فوق صاحب نے ۲۰ اگست ۱۹۰۰ء کو ایک چھوٹی سی کتاب "امتحان میں پاس ہونے کا گر" شائع کی جس پر اقبال نے نظرثانی کی اور بہت سی مفید باتوں کا اس میں اپنی طرف سے اضافہ بھی کیا۔ یہ کتاب اب بالکل نایاب ہے لیکن حسن اتفاق سے مجھے اس کا ایک نسخہ مل گیا ہے۔ اس پر اقبال نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

"یہ مختصر سا رسالہ ان ضروری ہدایات کا مجموعہ ہے جن کا جاننا طلباء کے لئے ازبس مفید ہے علاوہ ان ہدایات و ارشادات کے جو امیدواران امتحانات یونیورسٹی کے لئے ضروری ہیں مؤلف نے اپنے رسالہ کو انگریزی مصنفین کے بعض قابل قدر مقولوں سے آراستہ کیا ہے جس سے اس چھوٹی سی کتاب کی وقعت اور بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ میرے خیال میں اس قسم کی کتابوں کا بچوں کے ہاتھوں میں دینا اخلاقی تعلیم کی بنیاد کو بہت استحکام دے گا۔"

دستخط شیخ محمد اقبال
میکلوڈ عربک پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور

اس کے بعد فوق صاحب نے "بہار گلشن" کے نام سے غزلوں کے چند مجموعے چھاپے جن میں اقبال کی کئی غزلیں ان کی اجازت سے درج کیں اور ان کے مختصر سے حالات بھی لکھے۔ جلد دوم کا ایک رسالہ میری نظر سے گذرا ہے۔ اس میں اقبال کی چار غزلیں درج ہیں جن میں سے ایک غزل کے چند شعروں کے سوا کوئی علامہ کے کسی مجموعے میں شامل نہیں۔ یہ ابتدائی غزلیں اگرچہ کوئی خاص شان نہیں رکھتیں لیکن درخشاں مستقبل کا ضرور پتہ دیتی ہیں۔ ان غزلوں کے چند شعر یہ ہیں:

تم آزماؤ 'ہاں' کو زباں سے نکال کے ‏ ‏ ‏ ‏ یہ صدقے ہو گی میرے سوالِ وصال کے
کم بخت اک 'نہیں' کی ہزاروں ہیں صورتیں ‏ ‏ ‏ ‏ ہوتے ہیں سو جواب سوالِ وصال کے
ہم بوسہ مانگتے ہیں وہ گھبرائے جاتے ہیں ‏ ‏ ‏ ‏ سمجھے کسی نے اور ہی معنی 'وصال' کے
اے ضبط ہوشیار مرا حرف مدعا ‏ ‏ ‏ ‏ قابو میں آنہ جائے زبان سوال کے
مارے ہیں آسماں نے مجھے تاک تاک کر ‏ ‏ ‏ ‏ کیا بے خطا ہیں تیر کمانِ ہلال کے
ان کی گلی ہیں اور کچھ اندھیر ہو نہ جائے ‏ ‏ ‏ ‏ اے ضعف دیکھ مجھ کو گرانا سنبھال کے
موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے ‏ ‏ ‏ ‏ قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے
میں نے کہا کہ بے دھنی اور یہ گالیاں؟ ‏ ‏ ‏ ‏ کہنے لگے کہ بول ذرا منہ سنبھال کے
کہتے ہیں ہنس کے، جائیے ہم سے نہ بولئے ‏ ‏ ‏ ‏ قربان جاؤں طرزِ بیانِ ملال کے
بگڑے حیا نہ شوخیٔ رفتار سے کہیں ‏ ‏ ‏ ‏ چلتے نہیں وہ اپنا دوپٹہ سنبھال کے
تصویر میں نے مانگی تو ہنس کر دیا جواب ‏ ‏ ‏ ‏ عاشق ہوئے تھے تم کسی بے مثال کے

| | |
|---|---|
| کہتا ہے خضر دشت جنوں میں مجھے کہ چل | آتا ہوں میں بھی پاؤں سے کانٹا نکال کے |
| اقبال لکھنؤ سے نہ دلی سے ہے غرض | ہم تو اسیر ہیں خم زلف کمال کے |

اسی غزل کے ایک شعر پہ مرزا ارشد گورگانی پھڑک اٹھے تھے اور اسی سے اقبال کی شہرت کو پر پرواز لگ گئے تھے۔

دوسری غزل:

| | |
|---|---|
| عبادت میں زاہد کو مسرور رہنا | مجھے پی کے تھوڑی سی مخمور رہنا |
| دم آفرینش ہدایت تھی دل کو | کلیم تماشائے ہر طور رہنا |
| سکھائی ہے کس نے تمہیں بے حجابی | حسینوں کا شیوہ ہے مستور رہنا |
| تمہیں کیا بتائیں محبت ہے کیا شے | یہ ہے دل کے ہاتھوں سے مجبور رہنا |
| دکھا دے کی بے اعتنائی کے صدقے | بڑے کام آیا مجھے دور رہنا |
| نبھائیں گے کیا ایک سے وہ محبت | جنہیں ہر نظر میں ہے منظور رہنا |
| نہیں عشق بازی یہ زاہد تو کیا ہے | اسیر خم گیسوئے حور رہنا |
| کوئی چال اس خاکساری میں ہوگی | تمہاری تو عادت تھی مغرور رہنا |
| نہ میں تم کو دیکھوں نہ اغیار دیکھیں | مری آنکھ میں صورت نور رہنا |
| نہ ہو جن کی آنکھوں میں تاب نظارہ | بھلا ان غریبوں سے کیا دور رہنا |
| وہ سو ناز اقبال پر کر رہے ہیں | زمانے میں ہے ان کو مشہور رہنا |

اقبال کی اس غزل پر اس زمانے کے نقادوں نے کڑی تنقید کی جس کا جواب ان کے دوستوں نے اخبار "پنجۂ فولاد" لاہور میں دیا مگر اقبال نے اس غزل کو قلم زد کر دیا۔

تیسری غزل کے چند شعر یہ ہیں:

| | |
|---|---|
| تم نے آغاز محبت میں یہ سوچا ہوگا | کس طرح کا یہ نیا چاہنے والا ہوگا |
| تم نے سمجھا تو ہے اس گھر کو ہمارا لیکن | اب ہمارا ہے کوئی دن میں تمہارا ہوگا |
| حشر میں کچھ تو تمہیں حسن پہ ہوگی امید | کچھ مرا شکوہ نہ کرنے کا بھروسا ہوگا |
| گھر میں بیٹھے ہیں خدا رکھے کہ باہر ہیں کہیں | نامہ بر یہ بھی کسی نے تجھے پوچھا ہوگا |
| نامہ بر کام تو باتوں میں بنا کرتے ہیں | مان جائیں گے اگر تجھ کو سلیقا ہوگا |
| ہاں بتا پہلے کہیں ان کو کہے گا کیا کیا | نامہ بر ہم جو بتائیں وہی کہنا ہوگا |
| ہم کہیں جائیں کسی کام کو جائیں لیکن | دل یہ کہتا ہے اسی رہ سے گذرنا ہوگا |
| تیرے اشعار میں اقبال یہ رنگت تو نہ تھی | تو نے کم بخت کسی شوخ کو تاکا ہوگا |

چوتھی غزل کے بانگ درا میں صرف چھ شعر درج ہیں اور جس ترتیب سے ہیں اسی طرح نمبر دئے گئے ہیں۔

(۱)

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی　　مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
ٹھہرتا ذرا، سن کے کم بخت آتا　　وہاں نامہ بر آج تکرار کیا تھی

(۲)

تمہارے پیامی نے سب راز کھولے　　خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی
مرا دل بھی اٹھنے کو چاہا نہ واں سے　　فسوں تھا کوئی بزم اغیار کیا تھی
کوئی یوں گیا ہے ادھر سے نکل کر　　قیامت تھی بجلی تھی رفتار کیا تھی
یہ وعدہ کسی نے کیا کیا سمجھ کر　　مری بزم بھی بزم اغیار کیا تھی
نہ چھوڑا کبھی بے وفائی نے تم کو　　مری طرح یہ بھی وفادار کیا تھی

(۴)

تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد　　مگر یہ بتا طرز انکار کیا تھی
چھپائی ہے ادھر کوئی چیز تو نے　　یہ شے، تیرے قرباں ارے یار کیا تھی
ترے ساتھ اڑتی گئی رہگذر میں　　مری خاک اسے دامن یار کیا تھی

(۳)

بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا　　تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی

(۵)

کھنچے خود بخود جانب طور موسیٰ　　کشش تیری اے شوق دیدار کیا تھی
قفس میں ہے بلبل تو ویراں چمن ہے　　یہی رونق رنگ گلزار کیا تھی
ہزاروں کلیجے کو تھامے ہوئے ہیں　　الٰہی وہ چشم فسوں کار کیا تھی
لیا مغفرت نے تڑپ کر بغل میں　　کرامت تھی شرم گنہگار کیا تھی

(۶)

سلیقہ نہ تھا بات کرنے کا تم کو　　مجھے یاد ہے میری سرکار کیا تھی
کہیں ذکر رہتا ہے اقبال تیرا　　کوئی سحر تھا تیری گفتار کیا تھی
فسوں تھا کوئی

بہار گلشن کے گلدستوں کی چند دوسری غزلیں شیخ عبدالرحمٰن طارق کی کتاب جہان اقبال میں محفوظ کر دی گئی ہیں۔
"بہار گلشن" میں چھپے ہوئے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۰۱ء میں ملکہ وکٹوریہ کے انتقال پر اقبال نے جو دلگداز مرثیہ "اشک خوں" کے نام سے لکھ کر لاہور کے ایک ماتمی جلسہ میں پڑھا تھا، اس کی مقبولیت دیکھ کر حکومت

پنجاب نے اس کی کئی ہزار کاپیاں اپنے صرف سے چھپوائی تھیں۔ اس وقت آپ گورنمنٹ کالج لاہور میں قائم مقام پروفیسر تھے۔ خوش قسمتی سے اس کی ایک مطبوعہ کاپی بھی میرے پاس موجود ہے۔

انہی دنوں میلہ چراغاں کے موقع پر فوق صاحب نے چوبیس صفحوں کی ایک چھوٹی سی کتاب "شالامار باغ لاہور کی سیر" لکھ کر شائع کی جو اس وقت اگرچہ اس سے زیادہ کوئی وقعت نہ رکھتی تھی کہ لیس لکھی گئی تھی تاہم چونکہ ایک اچھوتی چیز تھی اس لئے اسی میلے میں ہاتھوں ہاتھ بک گئی تھی۔ بعد میں جدید تحقیقات کی روشنی اور تاریخی کتابوں کی ورق گردانی سے آپ نے اس ابتدائی کوشش کی ہیئت تبدیل کر کے ایک ٹھوس تاریخی کتاب بنا دیا۔ چنانچہ سر رچرڈ ٹمپل کے رسالہ انڈین آرکیالوجیکل بابت ماہ ستمبر ۱۹۲۲ء میں مصر کے ایک انگریز کیپٹن کرسول نے اپنے مضمون میں اس کتاب کو تاریخ پنجاب کا ایک اہم جزو قرار دیا ہے۔ بہرحال ۱۹۰۱ء میں جب تاریخ شالامار باغ کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تو اقبال نے قطعۂ تاریخ کے یہ دو شعر کہے:

حسنِ سعیٔ فوق را صد مرحبا — بست ہر سطرِ کتابش دلربا
از سرِ نازش پئے تاریخ او — می سزد تصویر باغ جانفزا
ن = ۵۰ — ۵۰ + ۱۸۵۱ = ۱۹۰۱ء

"تصویر باغ جاں فزا" کے اعداد ۱۸۵۱ء ہیں۔ ان میں "سرِ نازش" یعنی حرف نون کے ۵۰ عدد شامل کرنے سے کتاب کا سن طباعت ۱۹۰۱ء برآمد ہوتا ہے۔

۱۹۰۴ء میں فوق صاحب نے لاہور کے ہندو مسلمان صوفیوں اور بزرگوں کا تذکرہ "یادِ رفتگاں" کے نام سے شائع کیا۔ اس کے مقدمے میں جہاں یہ بحث کی گئی ہے کہ راگ اور سرود و سماع جائز ہے یا نہیں، اگر جائز ہے تو کن صورتوں میں اور راگ سننے اور سنانے والے کون اور کس خیال کے ہونے چاہئیں، تا کہ اس مضمون پر اور حاضرین مجلس کے اخلاق و عادات کیلئے ہونے چاہئیں، وہاں اقبال کے اس شعر پر آخری فیصلہ کیا گیا ہے:

لوگ کہتے ہیں مجھے راگ کو چھوڑو اقبال — راگ ہے دین مرا راگ ہے ایماں میرا

اقبال نے جب یہ کتاب دیکھی تو فوق صاحب کو لکھا:

ڈیر فوق — اہل اللہ کے حالات جو آپ نے بنام "یادِ رفتگاں" تحریر فرمائے ہیں مجھ پر بڑا اثر کیا اور بعض بعض باتوں نے جو آپ نے اس چھوٹی سی کتاب میں درج کی ہیں مجھے اتنا رلایا کہ میں بے خود ہو گیا۔ خدا کرے آپ کی توجہ اس طرف لگی رہے۔ زمانۂ حال کے مسلمانوں کی نجات اسی میں ہے کہ ان لوگوں کے حیرت ناک تذکروں کو زندہ کیا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کے زوال کی اصل علت حسنِ ظن کا دور ہو جانا ہے۔

بھائی فوق! خود بھی اس گوہر نایاب کی تلاش میں رہو جو بادشاہوں کے خزانوں میں بھی نہیں مل سکتا

بلکہ کسی خرقہ پوش کے پاؤں کی خاک میں اتفاقیہ مل جاتا ہے۔ والسلام      آپ کا دوست
محمد اقبال ایم اے پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور
از سیالکوٹ ۴ر اکتوبر ۱۹۰۴ء

اسی کتاب سے متاثر ہو کر اقبال نے مندرجہ ذیل غزل کہی تھی جس کے بعض اشعار میں کم و بیش وہی تخیلات جھلک رہے ہیں جو خط میں ظاہر کیے گئے ہیں:

جنھیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں      وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں
جلا سکتی ہے شمع کشتہ کو موج نفس ان کی      الٰہی! کیا چھپا ہوتا ہے اہل دل کے سینوں میں
تمنا درد دل کی ہے تو کر خدمت فقیروں کی      نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں
نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی، ارادت ہو تو دیکھ ان کو      ید بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں
ترستی ہے نگاہ نارسا جس کے نظارے کو      وہ رونق انجمن کی ہے انھیں خلوت گزینوں میں
کسی ایسے شرر سے پھونک اپنے خرمن دل کو      کہ خورشید قیامت بھی ہو تیرے خوشہ چینوں میں
محبت کے لیے دل ڈھونڈھ کوئی ٹوٹنے والا      یہ وہ مے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں

ستمبر ۱۹۰۹ء میں فوق صاحب کے کلام کا پہلا مجموعہ "کلام فوق" شائع ہوا۔ اقبال نے "کمال نظر فوق" سے اس کی تاریخ نکالی اور کلام کے محاسن کا اعتراف ان اشعار میں کیا:

جب چھپ گیا مطبع میں یہ مجموعۂ اشعار      معلوم ہوا مجھ کو بھی حال نظر فوق
عاجز ہے زباں جس کی صفات میں عالی      تعریف کے قابل ہے خیال نظر فوق
تاریخ کی مجھ کو جو تمنا ہوئی اقبال      ہاتف نے کہا لکھ دے کمال نظر فوق

کاتب نے "نظر" کو "نظر" لکھ دیا تھا۔ اس لیے بعضوں کو یہ کہنا پڑا کہ یہ مادۂ تاریخ درست معلوم نہیں ہوتا کیونکہ "کمال نظر فوق" کے اعداد ۱۳۲۴ بنتے ہیں۔ حالانکہ ۱۳۲۷ ہونے چاہئیں۔

۶ مئی ۱۹۱۷ء کو فوق صاحب نے کتاب رہنمائے کشمیر شائع کی جس میں کشمیر کے دلچسپ تاریخی و جغرافیائی حالات اور قابل دید مقامات کا تذکرہ ہے۔ اقبال نے اس کتاب کو مطالعہ کیا اور اس کی خوبیوں کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

ڈیر فوق! السلام علیکم
آپ کا خط ابھی ملا ہے کشمیر اور اہل کشمیر پر مختلف کتابیں لکھ کر آپ نے مسلمانوں پر اور ان کے لٹریچر پر احسان کیا ہے۔ البتہ کشامرہ کی تیرہ بستی ایک ایسا مضمون ہے جس پر جہاں تک مجھے معلوم ہے آپ نے اب تک کچھ نہیں لکھا۔ اس طرف سب سے زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔

رسالہ رہنمائے کشمیر جو حال میں آپ کے قلم سے نکلا ہے۔ نہایت مفید اور دلچسپ ہے۔ طرز بیان بھی دلکش ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ رسالہ عام لوگوں کے لیے نہایت مفید ہوگا۔ افسوس ہے میں آج تک کشمیر کی سیر

نہیں کر سکا لیکن امکان ممکن ہے کہ آپ کا رسالہ مجھے بھی ادھر کھینچ لے جائے۔ مخلص

۸ر جون ۱۹۱۷ء محمد اقبال

رہنمائے کشمیر نے کشمیر دیکھنے کا جو شوق پیدا کیا تھا وہ اس سال تو پورا نہ ہوا۔ البتہ ۱۹۲۱ء کی گرمیوں میں آپ مولوی احمد دین وکیل اور اپنے منشی شیخ طاہر دین کے ہمراہ کشمیر تشریف لے گئے اور وہاں کے خستہ حال لوگوں کو جس حال میں دیکھا اس کا اظہار آپ نے پیامِ مشرق کی بعض نظموں میں کیا۔ جن میں سے چند شعر یہ ہیں:

کشیری کہ با بندگی خو گرفتہ　　بتے می تراشد ز سنگِ مزارے
ضمیرش تہی از خیالِ بلندے　　خودی ناشناسے ز خود شرمسارے
بریشم قبا خواجہ از محنتِ او　　نصیبِ تنش جامۂ تار تارے
نہ در دیدۂ او فروغِ نگاہے　　نہ در سینۂ او دلِ بے قرارے
ازاں می فشاں قطرۂ بر کشیری　　کہ خاکسترش آفریند شرارے

اقبال کے سفرِ کشمیر کی مفصل روداد میرے مضمون "اقبال اور کشمیر" مطبوعہ مجلۂ اقبال بابت اکتوبر ۱۹۵۶ء میں ملاحظہ فرمایئے۔

۱۹۲۰ء میں فوق صاحب نے اپنی کتاب تاریخ حریتِ اسلام شائع کی۔ یہ دراصل احرارِ اسلام کا ایک پرجوش تذکرہ ہے جسے اقبال کے اس شعر کا محرک سمجھنا چاہیے:

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی　　اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

اس کتاب میں زمانۂ رسالت و خلافتِ راشدہ سے لے کر عہدِ حاضر تک کے تمام ممالکِ اسلامی کے حق گو اور حق پرست مردوں اور عورتوں کے جرأت آفرین اور حریت آموز حالات درج ہیں۔ اقبال کو اس تصنیف کا حال معلوم ہوا تو آپ نے لکھا:۔

ڈیر فوق! السلام علیکم

دونوں کتابوں کا پیکٹ ابھی ملا ہے، جس کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ نے تاریخ حریتِ اسلام بھی لکھی ہے۔ یہ کتاب لاجواب ہوگی اور مسلمانوں کے لئے تازیانے کا کام دے گی۔ آپ بڑا کام کر رہے ہیں۔ اس کا اجر خدا تعالیٰ کی درگاہ سے ملے گا۔ والسلام

لاہور ۲۷ر اکتوبر ۱۹۲۰ء محمد اقبال

فوق صاحب نے کتاب بھیجی۔ اقبال نے پڑھی اور بے حد پسند کی۔ آپ نے اس کتاب کو فوق صاحب کی بہترین تصنیف قرار دیا اور اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:۔

"فوق صاحب کو اسلامیات سے ہمیشہ شغف رہا ہے۔ اس سے پہلے آپ کی متعدد تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ حریتِ اسلام آپ کی بہترین تصنیف ہے۔ دلیری اور بے باکی سے اعلانِ حق کرنا گذشتہ مسلمانوں کی سیرت کا ایک نمایاں پہلو تھا۔ مگر افسوس کہ عصرِ حاضر کے عام مسلمان تاریخِ اسلام

سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ اچھے اچھے تعلیم یافتہ بھی بیتے ہوئے واقعات سے بے خبر ہیں۔ ان حالات میں ذوق صاحب کی تصنیف پنجاب کے اسلامی لٹریچر میں ایک قابل قدر اضافہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ کوئی مسلمان خاندان اس بیش بہا کتاب کے مطالعہ سے محروم نہ رہے گا۔ اسلامی سکولوں اور کالجوں کے کتب خانے خاص طور پر اس کے مطالعہ کی طرف توجہ کریں۔ اس زمانہ میں جب کہ جمہوریت کی روح ہندوستان میں نشوونما پا رہی ہے دیگر اہل ملک کے لئے بھی یہ کتاب سبق آموز ہوگی۔"

اکتوبر ۱۹۲۲ء میں ذوق صاحب بعض کتابوں کا مسالہ جمع کرنے کے لئے بھوپال گئے ہوئے تھے کہ ۸ نومبر کو یک لخت لاہور سے ان کے گیارہ سالہ فرزند ظفر احسن کے انتقال کی خبر گئی۔ ذوق صاحب اسے تندرست چھوڑ کر گئے تھے۔ اس حادثہ نے غریب الوطنی میں انہیں خون کے آنسو رلایا۔ چنانچہ ۱۱ نومبر کی شام کو جب وہ بھوپال سے واپس آ رہے تھے تو دہلی کے قریب باب گڑھ کے اسٹیشن پر یہ شعر بے ساختہ ان کی زبان پر آ گیا:

کچھ لڑکے چلے آتے ہیں اسکول سے پڑھ کر　　دیکھو کہیں ان میں مرا احسن تو نہیں ہے

اس پر راستے میں دلگداز مرثیہ مرتب ہو گیا۔ لاہور پہنچتے ہی ذوق صاحب نے اقبال کو اس حادثے کی اطلاع دی۔ اپنی نئی کتاب شباب کشمیر کی تجویز سامنے رکھی اور آپ کے ایک انگریزی مضمون کا اردو ترجمہ چھاپنے کی اجازت مانگی جس کے جواب میں اقبال نے لکھا:

"ڈیر ذوق صاحب! السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ آپ کے مصائب کا حال سن کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ صبر جمیل عطا فرمائے۔ مولوی عبداللہ غزنوی حدیث کا درس دے رہے تھے کہ ان کو اپنے بیٹے کے قتل کئے جانے کی خبر ملی۔ ایک منٹ تامل کیا۔ پھر طلباء کو مخاطب کر کے کہا: "ما برضائے او راضی ہستیم بیائید کہ کار خود بکنیم"۔ یہ کہہ کر پھر درس میں مصروف ہو گئے۔ مخلص مسلمان اپنے مصائب کو بھی خدا تعالیٰ کے قرب کا ذریعہ بنا لیتا ہے۔

"شباب کشمیر" ضرور لکھئے۔ بہت مفید کتاب ہوگی۔ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ کشمیر کے لوگوں میں خودداری کی روح پیدا کی جائے۔ میں نے بھی ایک نظم اس مضمون پر لکھی ہے جو عنقریب فارسی مجموعہ (پیام مشرق) میں شامل ہوگی۔ افسوس ہے کہ مجھے تاریخ کشمیر سے بہت کم آگاہی ہے۔ ممکن ہے پنڈت شیو نرائن شمیم آپ کی مدد کر سکیں۔ راج ترنگنی غالباً ان کے پاس ہے۔ اگر نہ ہوئی تو پنجاب پبلک لائبریری میں ضرور مل جائے گی۔

"اسلام میں سیاست" چودہ سال ہوئے انگریزی زبان میں لکھا گیا تھا یعنی ۱۹۰۸ء میں جب ترکی میں انقلاب ہو رہا تھا جس کا نتیجہ آخرکار ۱۹۰۹ء میں سلطان عبدالحمید خاں کی معزولی میں ہوا۔ یہ مضمون لندن کے سوشیالوجیکل ریویو میں شائع ہوا تھا۔ پیسہ اخبار نے اس کا ترجمہ بہت غلط شائع کیا ہے۔ صحیح ترجمہ زمیندار میں شائع ہوا تھا۔ یہ ترجمہ چوہدری محمد حسین صاحب ایم اے سیکرٹری نواب سر ذوالفقار

علی خاں صاحب نے کیا تھا معتبر ہے۔ اگر آپ چھاپنا چاہیں تو بڑی خوشی سے پمفلٹ فارم میں شائع کریں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ البتہ چودھری صاحب سے بھی اجازت لے لیں تو بہتر ہے۔ وہ ایک آدھ دن تک سیالکوٹ جانے والے ہیں۔ وہاں سے جنوری کے شروع میں واپس آ جائیں گے۔ ان کو اجازت دینے میں مجھے یقین ہے تامل نہ ہوگا۔ انگریزی چند روز ہوئے مسلم آوٹ لک میں چھپا تھا۔ وہ مطلوب ہو تو مسلم آوٹ لک سے مل سکتا ہے۔

باقی رہے میرے حالات۔ سو ان میں رکھا کیا ہے۔ میری طرز رہائش مشرقی ہے۔ آپ جب چاہیں شوق سے تشریف لا سکتے ہیں۔

محمد اقبال

لاہور - ۱۹ دسمبر ۱۹۲۲ء

یہ مضمون ۲۲ مارچ ۱۹۲۳ء کو "خلافت اسلامیہ" کے نام سے فوق صاحب نے پمفلٹ کی صورت میں شائع کیا۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ جمہوریت اسلام اور آئین انتخاب خلیفہ مذہب و سیاست کا مشترک اور واحد مطمح نظر ہے۔

جلال بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو     جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اسی سال فوق صاحب نے سوانح ملک العلماء علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی، تاریخ سیالکوٹ اور مشاہیر سیالکوٹ لکھنی شروع کی۔ اس سلسلے میں انہوں نے پہلے اقبال کے استاد شمس العلماء مولانا میر حسن سیالکوٹی سے کچھ استفسارات کئے۔ انہوں نے بعض کتابوں کے نام بتلائے اور بعض شاعروں کا پتہ دیا جو سیالکوٹ کے تھے۔ پھر فوق صاحب نے مولانا کا خط اقبال کی خدمت میں بھیج کر استدعا کی کہ اس بارے میں جو کچھ انہیں معلوم ہے وہ بھی لکھیں تاکہ کتاب کا کوئی پہلو کمزور نہ رہ جائے اور جہاں تک ہو سکے مکمل ہو۔ اقبال نے جواب میں لکھا :-

ڈیر فوق! السلامُ علیکم

مخدومی جناب مولوی صاحب (شمس العلماء مولوی میر حسن) نے جو نام لکھے ہیں ان میں سے میں کسی کو نہیں جانتا سوا عشق پیچہ شاعر کے جو کوئی شاعر نہ تھا ہاں تک بند ضرور تھا۔ سیالکوٹ کے مشہور قدیم شعراء میں سے شیخ محمد علی رائج[1] تھے۔ ان کا دیوان فارسی میں بہت ضخیم میں نے خود دیکھا ہے۔ غالباً شاہ جہان یا عالمگیر کے عہد میں تھے۔ ٹیک چند نے بہار عجم میں جابجا ان کے اشعار کو محاورات فارسی کی سند میں لکھا ہے۔ ایک شعر ان کا مجھے بھی یاد ہے۔

از جوانے سرو قد دیگر بہ پا افتادہ ام     دوستاں رحمے کہ از بام بلند افتادہ ام

غالباً کسی نہ کسی تذکرہ میں ان کا ذکر ضرور آپ کو مل جائے گا۔ مولوی صاحب قبلہ میر حسن صاحب کے

---

[1] شیخ نہیں میر محمد علی رائج چاہیے۔ ان کے حالات خزانۂ عامرہ، تذکرۂ سرخوش اور نشتر عشق وغیرہ میں مل سکتے ہیں۔ سیالکوٹی مل وارستہ ان کے شاگردوں میں تھے۔ وہ ۱۱۵۰ھ میں فوت ہوئے۔

متعلق جہاں تک مجھے یاد ہے میری کوئی نظم نہیں ہے۔ شاید کوئی شعر اشارۃً کسی نظم میں ہو۔ والسلام

۴ مارچ ۱۹۲۳ء محمد اقبال

جب اس کتاب کا مسودہ مکمل ہو کر اقبال کی نظر سے گذرا تو آپ نے ان الفاظ کے ساتھ اہل علم کے سامنے پیش کیا :-

" مولوی عبدالحکیم علیہ الرحمۃ سیالکوٹ کی سرزمین میں پیدا ہوئے جو شاہان مغلیہ کے زمانہ میں اسلامی علوم کی ایک مشہور درس گاہ تھی۔ ان کی عالمگیر شہرت آخر شاہ جہان تک پہنچی جس نے ان کی قدر افزائی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ دربار دہلی میں بادشاہ کے اشارہ سے بڑے بڑے معرکۃ الآرا مذہبی و فلسفیانہ مباحث کرتے تھے جن میں سیالکوٹی فلسفی کی نکتہ آفرینیاں اور موشگافیاں وسط اشیا اور ایران کے حکماء کو محو حیرت کیا کرتی تھیں۔

ان کی فلسفیانہ تصانیف میں سیالکوٹی علی التصورات" ایک مشہور رسالہ ہے جو کچھ مدت ہوئی مصر میں شائع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی اور بھی کتابیں ہیں جو اسلامی ممالک میں بہت مشہور اور ہر دلعزیز ہیں۔ توحید باری تعالیٰ پر بھی ان کا ایک خاص رسالہ جو شاہ جہان کی فرمائش سے لکھا گیا تھا، میری نظر سے گذرا ہے مگر غالباً ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ان کے خیالات کا بیشتر حصہ اب تقویم پارینہ ہے۔ لیکن اسلامی فلسفہ کا مورخ اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

سیالکوٹ میں ان کی مسجد اور تالاب اب تک ان کی یادگار ہیں مگر افسوس کہ ان کا مزار جو تالاب کے قریب ہی واقع ہے نہایت کس مپرسی کی حالت میں اہل سیالکوٹ کی بے حسی اور مردہ دلی کا گلہ گذار ہے۔

منشی محمد الدین صاحب فوق نے جن کی تاریخی کرید مشہور ہے مولانا مرحوم کے حالات زندگی لکھ کر ملک اور قوم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ان کی یہ تصنیف نہایت دلچسپی کے ساتھ پڑھی جائے گی۔

اس رسالہ میں ضمناً سیالکوٹ شہر کے تاریخی حالات بھی ہیں جو نہایت تجسس اور تلاش سے فراہم کئے گئے ہیں۔ اہل سیالکوٹ کو ان حالات سے بالخصوص دلچسپی ہوگی۔ محمد اقبال

۳ دسمبر ۱۹۲۴ء

میرزا غالب کا ایک مشہور شعر ہے۔

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

کچھ اسی قسم کا معاملہ فوق صاحب کو بھی پیش آیا۔ آپ کشمیر میں تھے کہ آپ نے خواب میں اقبال کو دوزخ میں دیکھا خیال کیا آپ کسی تکلیف میں مبتلا ہیں۔ اس لئے اپنے خواب کی پوری کیفیت لکھ کر خیریت دریافت کی۔ پیغمبر دین خودی نے

اسرار کے پردے ہٹاکر اس خواب کی تعبیر کی اور فوق صاحب کی تشویش رفع کرتے ہوئے لکھا: ـــ

ڈیر فوق صاحب! السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ الحمد للہ کہ تاحال ہر طرح خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے خیریت ہے اگر آپ نے خواب میں مجھے دوزخ میں دیکھا ہے تو یہ بالکل صحیح ہے۔ کیونکہ لاہور آج کل دوزخ سے کم نہیں۔ باقی خیریت ہے۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ والسلام

مخلص محمد اقبال

لاہور ۳۰ جون ۱۹۲۴ء

۱۹۲۸ء میں فوق صاحب کی کتاب "شباب کشمیر" شائع ہوئی۔ یہ کوئی مستقل تصنیف تو نہ تھی۔ فوق صاحب کشمیر کے سب سے ہر دلعزیز بادشاہ زین العابدین عرف بڈشاہ کے حالات کئی سال سے جمع کر رہے تھے اور اس عہد کی مبسوط تاریخ لکھنا چاہتے تھے جو ۱۹۴۴ء میں تاریخ بڈشاہی کے نام سے پایۂ تکمیل کو پہنچی اور اس کی اشاعت پر حکومت کشمیر نے فوق صاحب کو ایک ہزار روپیہ انعام عطا کیا۔ شباب کشمیر دراصل تاریخ بڈشاہی کا پیش خیمہ تھی۔ بڈشاہ نے اٹھارہ برس کی عمر میں تخت پر بیٹھ کر پچاس برس سے زیادہ عرصہ تک حکومت کی اور ۸۷۴ھ میں ۹۶ برس کی عمر پا کر انتقال کیا۔ وہ بڑا خلیق، بیدار مغز، صلح کل، عدل گستر، فیاض، علم دوست اور معارف پرور شہنشاہ تھا۔ اس نے اکبر اعظم سے ۷۹ سال قبل اپنے ملک میں متحدہ قومیت کی بنیاد رکھی اور ہندو مسلمانوں کا دل اپنی مٹھی میں لے لیا۔ اس کے کاروبار سلطنت میں دونوں قوموں کے بہترین دماغ برابر کے شریک تھے۔ عام ہندو رعایا اس کی بلائیں لیتی اور اسے "بٹ شاہ" یعنی ہندوؤں کا بادشاہ کہتی تھی۔ مسلمان اس پر جان فدا کرتے اور اسے "بڈشاہ" یعنی بڑا بادشاہ کے نام سے مخاطب کرتے۔ اس کے عدل و انصاف کے قصے دور دور تک مشہور تھے۔ اس کے فیض کرم سے دلوں کی کھیتیاں سرسبز ہوتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مذہب و ملت کے کشمیری اس کے کارناموں پر فخر کرتے اور آج تک اس کا نام عزت و احترام سے لیتے ہیں۔ اس کے زریں عہد کو کشمیر کے شباب کا زمانہ کہا جاتا ہے۔

کتاب شباب کشمیر سے اس وقت کی علمی و ادبی، سیاسی اور دماغی، صنعتی، تجارتی، معاشرتی اور تمدنی ترقیوں کی پوری کیفیت آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اقبال پہلے ہی اس کتاب کی تجویز کو پسند فرما چکے تھے۔ بلکہ اس کی اشاعت کو ضروری سمجھتے تھے۔ آپ نے جب کتاب دیکھی تو فرمایا: ـ

"آپ کی کتاب "شباب کشمیر" کشمیر کی تاریخ میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ عام لوگ بالخصوص اہالیان کشمیر اسے شوق سے پڑھیں گے۔ اس سے پہلے بھی جو لٹریچر آپ نے کشمیر کے متعلق پیدا کیا ہے، میرے نزدیک بہت مفید اور آپ کے علمی ذوق اور حب وطن پر شاہد عادل ہے۔"

اپریل ۱۹۲۹ء میں فوق کی دوسری بیوی کا انتقال ہوا تو اقبال نے تعزیت کا خط لکھا۔ یہ خط ۲۰ اپریل ۲۹ء کا ہے یہی سب سے آخری تحریر ہے جو اقبال کی طرف سے موصول ہوئی۔ اس میں اقبال نے لکھا: ـــ

ڈیر فوق صاحب۔ السلام علیکم

اخبار انقلاب میں آپ کی اہلیہ کے انتقال کی خبر پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ خدا تعالیٰ مرحومہ کو جنت عطا فرمائے اور آپ کو صبر جمیل۔ تقدیر الٰہی سے کوئی چارہ نہیں۔ مسلمانوں کے لئے تسلیم کے سوا اور کوئی راہ نہیں اور یہی راہ انسب و اولیٰ ہے۔ والسلام

محمد اقبال

فوق صاحب افسوس کیا کرتے تھے کہ آخری ایام میں اقبال سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ۱۹۳۶ء کی گرمیوں میں ایک شام کافی مدت کے بعد ان کی نئی کوٹھی جاوید منزل میں ان سے ملنے گئے تھے۔ اس وقت وہ بیمار تھے۔ کوٹھی کے باہر چارپائی پر بیٹھے خان غلام رسول خاں بیرسٹر اور دو اور اصحاب سے اسلامیہ کالج کی پرنسپلی کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ آواز بہت باریک اور کمزور تھی۔ فوق صاحب السلام علیکم کہہ کے بیٹھ گئے۔ قریباً نصف گھنٹہ بیٹھے رہے لیکن ان سے مخاطب نہیں ہوئے۔ چونکہ فوق صاحب ان دنوں کشمیر ایسوسی ایشن کے سیکرٹری تھے جو آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے کھنڈروں پر قائم ہوئی تھی جس میں احمدی جماعت کا بھی کافی اثر تھا، اس لئے انھوں نے خیال کیا کہ شاید اقبال ان سے کچھ ناراض ہیں۔ سلام کر کے چلے آئے۔ لیکن جنوری ۱۹۳۷ء میں جب فوق صاحب کے بھانجے منشی غلام محمد خادم ان کی ملاقات کو گئے تو اقبال انھیں پہچان نہ سکے۔ پوچھا آپ کون ہیں۔ جب خادم صاحب نے اپنا نام بتایا تو فرمایا۔ میری نظر کمزور ہے۔ میں پہچان نہ سکا۔ پھر ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد کہا: فوق کہاں ہے، ایک سال سے نہیں ملا۔ انھوں نے کہا، وہ بیمار ہیں اس لئے میرے ساتھ نہیں آ سکے۔ مئی ۳۶ء کی شام کو آئے تھے، آپ نے ان سے کوئی بات نہیں کی، وہ دل شکستہ ہو کر واپس چلے گئے۔ اقبال نے کہا۔ مجھے ضعف نظر کی شکایت ہے۔ میں ان کو بھی نہ پہچان سکا۔

۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو اقبال کی وفات کے دن بھی فوق صاحب بیمار تھے۔ ان کو سخت بخار تھا۔ اس لئے جاوید منزل تک نہ جا سکے لیکن اسلامیہ کالج کی گراؤنڈ تک چلے آئے جہاں تمام لوگ جمع تھے۔ وہاں سے جنازہ کے ہمراہ بادشاہی مسجد تک گئے اور جب تک انھیں سپردِ خاک نہ کر دیا گیا وہاں سے نہ ہلے۔ پھر جب تک زندہ رہے ان کا ماتم کرتے اور ان کی یاد سینے سے لگائے رہے۔ دیکھئے ایک غزل میں ان کی مفارقت کا ذکر کس حسرت سے کرتے ہیں:

اجل اس مردِ حق آگاہ کو بھی لے گئی یا رب  حقیقت کا جسے بھیجا بنا کر ترجماں تو نے

ہوئے جس سے اسرارِ خودی و بیخودی ظاہر  نہ پلوائی کبھی وہ مے مجھے پیرِ مغاں تو نے

کیا اے فوقؔ چاک اقبال نے اسرار کا پردہ  جو باقی رہ گئے تھے کر دئے وہ بھی عیاں تو نے

ایک اور غزل میں فرماتے ہیں۔

قوم سے جاتا رہا وہ قوم کا اقبال بھی  فطرت حق کا جسے کچھ راز داں سمجھا تھا میں

یا اسے سمجھا تھا میں پیغمبر دین خودی  یا چراغ محفل ہندوستاں سمجھا تھا میں

۱۹۳۸ء

۱۹۳۸ء

محمد عبداللہ قریشی

# اقبال اور طریقت

مضمون شروع کرنے سے قبل یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ عنوان بالا میں "طریقت" کا لفظ اپنے اصطلاحی معنوں میں استعمال نہیں کیا گیا۔ نہ اس مقالے میں اقبال کے فلسفۂ تصوف پر کوئی تفصیلی بحث کی جائے گی۔ بلکہ اقبال کے ایما پر منشی محمد الدین فوق مرحوم نے جو رسالۂ طریقت جاری کیا تھا اس کے متعلق چند دلچسپ باتیں بیان کرنی مقصود ہیں جن کا حال بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔

یہ تو سب جانتے ہیں کہ اقبال علیہ الرحمۃ ایک صوفی صافی خاندان سے تعلق رکھنے اور اولیائے کرام اور صوفیائے عظام سے دلی عقیدت و ارادت رکھنے کے باوجود ایسے صوفیوں اور پیروں سے سخت متنفر تھے۔ جو روحانیات میں ترقی کرنے کے بجائے اپنا پیشہ گردآوری بلکہ گداگری بنا لیتے ہیں۔ اور اپنے مریدوں پر سالانہ ٹیکس لگا کر ان کا خون چوستے ہیں۔ وہ دوسروں کو تو یہ تعلیم دیتے ہیں کہ دنیا مردار ہے۔ کافروں کے لئے ہے مومنوں کو عیش و راحت بہشت میں ملے گی۔ لیکن خود دنیا طلبی میں مبتلا ہو کر محل کھڑے کرتے ہیں عالیشان عمارتیں بنواتے اور جائدادیں خریدتے ہیں۔ چنانچہ آپ کے کلام میں جا بجا اس قسم کے اشارے پائے جاتے ہیں ؎

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی — گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن

یا پھر ؎

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک — نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ

اور اس کی وجہ یہ تھی ؎

صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال — ملا کی شریعت میں فقط مستیٔ گفتار
شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق — افکار میں سرمست نہ خوابیدہ نہ بیدار
وہ مرد مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو — ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار

"شراب الست" بے عملی کا بہانہ بنی۔ اور مسلمان یہ کہہ کر کہ "قسمت کا لکھا ہی ایسا تھا" زندگی کی کشمکش سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اور جمود و خمود نے اس کے قوائے عمل پر اپنا تسلط جما لیا ؎

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں — بہانہ بے عملی کا بنی شراب الست
فقیہ شہر بھی رہبانیت پہ ہے مجبور — کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگ دست بدست
گریز کشمکش زندگی سے مردوں کی — اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست

نتیجہ یہ ہوا کہ جس قرآن پاک کی تعلیم نے مسلمانوں کو مرد و پہ دین کا امیر بنا چھوڑا تھا۔ اب اسی قرآن مجید سے ترکِ جہاں کی تعلیم اخذ کی جا رہی ہے ؎

اسی قرآن میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم — جس نے مومن کو بنایا مہ و پروین کا امیر
تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز — تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر
تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا — کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

غرض اقبالؔ کی نظر میں مسلمان خود اپنے کو اور اپنے خدا کو فریب دے رہا ہے ؎

خبر نہیں کیا ہے نام اُسکا خدا فریبی کہ خود فریبی
عمل سے فارغ ہوا مسلمان بنا کے تقدیر کا بہانہ

خیر یہ باتیں تو محض اضافی حیثیت رکھتی ہیں۔ مقصد بیان یہ ہے کہ حضرت علامہ نے اپنے دوست منشی محمد الدین فوقؔ مدیر اخبار کشمیری لاہور سے کئی دفعہ کہا کہ اس قسم کا کوئی رسالہ جاری کریں۔ جس سے فرقۂ صوفیا کی کوئی اصلاح ہو سکے۔ ان کی غلط تعلیم نے مسلمانوں کو مُردہ دل بنا دیا۔ ہے۔ وہ مسلمانوں کے سامنے ایسا اسلام پیش کرتے ہیں جس پر صدہا غلاف چڑھے ہوئے ہیں۔ جب یہ لوگ خود ہی اسلام کی روح سے واقف نہیں تو اپنے مریدوں کو کیا خاک تعلیم دیتے ہوں گے ان کو راہِ راست پر لانے اور ان میں عشقِ الٰہی کی گرمی پیدا کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

فوقؔ صاحب نے اپنی مجبوریاں ظاہر کیں۔ کہ مجھے ہفتہ وار اخبار کشمیری سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ پھر یہ طبقہ ایسا ہوشیار ہے کہ وہ رسالے کے مضامین دیکھ کر ہوا کا رخ پہچان لے گا۔ اور اسے ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔

اقبال نے فرمایا کہ اس کا علاج نہایت سہل ہے۔ شوگر کوٹڈ مضامین لکھئے۔ گڑ میں زہر ملا کر دیجئے اور اپنے آپ کو بالکل ان کا ہمدرد اور عقیدت مند ظاہر کر کے اس کام کو ہاتھ لگائیے۔ پھر وہ آپ کی بات بھی سنیں گے اور آپ کے مشوروں کو بھی قبول کریں گے۔ اس طرح کچھ خدمت بھی ہو جائے گی اور اصلاح کا مقصد بھی پورا ہو جائے گا۔ دیکھئے! مولانا رومؒ کے متعلق یہ نقصہ مشہور ہے۔ کہ ایک طرف مولوی اور واعظ شریعت حقہ کے مسائل بیان کرتے تھے۔ دوسری طرف مولانا رومؒ اپنی مثنوی کا درس دیتے تھے۔ مثنوی میں بھی وہی باتیں ہوتی تھیں جو دوسرے واعظ سنایا کرتے تھے۔ لیکن مولویوں کے واعظ میں جہاں قال اللہ و قال الرسول کا ذکر کھلے الفاظ میں ہوتا تھا۔ لوگوں کی جمعیت کم ہوتی تھی۔ مگر مولانا رومؒ کے مثنوی کے واعظ میں صدہا لوگ جمع ہو جاتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مولانا رومؒ نے وہ اصلاحی رنگ اختیار کیا تھا جسے لوگ جلد قبول کر سکتے تھے انہوں نے قوم کی نبض دیکھ کر عوام کا مذاق تاڑ لیا تھا۔ اور وہ اسی کے مطابق کتاب و سنّت کے مسائل بیان کرتے تھے۔ برخلاف اس کے دوسرے لوگ خشک ملا تھے۔ اس لئے ناکام رہتے تھے۔ آپ بھی اگر پیروں اور صوفیوں میں گھل مل جائیں گے تو وہ آپ کی بات سنیں گے، کڑوی کسیلی کا برا نہ مانیں گے اور آپ کے خلوص کی قدر کریں گے۔

اس گفتار کے غازی نے کردار کے غازی کو قائل کر ہی لیا اور اگست ۱۹۱۴ء میں فوقؔ صاحب نے رسالہ طریقت جاری کر دیا۔ پہلے پرچہ میں ابو الاعجاز حضرت احسان شاہجہان پوری۔ خواجہ حسن نظامی دہلوی۔ لسان العصر اکبر الہ آبادی۔ خان

احمد حسین خان (مدیر شباب اردو) مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی جیسے نامور بزرگوں کے مضامین نظم و نثر کے علاوہ ایک دلچسپ مکالمہ بھی شائع ہوا جو اقبال اور فوقی کے درمیان ہے۔ یہ سب حضرات اب باقیات الصالحات میں میں شامل ہو چکے ہیں۔

فوقی صاحب کے اپنے اداریے مضمون کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے پرچہ نکالنے سے قبل حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہو کر صوفیائے کرام۔ تصوف مراسم عرس۔ ضرورتِ مرشد اور زیارت قبور وغیرہ کے متعلق ان کے خیالات دریافت کئے تھے۔ اقبال نے جواب میں جو کچھ ارشاد فرمایا تھا۔ وہ بھی لکھ لیا تھا اور ان کی نظر ثانی کے بعد رسالہ میں درج کر دیا تھا۔ اقبال نے اپنے جوابات میں حقائق و معارف کے دریا بہائے ہیں۔ یہ شراب اگرچہ کس قدر پرانی ہو چکی ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ اقبال کے یہ زریں خیالات آج بھی ہر تعلیم یافتہ نوجوان کے غور و فکر کے قابل ہیں۔ اس لئے میں فوقی صاحب کے سوالات اور اقبال کے جوابات اس رسالہ سے لے کر یہاں پیش کرتا ہوں ؎

بیا بہ مجلس اقبال یک دو ساغر کش     اگرچہ سر نہ تراشد قلندری داند

فوقی:۔ صوفیوں سے اسلام کو کیا فائدہ پہنچا؟

اقبال:۔ اہلِ تصوف خصوصاً ہندوستان کے صوفیائے عظام نے اسلام کو وہ رونق بخشی اور بجائے تیر و تلوار کے محض حسنِ عمل اور اخلاقِ محمدی کے ذریعے اس کی وہ اشاعت کی کہ ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں میں چھ کروڑ یقیناً ان ہی بزرگوں کے فیوض و برکات کا نتیجہ ہیں۔

فوقی:۔ صوفیوں سے مسلمانوں کو کیا فائدہ پہنچا؟

اقبال:۔ مسلمانوں کی اخلاقی زندگی پر صوفیائے کرام نے بہت بڑا اثر ڈالا۔ تمام ایسے اوصاف جو اخلاقی پہلو سے انسانیت کا خاصہ ہیں۔ محض انہی بزرگوں کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہیں۔ انہوں نے انسانوں کو انسان اور پھر مسلمانوں کو مسلمان بنایا۔

فوقی:۔ مسلم پالیٹکس کو ان سے کیا فائدہ ہوا؟

اقبال:۔ صوفیوں کا گروہ پولیٹیکل معاملات سے ہمیشہ علیحدہ رہا ہے۔ تصوف کا مقصد تزکیۂ نفس۔ اصلاح باطن اور نفس کشی ہے۔ اس لئے اس نے ملکی الجھنوں میں بہت کم بلکہ بالکل دخل نہیں دیا۔ البتہ بعض بعض سلاطین کو جو اپنے شاہانہ فرائض سے غافل ہو کر ملک میں فتنہ و فساد کا باعث ہوتے رہے ہیں تادیبی ہدایات فرماتے رہے ہیں۔ جیسا کہ تواریخوں کے مطالعہ اور صوفیائے کرام کے حالات سے اکثر ظاہر ہوتا ہے۔

فوقی:۔ اسلامی تصوف دنیا داری کے متعلق کیا تعلیم دیتا ہے؟

اقبال: اسلامی تصوف کی یہی تعلیم ہے کہ وہ دین کے ساتھ دنیا بھی رکھے۔ اسلام رہبانیت کے خلاف ہے۔ اور گھر بار۔ اہل و عیال کو ترک کر کے جنگلوں اور بیابانوں میں زندگی بسر کرنے کو ناپسند کرتا ہے۔ اسلامی تصوف ایسے یوگ کو جو صرف اپنی ذات کے لئے ہو ایک بے فیض اور خشک چشمے سے تشبیہ دیتا ہے بلاشبہ یکسوئی حاصل کرنے کے لئے خلوت و عزلت نشینی کی ضرورت ہے۔ لیکن تمام لوگ اس کے اہل نہیں ہوتے۔ در اصل ترک دنیا ایک بڑا نمونہ ہے۔ اہلِ دنیا کے کاروبار

کے لئے بلکہ یہ صریح خلاف ورزی ہے الہٰی قانون کی جو انسانی نسل کے بڑھتے رہنے اور اس کے پھولنے پھلنے کا مقتضی ہے!

فوقؔ:۔ عرس کی رسم کب سے جاری ہے؟

اقبالؔ:۔ عرب اور دیگر ممالک اسلامیہ کی تو خبر نہیں۔ لیکن ہندوستان کے عرسوں کے متعلق یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ہندوؤں میں چونکہ جاترا کی رسم عرصہ دراز سے چلی آتی ہے۔ اور دور دراز ممالک سے بعض خاص تیرتھوں پہ جاترا کے لئے جایا کرتے تھے۔ اس لئے جب وہ رفتہ رفتہ مشرف بہ اسلام ہونے لگے تو ان کو اسلام سے مانوس کرنے کے لئے ایسے طریقے اختیار کئے گئے جو ان کے مذہبی اور قومی شعائر سے کسی قدر مشابہ تھے۔ یہ میرا قیاس ہے یقین نہیں ہے

فوقؔ:۔ عرس کا مقصد کیا ہے؟

اقبالؔ:۔ عرس کا مقصد تو دراصل یہ ہے کہ جس بزرگ کا عرس ہو۔ اس کے سبق آموز حالات بیان کئے جائیں۔ لوگوں کو اس کے اچھے عمل کی تقلید و پیروی کی ترغیب دی جائے۔ لیکن افسوس ہے کہ موجودہ عرسوں کا بیشتر حصہ اپنے اصلی مقصد سے دور ہٹ چکا ہے۔ اور محض بے خبر ہے۔

فوقؔ:۔ صوفی لوگ موجودہ زمانے کی جدوجہد میں ہمارے لئے کس طرح مفید ہو سکتے ہیں؟

اقبالؔ:۔ اہلِ تصوف خصوصاً ان بزرگوں کا، جو صاحبِ اثر ہیں۔ اور اپنے عقیدت مندوں کا بہت بڑا حلقہ رکھتے ہیں، یہ نہایت ضروری فرض ہے۔ کہ وہ اپنے معتقدوں اور ارادت مندوں کو اپنے اثر میں رکھیں اور ان کی زندگی کو مذہبی اور اخلاقی پہلو سے ایک کامیاب زندگی بنا دیں۔ سوشل ترقی کے لئے جدوجہد کرنا بھی ایک قسم کی بیداری ہے اور یہ بیداری جب کبھی ہوگی۔ حضرات صوفیاء کے پاک نفوس ہی سے ہوگی۔

فوقؔ:۔ اولیاء کی کرامتوں کے متعلق کیا خیال ہے؟

اقبالؔ:۔ میں کرامتوں کا قائل ہوں اور میرا خیال ہے کہ وہ پاک نفوس جن کو اللہ تعالیٰ نے خاص دل اور خاص دماغ عطا کیا ہے اور جو تزکیۂ نفس میں، صاحبِ کمال ہیں نیز اہلِ کمال جستہ اور آب از جو رفتہ واپس لا سکتے ہیں ؎

اولیاء راہست قدرت از اِلٰہ     تیرِ جستہ باز گرداند ز راہ

فوقؔ:۔ قبروں پہ جانا چاہیئے یا نہیں؟

اقبالؔ:۔ اگر مراد اس سے قبر پرستی ہے یعنی صاحبانِ قبور سے حاجات طلب کی جائیں جس طرح خدا کو حاضر ناظر سمجھ کر کی جاتی ہیں تو میں اس کے سخت خلاف ہوں بلکہ اس کو سخت گناہ سمجھتا ہوں۔ اور اگر قبروں پہ جانے سے مطلب فاتحہ پڑھنا۔ عبرت حاصل کرنا۔ اور موت کو یاد کرنا ہے۔ تو میرے نزدیک اس میں کوئی ہرج نہیں۔ بلکہ ایسا ضرور ہونا چاہیئے۔ اس کے علاوہ اس بات کا بھی قائل ہوں کہ قبرستانوں پہ خصوصاً کسی صاحبِ دل کے مزار پہ جانے سے صفائیِ باطن بھی حاصل ہو سکتی ہے۔

فوقؔ:۔ پیر کی ضرورت ہے یا نہیں!

اقبال:۔ پیر یا مرشد کی سخت ضرورت ہے۔ اس کے بغیر انسان کوئی صحیح اور کامل راستہ نہیں دیکھ سکتا۔ روحانی فائدہ تو ان بزرگوں سے صرف ان ہی لوگوں کو ہوگا جو اہلِ دل ہیں۔ جن کے دل میں درد ہے۔ جن کے قلب میں گرمی اور جن کی روح میں تڑپ ہے۔ لیکن کم سے کم اخلاقی فائدہ تو ہر مرید حاصل کر سکتا ہے۔ پیر کی صحبت سے بشرطیکہ پیر دوکانداری نہ کرتا ہو، ہر مرید اپنا اخلاق سنوار سکتا ہے۔ اور جس کا اخلاق درست ہے۔ جس کے افعال ٹھیک ہیں۔ اور جس کے اعمال "اعمالِ حسنہ" کہے جاتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر اور کون بہترین انسان ہو سکتا ہے؟

نوتن:۔ ازمنہ سلف کے سے اب پیر کیوں نہیں ہوتے؟

اقبال:۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ سوسائٹی ان اوصاف سے معرّا ہے۔ جن سے ایسے نیک وجود پیدا ہو سکتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں بڑے بڑے عالم فلاسفر اور موجد پیدا ہوتے ہیں بلکہ دنیا کی کاروباری زندگی میں مشینوں۔ انجنوں اور نت نئی ایجادوں کے ذریعے جس قدر انقلاب ان لوگوں نے پیدا کیا ہے اس نے تمام دنیا اور بالخصوص اہلِ ہند کو عالمِ حیرت میں ڈال دیا ہے۔ مگر اس پر کبھی غور بھی کیا گیا ہے کہ یورپ اور امریکہ کے عالموں۔ فلاسفروں اور موجدوں کی طرح اور ممالک میں ایسے لوگ کیوں پیدا نہیں ہوتے! اس کے جواب میں سوائے سوسائٹی کے تاثرات کے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ جہاں علم وہنر کا چرچا نہیں۔ جہاں دماغوں سے سوچنے اور غور کرنے کا کام نہیں لیا جاتا۔ وہاں ایک فلاسفر۔ ایک عالم اور ایک موجد کس طرح پیدا ہو سکتا ہے؟

لیکن بعض مستثنیات بھی ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرتِ کاملہ دکھانے کے لئے بعض دفعہ ایسے امور کا اظہار بھی کر دیتا ہے کہ سوسائٹی کا اثر بالائے طاق رہ جاتا ہے اور انسان کو اپنی عاجزی اور بندگی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً گوتم بدھ کا ایک بادشاہ کے گھر میں پیدا ہونا اور پھر فقیری اختیار کر لینا۔ سوسائٹی کے اثر پر اگر غور کیا جائے گوتم کے گرد و پیش جس قسم کی سوسائٹی تھی۔ وہ دکھ بیماری فقر و فاقہ اور دردِ دل سے بالکل لاعلم اور عیش و عشرت اور تفریح و مسرت میں محو رہا کرتی تھی۔ ایک بادشاہ کا بیٹا دکھ محسوس کرتا ہے۔ ایک عالم کی تکلیفوں کو اپنی ذاتی تکلیف سمجھتا ہے۔ اور اسی تعلق سے مضطرب ہو کر سلطنت ترک کر دیتا ہے۔

عرب جیسے جاہل اور اجڈ ملک میں جہاں دنگہ فساد۔ خون خرابہ۔ لڑکیوں کا قتل اور دنیا جہان کے دیگر عیوب ایک معمولی بلکہ تفریح کی بات سمجھے جاتے تھے وہاں ایک شخص درگاہِ رب العزت سے اس قسم کا غیر معمولی دماغ و دل لے کر آتا ہے۔ جو ایک عالم میں نہ مٹنے والا انقلاب اور ولولوں سے نہ محو ہونے والی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ میری مراد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے جو دنیا کے سب سے بڑے آدمی اور اللہ تعالیٰ کی رحمتِ خاص کا ایک روشن نمونہ تھے۔ ان کے گرد و پیش اور اوائلِ حیات میں جس قسم کے خیالات تھے ان کا خاکہ مولانا حالی نے اپنی ایک نظم میں اُتارا ہے۔

مختصر یہ ہے۔ کہ اہلِ عرب بات بات پر لڑتے تھے اور لڑائی کا سلسلہ صدیوں تک جاری رکھتے تھے۔ ایک خدا کی جگہ کئی کئی خدا اور اپنے ہی ہاتھ کے بنائے ہوئے بُت پوجتے تھے۔ شخصیت پرستی کا دور دورہ تھا۔

شراب اور خواہشات کی گرم بازاری تھی۔ انصاف اور قانون کا نام و نشان نہیں تھا۔ ان حالات کی موجودگی میں ایسے رحمۃ للعالمین کے وجود ذی جود کی کس طرح توقع ہو سکتی تھی۔ جس نے عرب ـــ جاہل عرب ـــ کو وہ قابل فخر خطہ بنا دیا کہ آج تمام دنیا کے مسلمان سرزمین عرب کو دنیا کا بہترین و افضل ترین ٹکڑا تصور کرتے اور مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ پر جان فدا کرنے کو تیار رہتے ہیں۔

درحقیقت یہ ایک الٰہی قانون ہے کہ بڑے بڑے آدمی وہاں پیدا ہوتے ہیں۔ جہاں ان کے پیدا ہونے کی بظاہر کوئی توقع نہیں ہوتی۔"

اس مکالمہ سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال کی صحبتوں میں وہ باتیں معلوم ہوتی تھیں۔ جن کی آپ کے اشعار میں محض کہیں کہیں دھوپ چھاؤں سی ملتی ہے۔

رسالہ طریقت کی علمی حیثیت چونکہ بہت بلند تھی اس لئے ملک کے گوشے گوشے میں اس کی پذیرائی ہوئی۔ پیر سید جماعت علی شاہ مرحوم و مغفور محدث علی پوری کی وساطت سے پنجاب حیدر آباد دکن۔ کشمیر اور میسور کے اکثر صاحبان اثر نے معقول امداد دی۔ پیر سید محمد حسین سجادہ نشین آلو مہار شریف نے حافظ جھنڈا مرحوم سکنہ گوجرانوالہ کو جن کی پنجابی نظمیں ان کی خوش الحانی کی وجہ سے مقبول عام تھیں۔ فوق صاحب کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ اگر آپ ہمارے ہاں کے کچھ حالات چھاپ دیا کریں۔ تو ہم سردست ایک سو خریدار دے سکتے ہیں۔ آوان شریف والوں سے بھی مدد ملی[1]۔ بہاولپور تونسہ شریف اور کیور تھلہ کے اہل دل حضرات نے بھی کافی خریدار دیئے۔

غرض تھوڑے ہی عرصہ میں اس رسالہ کی اشاعت دو ہزار تک پہنچ گئی۔ عام لوگوں نے بھی اسے پسند کیا اور ہندو بھی خاصی تعداد میں اس کے خریدار بنے۔ اقبال اپنے لگائے ہوئے پودے کو پھلتا پھولتا دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ فوق صاحب کاروبار میں زیادہ مصروف رہنے کی وجہ سے کچھ عرصہ ان کی ملاقات کو نہ جا سکے اس پر آپ نے خط لکھا[2]۔

ڈیر فوق؛

آپ کبھی ملتے ہی نہیں اب تو آپ پیر طریقت بھی بن گئے
خدا کرے جلد حافظ جماعت علی شاہ صاحب کی طرح آپ کے ورود کشمیر
کے متعلق اطلاعیں شائع ہوا کریں۔ والسلام

۲۴ر جولائی ۱۹۱۵ء

آپ کا خادم
محمد اقبال

---

[1] یہاں یہ بات شاید آپ کی معلومات میں اضافے کا باعث ہو کہ اقبال خود بھی بچپن سے سلطان العارفین حضرت قاضی سلطان محمد صاحب دربار آوان شریف کے مرید تھے جو سلسلہ قادریہ سے تعلق رکھتے تھے۔

[2] رسالہ نقوش مکاتیب نمبر جلد اوّل صفحہ ۲۹۴

پیر جماعت علی شاہ صاحب کا نام آگیا تو لگے ہاتھوں فوق صاحب کے اپنے الفاظ میں ان کی چند صحبتوں کا ذکر بھی سن لیجئے۔ جو دلچسپی سے خالی نہیں۔ فرماتے ہیں :-

"۱۹۱۵ء کا ذکر ہے۔ میں انجمن اسلامیہ لوپچھ کی دعوت پر لوپچھ جانے والا تھا اور مولوی محمد عظیم گکھڑوی مرحوم کو بھی ان کی تحریری خواہش کے مطابق اپنے ساتھ لیجانے کیلئے تیار کر رکھا تھا۔ مولوی محمد عظیم میرے دوستوں میں تھے۔ وعظ بہت اچھا کہتے تھے۔ اور حضرت شاہ صاحب کے ممتاز مریدوں میں تھے۔ پہلے ہم دونوں کو جموں پہنچنا تھا۔ وہاں بھی انجمن اسلامیہ کا جلسہ تھا۔ جہاں میری نظم تھی اور ان کا وعظ۔ وہاں گئے تو حضرت شاہ صاحب بھی اسی سلسلے میں تشریف فرما تھے جلسے سے فارغ ہو کر میں نے مولوی محمد عظیم سے روانہ ہونے کو کہا۔ انہوں نے کہا۔ میں تو حاضر ہوں۔ لیکن حضرت صاحب سے اجازت کی ضرورت ہے۔ میں نے کہا۔ اگر اجازت نہ ملی تو پھر ادہ کھسیانے سے ہو گئے۔ لیکن یہی کہا کہ آپ بھی حضرت صاحب سے ذکر کریں۔ میں نے ذکر کیا تو جواب ملا کہ سیالکوٹ تک تو چلو۔ غرض وہاں گئے مگر وہاں دعوتوں کی کثرت اور لوگوں کے آنے جانے کی وجہ سے کسی گفتگو کا موقع ہی نہ مل سکا۔ آخر ایک دن ہمت کر کے ان سے عرض کیا کہ لوپچھ میں جلسہ کا دن نزدیک آرہا ہے۔ پرسوں تک وہ کہوٹہ میں ہمارے لئے سواری اور اپنے آدمی بھیج دیں گے اور یہاں کچھ عرض کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ بات صرف اتنی ہے کہ لوپچھ کے مسلمانوں کو جو اسلامی احکام و تعلیم سے بے خبر ہیں۔ سیدھا راستہ بتانے کیلئے آپ کے ایک مرید و عقیدت مند کو ہمراہ لے جانے کی ضرورت ہے۔ فرمایا۔ اچھا صبح دیکھا جائے گا۔

میں نے صوفی کرم الٰہی بی اے وکیل سیالکوٹ سے جو انکی انجمن خدام الصوفیہ کے سیکرٹری اور ان کے مرید خاص تھے اپنی روحانی تکلیف کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ آپ ہی حضرت صاحب سے سفارش کریں۔ آپ نے جواب دیا میری تو اس قدر جرأت نہیں۔ میں نے کہا آخر وجہ ؟ کہا مرید ہو کے دیکھو لو۔ میں نے کہا ایسی مریدی سے باز آیا۔ جو تھوڑی بہت جرأت اور رہی سہی آزادی کا بھی خاتمہ کر دے۔

اس زمانے میں لیسرو رادر علی پور تک ریل نہ جاتی تھی۔ لوگ اکون (یکوں) پہ آمد و رفت رکھتے تھے۔ صبح ہوئی تو قریباً بچولکے تیار دیکھے گئے۔ جن پر حضرت صاحب کے مرید اور ملازم مع اسباب وغیرہ تھے۔ لوگ اپنے مطالب و مقاصد کے لئے حضرت صاحب کے گرد جمع تھے۔ اور یہ شور سنائی دے رہا تھا۔ کہ حضرت! میرے لئے بھی دُعا فرمائیے۔ حضرت صاحب دُعا فرماتے اور وہ شخص ہاتھ چوم کر علیحدہ ہو جاتا۔ جب سب لوگ ادھر اُدھر ہو گئے تو میں بھی حضرت صاحب سے ملا اور عرض کیا۔ حضرت! میرے لئے بھی دُعا فرمائیے۔ فرمایا کیا ؟ میں نے عرض کیا بس یہی کہ خداوند کریم جو مقلب القلوب ہے اور ایک پل میں دلوں کو پھیر سکتا ہے آپ کو یہ توفیق رفیق کرے کہ آپ میری خاطر نہیں۔ مولوی صاحب کی خاطر نہیں بلکہ لوپچھ کے پہاڑی خطے کے مسلمانوں کو اسلام کی صحیح تعلیم سے آگاہ کرنے کی خاطر مولوی صاحب کو لوپچھ جانے کی اجازت عطا فرمائیں حضرت صاحب ہنس پڑے اور کہا۔ بہت اچھا۔ مولوی صاحب! آپ کو اجازت ہے آپ ان کے ساتھ ابھی روانہ ہو جائیں میں نے کہا حضرت! دیکھئے اتنے لوگوں میں سب سے پہلا خوش نصیب میں ہی ہوں جس نے اپنی دُعا کی مقبولیت یہیں کھڑے کھڑے دیکھ لی"۔

"ایک مرتبہ میں (فوقؔ) سرینگر میں خواجہ اکبر شاہ عشاوری رئیس زینہ کدل کے ہاں مقیم تھا۔ پیر جماعت علی شاہ صاحب بھی کشمیر تشریف لائے وہ حسبِ دستور خواجہ غلام مصطفیٰ بچہ مرحوم فتح کدلی کی کوٹھی میں، جو برلبِ دریا ہے فروکش ہوئے۔ مجھے خبر ہوئی۔ میں سلام کو گیا۔ فرمایا جب تک ہم سری نگر میں مقیم ہیں۔ یہیں آ رہو۔ میں نے کچھ عذر کیا۔ آپ نے آدمی میرے ساتھ بھیجا اور وہ خواجہ اکبر شاہ کو پیر صاحب کا پیغام دے کر میرا بستر اٹھوا لایا۔ پیر صاحب کے ہاں ہر وقت بھیڑ بھاڑ رہتی تھی۔ تنہائی میں لکھنے پڑھنے کا سب لطف جاتا رہا۔ پابندی کی نمازیں، ان کے ساتھ نفل، ختم اور نعت خوانی۔ پھر مجلس کی باقاعدہ حاضری۔ میں اس قیدِ بے زنجیر اور ان تکلفات کا عادی نہ تھا۔ ایک دن پیر صاحب نے خود ہی فرمایا کہیے۔ یہاں کوئی تکلیف تو نہیں؟ میں نے کہا آپ روشن ضمیر ہیں۔ جو تکلیف ہے وہ آپ سے چھپی ہوئی نہیں۔ فرمایا۔ اچھا نفل ختم اور نعت خوانی کی مجالس میں آپ اپنی خوشی سے بیٹھ سکتے ہیں۔

کشمیر میں پیر صاحب کی مجلس میں جو آتا تھا۔ قہوہ یا چائے ضرور پی کے جاتا تھا۔ ویسے بھی عوام کے علاوہ بڑے بڑے لوگ ان کے پاس آتے تھے۔ میں نے ہندواڑہ کے علاقے میں جو سری نگر سے پچاس میل کے فاصلے پر ہے۔ ایک مرد اور ایک عورت کو پیدل آتے دیکھا جو سری نگر میں صرف ان کی زیارت کرنے اور تعویذ لینے کے لئے جا رہے تھے۔ کشمیر کے پیروں اور ان مولویوں اور واعظوں کو جو نذر نیاز لینے کے عادی ہیں۔ پیر صاحب کی یہ ہر دلعزیزی اور مقبولیت دیکھ کر بہت فکر ہوئی کہ اس طرح تو رفتہ رفتہ ہمارے سب مرید جماعت شاہی سلسلہ میں داخل ہوتے چلے جائیں گے اور ہم ٹھن ٹھن گوپال رہ جائیں گے۔ چند پیر صاحبان نے مشورہ کر کے یہ صلاح کی کہ چلو خود پیر صاحب کی ملاقات کو جائیں۔ چنانچہ روانہ ہوئے اور مشورہ یہ کیا کہ پیر صاحب نے ہم کو بلا بھیجا ہے۔ سری نگر آئے۔ پیر صاحب سے ملے اور قہوہ پی کر چلے گئے۔ واپس جا کر دیہات میں یہ مشہور کیا کہ پیر صاحب نے ہمیں اپنے علاقے کی خلافت عطا کرنے کے لئے بلایا تھا اور اپنی طرف سے لوگوں سے بیعت لینے کے اختیارات دیئے ہیں۔ یہ بھی فرمایا ہے کہ دور دراز مقامات سے شہر میں آنے کی وجہ سے لوگوں کو تکلیف ہوتی اور ان کے کام میں ہرج ہوتا ہے۔ لوگ غریب ہیں۔ اس لئے گو آپ پہلے ہی بیعت لینے کے مجاز ہیں لیکن ہماری طرف سے بھی آپ کو اجازت ہے۔ پیر صاحبان کی یہ تجویز کارگر ہوئی اور دیہاتی لوگ جو [illegible] پیر صاحب کے پاس سرینگر میں دوڑ دوڑ کر جایا کرتے تھے وہ وہیں بیعت ہونے لگے۔" [1]

خواجہ حسن نظامی دہلوی کا مدت سے یہ دستور تھا۔ کہ وہ روحانی یادگار کے طور پر ہر سال بعض آدمیوں کو کسی علمی کارگذاری، انسانی خدمت یا خلوص قلب کے صلہ میں خطابات دیا کرتے تھے۔ جنوری ۱۹۱۵ء / ۱۳۳۳ھ کے طریقت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس سال انہوں نے اقبالؔ کو "سر الوسال" اور فوقؔ صاحب کو "صدفی" کا لقب عطا کیا۔ یہ انہی خدمات کے اعتراف میں تھا۔ جو وہ طریقت کے ذریعے سے اسلام تصوف اور صوفیوں کی کر رہے تھے۔

چار پانچ سال تک یہ رسالہ بڑی شان سے نکلتا رہا۔ فوقؔ صاحب خود بھی صوفیاء کی مجلسوں میں بلائے جاتے رہے۔

---

[1] سرگزشت فوقؔ (قلمی)، صفحہ ۱۲۰ – ۱۲۲

آپ نے تصوف کے متعلق کئی مفید کتابیں بھی لکھیں۔ جن میں تذکرۃ الصالحین، تذکرہ علمائے لاہور، حیات گنج بخشؒ، نامع مشفق اور وجدانی نشتر وغیرہ خاص طور پر مشہور ہیں۔ اقبال نے وجدانی نشتر کا نام سوز و گداز تجویز کیا تھا۔ یہ کتاب صوفیوں کے حلقے میں بہت مقبول ہوئی۔ اس کے چھ حصے تھے۔ پہلے کا نام تجلی۔ دوسرے کا برق طور۔ تیسرے کا پیام وصال۔ چوتھے کا تیر و نشتر، پانچویں کا درد دل اور چھٹے کا حال و قال تھا۔ اس میں قرآن مجید کی وہ انقلاب انگیز آیتیں اور عربی، فارسی، اردو اور پنجابی کے وہ دلگداز وجد آفرین درد انگیز اور پر اثر اشعار مع اپنی پوری کیفیتوں کے جمع کئے گئے تھے۔ جن کے پڑھنے یا سننے سے صاحب دل بزرگوں اور پاک باطن لوگوں پر خاص اثر ہوا یا جو دم واپسیں کی طرح مرنے والوں کے آخری کلمات ثابت ہوئے۔ اقبال کو اس کتاب کے دیکھنے کا بے حد اشتیاق تھا۔ چنانچہ آپ نے فوق صاحب کو لکھا۔

مولٰینا فوق! السلام علیکم

آپ کا کارڈ ابھی ملا ہے۔ بھلا آپ کو آنے کی کیونکر ممانعت ہو سکتی ہے۔ میں نے اس خیال سے لکھا تھا کہ آپ مصروف آدمی ہیں۔ آنے میں ہرج ہوگا اور تکلیف مزید کہ انارکلی شیرانوالہ دروازہ سے دور ہے۔

کتاب جب آئے تو ضرور ہمراہ لائیے۔ بلکہ اس کے آنے میں دیر ہو تو بلا کتاب تشریف لائیے۔ ۱۱ دسمبر کا کشمیری نہیں ملا اور نہ آپ کی تازہ کتاب وجدانی نشتر نظر سے گذری ہے۔ والسلام

لاہور — آپکا خادم

۲۱۔ دسمبر ۱۹۱۵ء — محمد اقبال

فوق صاحب نے کتاب بھیجی۔ اقبال نے اسے بہت پسند کیا۔ اور اس کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا:۔

"مولوی محمد الدین فوق ایک صاحب ذوق آدمی ہیں ان کی جدت پسند طبیعت ہمیشہ انوکھی باتوں کی تلاش میں رہتی ہے۔ حال میں انہوں نے ایک کتاب موسوم بہ وجدانی نشتر لکھی ہے۔ جس میں ایسے عربی، فارسی، اردو، پنجابی اشعار جمع کر دیئے ہیں جو تاریخی اعتبار سے ایک خاص اثر اور سوز و گداز کا باعث ہوئے ہیں۔ اس کتاب کی تالیف میں ان کو بہت محنت کرنی پڑی ہوگی مگر مولوی محمد الدین محنت سے گھبرانے والے نہیں۔ کتاب نہایت اچھی ہے اور دلچسپ فوق صاحب کی تلاش قابل داد ہے اور انسانی قلب کی گوناگوں کیفیات پر روشنی ڈالتی ہے۔"

---

سلہ نقوش مکاتیب نمبر ص ۲۹۵

اس کتاب کے چوتھے باب میں کہیں فوق صاحب نے حضرت میاں میرؒ کے مرید اور شہزادہ دارا شکوہ کے مرشد ملا شاہ بدخشانی کا یہ واقعہ بھی لکھ دیا تھا۔ کہ ایک دفعہ آپ نے کسی خاص جذبہ کے ماتحت یہ شعر کہا ؎

پنجہ در پنجۂ خدا دارم      من چہ پروائے مصطفےٰ دارم

شاہ جہان نے علمائے دہلی سے فتویٰ طلب کیا اور ملا شاہ کو بلا کر کہا کہ اس شعر سے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کا پہلو نکلتا ہے۔ حضرت ملا شاہ نے جواب دیا تو میں تو وہ لوگ کہتے ہیں۔ جو اپنے اور مصطفےٰ اور خدا میں تفریق کرتے ہیں۔ خدا کے پنجہ میں آپ بھی ہیں۔ میں بھی اور مصطفےٰ بھی۔ پھر پروا کس کی اور خوف کس بات کا۔ اس پر بادشاہ خاموش ہو گیا۔ اور لوگوں نے سمجھا کہ ملا شاہ کا جادو چل گیا وغیرہ وغیرہ

چونکہ اس واقعہ کا کتاب سے کوئی خاص تعلق نہ تھا۔ اس لئے اقبالؔ نے اس کے متعلق فوق صاحب کو علیحدہ خط کے ذریعے توجہ دلاتے ہوئے لکھا۔

ڈیر فوق! السلام علیکم[1]

دونوں کتابیں مل گئی ہیں۔ انگریزی کتاب پہلے سے میرے پاس موجود ہے افسوس ہے کہ آپ کو مفت میں تکلیف ہوئی۔

وجدانی نشتر خوب ہے۔ مگر تعجب ہے۔ کہ شیخ ملا کے ملحدانہ و رندانہ شعر ؎

من چہ پروائے مصطفےٰ دارم

کو آپ اس کتاب میں جگہ دیتے ہیں۔ اور ملا کی تشریح کس قدر بیہودہ ہے۔ یہی وہ وحدت الوجود ہے۔ جس پر خواجہ حسن نظامی اور اہل طریقت کو ناز ہے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر رحم کرے۔ اور ہم غریب مسلمانوں کو ان کے فتنوں سے محفوظ رکھے وجدانی نشتر پر ریویو دوسرے صفحہ پر درج ہے۔

لاہور ۲۳ دسمبر ۱۹۱۵ء      محمد اقبال

اقبالؔ نے اپنے کلام میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی شان یہ بتائی ہے کہ وہ نائب حق ہیں۔ ان کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ ہے۔ ہر شے ان کے تابع فرمان ہے۔ یہاں تک کہ ان کے اشارۂ انگشت سے چاند دو ٹکڑے ہو جاتا ہے ؎

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ      غالب و کار آفریں کارکشا کارساز

پنجۂ او پنجۂ حق می شود      ماہ از انگشت او شق می شود

اسی اثنا میں اقبالؔ کی مثنوی اسرارِ خودی شائع ہوئی جس میں انہوں نے مسلمانوں کو عرفانِ نفس تعینِ ذات

---

[1] نقوش مکاتیب نمبر ص ۲۹

اور قوّتِ عمل کا احساس دلاتے ہوئے فلسفہ اشراق، عجمی تصوّف اور صوفیانہ شاعری پر تنقید کی کہ انہی چیزوں کے اثر سے مسلمانوں کی پوری قوم قوّتِ عمل سے یکسر محروم ہو گئی ہے۔ چونکہ یونان میں فلسفہ اشراق پھیلا اور ایران میں تصوّف۔ اس لئے حکیم افلاطون یونانی اور حافظ شیرازی کا ذکر بھی آیا۔ اور یہ ذکر کرنا کسی حد تک ناگزیر بھی تھا ——————

—— چنانچہ اقبالؔ نے تصوّف کے بعد معتقدات سے اختلاف کرتے ہوئے انہیں بڑا اور گو سفند قرار دیا۔ اس پر طبقۂ صوفیا میں ہلچل مچ گئی اور ہر طرف سے مثنوی کی مخالفت میں مضامین شائع ہونے لگے[۱] اقبالؔ نے اپنا نقطۂ نظر واضح کرنے کے لئے بہت سے مضامین اخبار وکیل امرتسر میں شائع کرائے۔ ۱۵ر جنوری ۱۹۱۶ء کے شمارے میں اقبالؔ کا جو مضمون "اسرارِ خودی اور تصوّف" کے عنوان سے نکلا۔ اس کا آخری حصّہ چونکہ فوقؔ صاحب کے ایک استفسار کے جواب میں ہے۔ اس لئے ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔ اقبالؔ لکھتے ہیں:-

"میرے دوست منشی محمد دین فوقؔ ایڈیٹر (اخبار کشمیری اور) رسالہ طریقت نے مجھ سے سوال کیا کہ تم نے حافظ پر کیوں اعتراض کیا ہے۔ وہ رسالہ طریقت کے ایڈیٹر ہیں اس حیثیت سے ان کو تصوّف میں دلچسپی ہے۔ اس وقت فرصت کم تھی۔ اور چونکہ مضمون طویل تھا میں نے ان کو کوئی جواب نہ دیا۔ عام مسائل تصوّف پر گفتگو کرتا رہا۔ بعد میں انہوں نے اپنی تازہ تصنیف وجدانی نشتر نام میرے دیکھنے کے لئے ارسال فرمائی۔ تو معلوم ہوا کہ ان کے سوال کا جواب ان کی تصنیف میں موجود ہے۔ صفحہ ۹۴ پر مصنف لکھتے ہیں:-

"اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے جو بڑا متشدد بادشاہ تھا۔ ایک مرتبہ حکم دیا کہ اتنی میعاد کے اندر جتنی طوائفیں ہیں۔ سب نکاح کر لیں۔ ورنہ کشتی میں بھر کر سب کو دریا بُرد کر دوں گا۔ سینکڑوں نکاح ہو گئے۔ مگر پھر بھی ایک بڑی تعداد رہ گئی۔ چنانچہ ان کے ڈبونے کے لیے کشتیاں تیار ہوئیں۔ اور صرف ایک دن باقی رہ گیا۔ یہ زمانہ حضرت شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی کا تھا۔ ایک حسین نوجوان طوائف روزمرّہ آپ کے سلام کو آیا کرتی آپ درود و وظائف سے فارغ ہوتے وہ طوائف سامنے آ کر دست بستہ کھڑی ہو جاتی جب آپ نظر اُٹھاتے وہ سلام کر کے چلی جاتی۔ آج جو وہ آئی تو بعد سلام عرض حال ہوئی کہ آج خادمہ کا آخری سلام قبول ہو۔ آپ نے حقیقت دریافت فرمائی۔ جب تمام کیفیت بیان کر دی تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ حافظ شیرازؔ کا یہ شعر ؎

در کوئے نیکنامی مارا گذر نہ دادند
گر تو نمی پسندی تغیّر کن قضا را

تم سب یاد کر لو اور کل جب تمہیں دریا کی طرف لے چلیں تو بآوازِ بلند اس

---

[۱] اس سلسلے میں میرا مضمون "معرکۂ اسرارِ خودی" ملاحظہ کیا جا سکتا ہے جو مجلّہ اقبال لاہور میں شائع ہو چکا ہے۔

شعر کو پڑھتے جاؤں سب ملوائفوں نے اس شعر کو یاد کر لیا۔ جب روانہ ہوئیں تو
یاس کی حالت میں نہایت خوش الحانی سے بڑے درد انگیز لہجے میں اس شعر کو پڑھنا
شروع کیا۔ جس نے پتھر کو ستا دل تھام کر رہ گیا۔ جب بادشاہ کے کان میں آواز پہنچی تو
بے قرار ہو گیا۔ ایک عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ حکم دیا سب کو چھوڑ دو۔"

منشی محمد دین صاحب فوق کو معلوم ہو کہ جو اُن کے نزدیک حافظ کا حسن ہے وہی میرے نقطۂ نظر سے قبح ہے۔ اور وہ یہ کہ مسئلہ تقدیر کی ایک ایسی غلط مگر دل آویز تعبیر سے حافظ کی شاعرانہ جادوگری نے ایک متشرع اور نیک نیت بادشاہ کو جو آئین حقہ شرعیہ اسلامیہ کی حکومت قائم کرنے اور زانیات کا خاتمہ کر کے اسلامی سوسائٹی کے دامن کو اس بدنما داغ سے پاک کرنے میں کوشاں تھا قلبی اعتبار سے اس قدر ناتواں کر دیا۔ کہ اُسے قوانین اسلامیہ کی تعمیل کرانے کی ہمت نہ رہی اور اگر عالمگیر دارا کے معاملے میں بھی "بادشناں بدارا" پر عمل کرتا تو ہندوستان میں شریعت اسلامیہ کی حکومت کبھی قائم نہ ہوتی۔

"مجھے امید ہے کہ اس تحریر سے آپ کے ناظرین کو میرا نقطۂ نظر سمجھنے میں مدد ملے گی اور وہ اسی اعتبار سے اسلامی ادبیات کا مطالعہ کر کے اپنے نتائج خود پیدا کریں گے۔"

اقبال کے گہرے دوست ہونے کی وجہ سے اہل طریقت فوق صاحب سے بھی آہستہ آہستہ بدظن ہو گئے۔ اور انہوں نے رسالہ کا مقاطعہ شروع کر دیا۔ جس سے یہ پرچہ ڈولنے لگا۔ اور اس کی جان کے لالے پڑ گئے۔

اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ یہ ہوا کہ انہی دنوں مولوی محمد عظیم گلگڑوی مرحوم جو پیر سید جماعت علی شاہ صاحب کے مریدوں میں بڑے خوش بیان واعظ تھے۔ حضرت شاہ صاحب کے بعض منہ لگے مشیروں سے کسی بات پر ناراض ہو گئے اور انہوں نے طریقت میں اصلاحی مضامین کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ابھی اس کے چند ہی نمبر نکلے تھے کہ چاروں طرف سے اس قسم کے مضامین پر اعتراض ہونے لگے۔ فوق صاحب نے اقبال سے مل کر کہا کہ "آثار اچھے نظر نہیں آتے۔ لوگ آپ کی مثنوی اسرار خودی پر پہلے ہی لے دے کر رہے تھے۔ کہ آپ نے خواجہ حافظ شیرازی کی تعلیم پر چوٹ

الحذر از گوسفنداں الحذر

کا فقرہ چست کر دیا ہے اب ان اصلاحی مضامین سے صوفیاء کے حلقوں میں ناراضی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ اقبال نے فرمایا کہ فضا کی تاریکی سے ڈرنا ٹھیک نہیں مخالفت کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیے۔ آج کل کے پیروں اور صوفیوں کی اصلاح فی الحقیقت ثواب کا کام ہے۔ اگر اس اثناء میں یہ رسالہ بند بھی ہو جائے تو اسے جہاد اکبر سمجھنا چاہیے آخر یہ رسالہ کسی طرح سنبھل نہ سکا اور جتنی تیزی سے یہ ترقی کی طرف بڑھا تھا اتنی ہی جلدی بند ہو گیا۔

اس کے بند ہوتے ہی فوق صاحب نے اسی قسم کا ایک اور رسالہ نظام جاری کر دیا۔ مگر اقبال کو طریقت کے بند ہونے کا افسوس ہی رہا چنانچہ ایک خط میں آپ نے اس کا اظہار اس طرح کیا۔

"ڈیر فوق! السلام علیکم

آپ کا خط مع ملفوف اخبار مل گیا ہے۔ جس کے لئے شکریہ ہے

---

[illegible] مکاتیب [illegible] جلد اول صفحہ ۹

رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے بعض نمبر پنجاب پبلک لائبریری اور شاید یونیورسٹی لائبریری میں بھی ہوں۔ آپ کسی روز جا کر خود دیکھیں۔

رسالہ نظام کا اجراء مبارک ہو۔ میرے خیال میں تو آپ طریقت ہی کو فروغ دیتے تو شاید حضور نظام تصوف کی اشاعت کا صلہ عطا فرماتے محمد دین صاحب (صوفی پنڈی بہاؤ الدین) آپ سے بہتر نہیں لیکن وہ آدمی معاملہ فہم اور کاروان ہیں۔ میں بھی آپ کے لئے انشاء اللہ کچھ لکھوں گا۔ حکیم محمد دین صاحب کئی روز سے نہیں ملے۔ خدا کرے اچھے ہوں۔ آپ سے ملیں تو میری طرف سے استفسارِ حال کیجئے۔ والسلام

محمد اقبال

۱۴ر دسمبر ۱۹۱۸ء

فروری ۱۹۱۹ء میں رسالہ نظام کا پہلا پرچہ شائع ہوا۔ جس میں "مکافات عمل" کے عنوان سے اقبال کے مندرجہ ذیل شعر درج تھے جو اقبال کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ؎

ہر عمل کے لئے ہے ردِ عمل　　دہر میں نیش کا جواب ہے نیش
شر سے آسمان لیتا ہے　　انتقامِ غزال وا فشردہ میش
سرگذشت جہاں کا سرِ خفی　　کہہ گیا ہے کوئی نکو اندیش
شمع پروانہ را بسوخت ولے
شد بہ پایاں شود بہ روغن خویش

(بشکریہ اقبال ریویو)

# اقبال اکیڈمی کراچی

مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ میں اقبال نے جو کارنامہ سرانجام دیا اس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ تو مستقبل کا مورخ ہی لگا سکے گا لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ انھوں نے برصغیر کے مسلمانوں کو ذہنی طور پر نئے حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے تیار کیا۔ مغربی علوم سے پوری طرح واقف ہونے کے بعد انھوں نے مغربی تہذیب و تمدّن کے نقائص کو اس وقت عیاں کیا جب مغرب کے مفکرین ابھی اس تمدّن کی چکا چوند سے پوری طرح مرعوب تھے اور ایشیا والوں کو اپنی قدیم تمدّنی روایات از سر نو زندہ کرنے کی طرف توجہ دلائی تاکہ وہ مغربی تمدّن کے مہلک اثرات سے محفوظ رہ سکیں۔

برصغیر کے مسلمانوں کی سیاسی زندگی کافی عرصے سے بحران کا شکار تھی۔ تحریکِ خلافت کی مقبولیت سے اتنا واضح تھا کہ مسلمان ہر اس کوشش میں جان و مال کی قربانی دینے سے دریغ نہیں کرتے جس سے انھیں اپنے ملّی وجود کے استحکام میں مدد ملتی ہو۔ ملّی وجود کا تصور مسلمانوں کے نزدیک محض برِعظیم کے مسلمانوں کے مفاد تک محدود نہ تھا بلکہ اس میں وہ دنیا کے تمام مسلمانوں کو ایک وحدت سمجھتے تھے۔ لیکن بعد کے حالات نے اس سیاست کو ایک ایسے راستہ پر گامزن کر دیا جو ان کے مزاج کے مطابق نہ تھی اور اس لئے کوئی سیاسی تحریک صحیح معنوں میں ان میں جوشش پیدا نہ کر سکی۔ انگریزوں اور ہندوؤں کی طرف سے ان پر یلغار ہوتی رہی، مسلمان سیاستدان کبھی ایک اور کبھی دوسری طرف لڑھکتے رہے لیکن عوام اس تمام دَور میں تقریباً بے حس تماشا دیکھتے رہے۔

یہ اقبال کی ژرف بینی تھی کہ انھوں نے حالات کے صحیح مطالعے کے بعد یہ تجویز پیش کی کہ اس برصغیر کے مسلمانوں کے ملّی وجود کے تحفظ کے لئے ایک علیحدہ سلطنت کا قیام لابدی ہے۔ اس نعرۂ مستانہ کو اس وقت کے مسلم سیاستدانوں نے زیادہ قابلِ توجہ نہ سمجھا لیکن حالات درجہ بدرجہ بدتر ہوتے گئے اور آخر کار قائدِ اعظم کو اس تجویز کو قبول کرنا پڑا۔ یہ اقبال کے تدبّر اور اس کی دور اندیشی کا بہترین ثبوت ہے کہ پاکستان کے نظریے کو جب عوام کے سامنے پیش کیا گیا تو انھوں نے اسے اس طرح قبول کیا اور اس کے لئے وہ وہ قربانیاں پیش کیں کہ تحریکِ خلافت کا دور ماند پڑ گیا۔

پاکستان بننے کے بعد حکومت پاکستان نے بجا طور پر محسوس کیا کہ اس ملک کی نظریاتی بنیاد کو مستحکم کرنے کے لئے اقبال کے فکر کی ترویج نہایت ضروری ہے تاکہ ملک کے اندر اور باہر لوگوں کو اقبال کے فلسفۂ حیات اور اس کے کارناموں سے واقف

کیا جائے ۔اس مقصد کے پیش نظر حکومت پاکستان نے ۱۹۵۲ء میں اقبال اکیڈیمی قائم کی جس کا مقصد اقبال کے فکر کی نشر و اشاعت تھا۔چنانچہ پچھلے تیرہ سالوں میں اکیڈیمی کی طرف سے اقبال پر کوئی اڑتیس کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں اقبال کی اپنی کتاب علم الاقتصاد اور سید نذیر نیازی کے نام خطوط کا مجموعہ مکاتیب اقبال بھی ہیں۔پانچ کتابیں انگریزی میں ہیں جن میں نواب ذوالفقار علی خاں مرحوم کی مشہور کتاب اے وائس فرام دی ایسٹ AVOICE FROM THE EAST بھی شامل ہے ۔ان کے علاوہ اقبال کی کتابوں کے بنگالی، سندھی، پشتو، گجراتی، فارسی، عربی، ترکی زبانوں میں ترجمے شائع کئے گئے ہیں پچھلے دنوں پیام مشرق کا جرمن ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے جو جرمنی میں طبع ہوا تھا۔

اکیڈیمی کی طرف سے ایک سہ ماہی مجلہ بھی شائع ہوتا ہے جس میں فلسفہ، تاریخ، اسلامیات وغیرہ موضوعات پر تحقیقی مقالے شائع کئے جاتے ہیں۔یہ مجلہ سال میں دو بار اردو میں اور دو بار انگریزی میں شائع ہوتا ہے۔

اکیڈیمی کا سب سے اہم ترین کام جس کی طرف پچھلے دو سال سے بڑی تندہی سے توجہ دی جا رہی ہے یہ ہے کہ اقبال کے خطوط اور تحریروں کو حاصل کیا جائے اور انہیں مناسب شکل میں شائع کر کے لوگوں تک پہنچایا جائے۔اس وقت شائع شدہ مکتوبات کے علاوہ اکیڈیمی کے پاس مندرجہ ذیل غیر مطبوعہ خطوط جمع ہو چکے ہیں:۔

۱۔گرامی کے نام خطوط — ۹۰۔ یہ کتاب بہت جلد شائع ہو رہی ہے۔ان خطوط کو جناب محمد عبداللہ قریشی نے مرتب کیا ہے۔مقدمے میں گرامی کی زندگی کے حالات، اقبال اور گرامی کے تعلقات اور خطوط پر روشنی ڈالی گئی ہے اور متن میں خطوط معہ تعلیقات شامل ہیں۔

۲۔ مہاراجہ کشن پرشاد کے نام خطوط۔ ۵۰ یہ بھی بہت جلد اکیڈیمی کی طرف سے معہ مقدمہ اور تعلیقات شائع ہونگے

۳۔ ڈاکٹر سید عبدالباسط کے نام خطوط۔ ساٹھ

۴۔ مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی کے نام خطوط — نو

ان کے علاوہ کئی اور متفرق خطوط جمع کئے جا چکے ہیں۔

مکاتیب اقبال کے مختلف مطبوعہ مجموعوں کے علاوہ اقبال کے بے شمار خطوط مختلف رسائل اور اخبارات میں مختلف وقتوں میں شائع ہوتے رہے۔اسی طرح اقبال کے بعض اردو اور بعض انگریزی مضامین و بیانات ابھی تک کسی مجموعے میں شائع نہیں ہوئے۔اسی طرح اقبال کی بعض تصویریں ایسی ہیں جو کسی مجموعے میں ابھی تک منظر عام پر نہیں آئیں اور بعض تو بالکل غیر مطبوعہ ہیں۔چنانچہ اکیڈیمی نے ان تمام چیزوں کو جمع کر کے تین حصوں میں تقسیم کیا۔ امید ہے کہ یہ تینوں مجموعے بہت جلد شائع ہو جائیں گے۔

۱۔"انوار اقبال" جس میں اقبال کے متفرق اور غیر مطبوعہ خطوط، مضامین اور بیانات شامل ہیں۔اس میں اقبال کی بعض نادر غیر مطبوعہ تحریریں اور اسناد کے عکس شامل ہیں۔اس میں اقبال کی کتابوں کے عکس بھی شامل کئے گئے ہیں۔

۲۔انگریزی مضامین اور خطوط کا مجموعہ

۳۔تصاویر کا البم جس میں بعض نایاب رنگین تصاویر بھی شامل ہیں۔

اکیڈیمی کی کوشش ہے کہ اقبال کے خطوط اور دیگر تحریروں کو جتنی جلدی ہو سکے جمع کیا جائے۔



اپنے عزیز مہمانوں اور دوستوں
کو رُوح افزا پیش کرنا موسم گرما
کے آداب میں شامل ہے۔
رُوح افزا
اب بآسانی دستیاب ہے
HFP
نروب
مشرق
ہمدرد فروٹ پروڈکٹس - لاہور - کراچی
united

ڈائرکٹر صاحب تعلیمات لاہور ریجن نے بذریعے سرکلر نمبر ۲۵۵۴۴ اور ڈائرکٹر تعلیمات آزاد حکومت جموں و کشمیر مظفرآباد نے بذریعے
سرکلر نمبر E ۹/۱/۷۱--۳۰۱۵ مورخہ ۹ مئی ۱۹۶۶ء اپنے اپنے حلقے کے مدارس عالیہ اور لائبریریوں کے لیے منظور فرمایا۔

پوسٹ بکس نمبر ۳۲۳ لاہور

رجسٹرڈ ایل نمبر ۲۴۸۲

غیر معمولی اشاعت

# ادبی دنیا

بیادگار ناخدائے اُردو مولانا صلاح الدین احمد مرحوم

مرتبہ

محمد عبداللہ قریشی

اپریل مئی ۱۹۶۷ء

قیمت: فی پرچہ پچاس پیسہ

# بزمِ ادب

اعلان کے مطابق ادبی دُنیا کا یہ شمارہ علامہ اقبالؒ کے تذکار اور فکر و فن کے مطالعہ کے لیے وقف کیا گیا تھا۔ مگر کاغذ کی گرانی بلکہ نایابی نے کمرِ ہمت توڑ دی اور یہ حسرت دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ ارادہ تو اب بھی ہے لیکن حالات معمول پر آئیں تو کچھ بات بنے ؎

وصل اس کا خدا نصیب کرے
میرؔ جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ

محمد عبداللہ قریشی

مقبول پریس ہال روڈ لاہور میں باہتمام وحید الدین چھپا اور صلاح الدین احمد پرنٹر و پبلشر نے دفتر ادبی دنیا مال روڈ لاہور سے شائع کیا

# دامِ خیال

میری زندگی میں کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں جو اوروں کے لئے سبق آموز ہو سکے۔ ہاں خیالات کا تدریجی انقلاب البتہ سبق آموز ہو سکتا ہے۔ (اقبال نامہ حصہ اول ص ۴۲۶)

میرے پہلو میں ایک چھوٹا سا بت خانہ ہے کہ ہر بت اس صنم کدے کا رشک صنعت آذری ہے۔ اس پرانے مکان کی کبھی سیر کی ہے؟ خدا کی قسم بنارس کا بازار فراموش کر جاؤ (اقبال نامہ حصہ دوم ص ۳۵۶)

میرا سینہ یاس آفریں اور غم انگیز خیالات کا خزینہ ہے۔ یہ خیالات میری روح کی تاریک بانبیوں سے سانپ کی طرح نکلے چلے آتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں ایک سپیرا بن جاؤں گا۔ گلیوں میں پھروں گا اور تماش بین لڑکوں کی ایک بھیڑ میرے پیچھے پیچھے ہوگی۔

اگر وہ خیالات جو میری روح کی گہرائیوں میں طوفان بپا کیے ہوئے ہیں۔ عوام پر ظاہر ہو جائیں تو پھر مجھے یقین واثق ہے کہ میری موت کے بعد میری پرستش ہوگی۔ دنیا میرے گناہوں کی پردہ پوشی کرے گی اور مجھے اپنے آنسوؤں کا خراج عقیدت پیش کرے گی۔ (بنام عطیہ فیضی)

پس از من شعر من خوانند و دریابند و می گویند
جہانے را دگرگوں کرد یک مردے خود آگاہے (اقبال)

# درسِ عمل

ساحلِ افتادہ گفت گرچہ بسی زیستم
ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من کیستم
موج ز خود رفتۂ تیز خرامید و گفت
ہستم اگر میروم گر نروم نیستم

اقبال

کسی کنارۂ ساکن نے بحر سے یہ کہا
اگرچہ خلق ہوئے مجھ کو مدتیں گزریں
مگر ہنوز عجب گومگو کا عالم ہے
نہ زندگی ہی مسلّم نہ موت ہی کا یقیں
سنا جو موج نے لہرا کے یہ جواب دیا
اگر رواں ہوں تو زندہ سمجھ نہیں تو نہیں

حکیم آزاد انصاری

عرشی امرتسری

# انجمنِ افلاک

رات افلاک پہ تھی انجمنِ روح و ملک — نور و تقدیس سے معمور تھا ایوانِ فلک
مرکزِ دائرہ میں عرشِ جلالِ لاہوت — اِرد گرد اس کے صف آراستہ اہلِ ملکوت
دائیں جانب ادب آموز رسولوں کی قطار — بائیں پہلو میں ولی اور صفِ سُبحہ شمار
جنتِ سامعہ آوازۂ سبحان اللہ — جلوہ افروز بہر حال و بہر شان اللہ
سامنے کی طرف اک نور کا دروازہ کھُلا — اس سے داخل ہوئے کچھ لوگ کہ یہ ہیں شعرا
یہ سنائی ہیں، یہ رومی ہیں، یہ عطار آئے — یہ عراقی ہیں، یہ سعدیِ گہربار آئے
ایک ہندی بھی ہے اس قافلے میں اہلِ کمال — زندہ رود اس کا یہاں نام ہے اور واں اقبال
خیر مقدم کیا جبریل نے بڑھ کر ان کا — اور دریافت کیا، آنے کا مقصود ہے کیا؟
پیرِ رومی نے کہا آئے کہ ہے تو محرمِ راز — شاعرِ ہند ہے ساغر کشِ صہبائے حجاز"
"آ رہا ہے حرمِ قدس میں نیازی کے لئے — طالبِ اذن ہے کچھ عرض گزاری کے لئے"
لمحہ بھر چھپ کے نمودار ہوئے روح امیں — اور کہا "اذن ہے اے خطۂ مشرق کے مکیں!"
اُٹھے اقبال، بڑھے، جھک کے ہوئے سجدہ گزار — اور کھولی تپشِ دل سے زبانِ گفتار

"جرأت آموز مری تابِ سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو"

شکوہ اور اس میں جگر تاب حرارت ہیہات
پسرِ آدم خاکی کی جسارت ہیہات!

انبیا ہیں متحیر کہ یہ نادان ہے کیا
اور فرشتوں کو ہے لرزہ کہ یہ انساں ہے کیا

سر کیا شکوہ تو پھر ختم ہی کر کے چھوڑا
مرے گفتار سے پیمانے کو بھر کے چھوڑا

چھا گیا عالمِ افلاک پہ افسونِ سکوت
محفلِ قدس ہوئی منزلِ ہامونِ سکوت

نہ وہ تسبیح کی آواز، نہ تقدیس کلوش
ایک منظر تھا مہیب، ایک فضا تھی مدہوش

ناگہاں ایک ندا غیب سے مسموع ہوئی
کوثرِ نور میں اک موج تکلم اٹھی

اے کہ تو مسلمِ ہندی کی وکالت کو اٹھا
ترجمانی کا جو حق تھا وہ ادا تو نے کیا

تیری اس شوخیٔ گفتار میں ہے سوزِ دروں
ما دروں را نگرایم ورنہ بینیم بہ دل

تیرا شکوہ ہے پسند اور تری فریاد قبول
ہم کو منظور ترا جذبۂ دیں، عشقِ رسول

دیکھ کر رنگِ چمن ہو نہ پریشاں مالی
کوکبِ غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی
خس و خاشاک سے ہوتا ہے گلستاں خالی
گل بر انداز ہے خونِ شہدا کی لالی
رنگ گردوں کا ذرا دیکھ تو عنابی ہے
یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے

تم کو ہم دیتے ہیں زندانِ فرنگی سے نجات
اور اس قوم سے ہیں جن کے خدالات دستات

شان ہم دیتے ہیں عزت بھی تمہیں دیتے ہیں
دولت و جاہ و حکومت بھی تمہیں دیتے ہیں

بحر و معدن جبل و نہر پہ قابض ہو جاؤ
دشت و صحرا چمن و شہر پہ قابض ہو جاؤ

اہل ثابت کرو اپنے کو تم اس دولت کا — امتحاں ہے یہ تمہاری خرد و حکمت کا
وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے،

اپنے اسلاف کی شہراہ پہ چل کر دکھلاؤ — اور ابلیس کے پھندوں سے نکل کر دکھلاؤ
عہدِ صدیقؓ و عمرؓ، سادگی و ہشیاری — وہ عدالت، وہی اخلاق، وہی دینداری
می شود ملک شما، ملک نیاگانِ شما — بہ ثریا برسد کنگرہ ایوانِ شما
قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دو
دہر میں نامِ محمدؐ سے اُجالا کر دو

علما بہر خدا داعی الی الخیر بنیں — وزرا اپنے فرائض میں سبک سیر بنیں
فوج میں جذبہ سربازی و خودداری ہو — ہر جواں قوم کا تصویرِ فداکاری ہو
ملک میں ایک بھی غدار نہ رہنے پائے — سرکش و خائن و بدکار نہ رہنے پائے
راست بازی ہو شعار، اور دیانت ہو چلن — علم و تہذیب سے آراستہ ہوں اہلِ وطن
سنّی و شیعہ کہ پنجابی و افغان ہو تم — یہ کوئی فرق نہیں، محض مسلمان ہو تم
ایک ہے منفعت اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبیؐ، دین بھی ایمان بھی ایک
حرمِ پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک
وقت ہے وقت کہ ہو جائیں مسلمان بھی ایک

بسمل دہلوی

# اقبال

جہانِ شعر میں وہ میرؔ کی آشفتہ فرمائی  ملائک نے لکھی اُس کے مقدر میں پذیرائی
وہ اس کی شاعری برہم زنِ عہدِ شکیبائی  کہ ہر ہر لفظ میں اک دردِ ہستی اک غم آرائی
اُسے فطرت نے بھیجا تھا یہاں اپنی زباں دیکر
ستم خوردہ تمناؤں کی اک طرزِ بیاں دیکر

وہ غالبؔ پہ وہ فکرِ معلّی کی جبیں سائی  وہ داغؔ زمزمہ گو کی زباں وہ نکتہ آرائی
وہ احساساتِ حالیؔ کی تغیر کیش رعنائی  کہ جس سے قوم خوابیدہ نے لی ہلکی سی انگڑائی
یہاں سے شاعری کے رنگ میں کچھ انقلاب آیا
کشاکش نے سحر دیکھی، حمیت پر شباب آیا

مگر اقبالؔ کی مستحسنہ انداز بیاں اُس کا  وہ طرزِ کشمکش، وہ دفترِ سوزِ نہاں اُس کا
یہ کب ممکن ہے بالائے فلک ہو آشیاں اُس کا  بعید فہم ہے اندازۂ حدِ گماں اُس کا
وہ اپنے دل میں طوفانِ حرارت لیکر آیا تھا
جگر میں سوز آنکھوں میں مروّت لے کر آیا تھا

وہ تاریکیِ زنداں دیکھ لیتا تھا نشیمن سے  حریمِ ناز کے پردے اُٹھا دیتا تھا چتون سے
پئے صحرا نہ لیتا تھا گل و لالہ وہ گلشن سے  بدل دیتا تھا ایجادِ سکندر قلبِ آہن سے
ہُما اُس کی نگاہِ دور رس کی زد میں رہتا تھا
جنوں تک عالمِ ادراک کی سرحد میں رہتا تھا

کبھی وہ شانِ اسرارِ خودی کو سامنے لایا  کبھی اس نے رموزِ بیخودی کا درس فرمایا
کبھی نظمِ حیاتِ مستقل کا نکتہ سمجھایا  کبھی دنیا کے منظر پر مع ضربِ کلیم آیا
درِ معبود پر پہنچا دلِ درد آشنا لیکر
کبھی شکوہ بلب ہو کر کبھی بانگِ درا لیکر

جنوں میں اک تدبّر اور تدبّر میں جہانبانی  جہاں بانی میں درویشی مگر مسجودِ سلطانی
سمجھتا ہوں کہ اب کیوں ہے فرشتوں کو پریشانی  ہوئی اقبالؔ سے تکمیلِ احساساتِ انسانی
دریں عالم غمِ اقبالؔ بسملؔ رہنما دارم
بکوشش میتوانم شد اگر بختِ رسا دارم

آرزو اکبرآبادی

# علّامہ اقبالؒ

اس نظم کو لکھنے کی تحریک ایک مضمون سے ہوئی جسے مولانا کے محترم جناب عبداللہ قریشی صاحب نے قلمبند فرمایا ہے۔ آرزو

چرخِ ملّت کا درخشندہ ستارا اقبالؒ
بحرِ مستقبلِ رنگین کا کنارا اقبالؒ

اس کی ہر نظم کہ ہے ضامنِ تعمیرِ وطن! — اس کے افکار میں ہے جنّتِ محسوس نہاں
اس کے احساس کی تنویر میں گم ہے وہ سوز — جس کا سرمایہ ہے ملّت کیلئے مہرِ تپاں
اس کی تقلید ہے ہم سب کیلئے شمعِ عمل — اس کے انداز کا مدّاح ہے ہر پیر و جواں
اس نے الفاظ میں بھر دی تھی تجلّی دل کی — اسکے نغمات میں ہے روحِ عمل سوز افزاں
ڈگمگاتی ہوئی کشتی کا سہارا اقبالؒ
بحرِ مستقبلِ رنگیں کا کنارا اقبالؒ

اسکو ناصحِ جہاں کہیئے مسیحا کہیئے — وہ قلندر تھا مگر شاہوں سے ممتاز بھی تھا
گردشِ شام و سحر پہ تھیں نگاہیں اس کی — وقت کے ساتھ بھی تھا وقت کی آواز بھی تھا
درسِ افغانی و حالی کا سنایا اس نے — تھا تہِ دام بپا آمادۂ پرواز بھی تھا
ایسا جلوہ تھا کہ ہر قلب ہے جس سے نور تاب — جس کی تفسیر نہ ہو ایسا وہ اک راز بھی تھا
ہم بڑے فخر سے کہتے ہیں ہمارا اقبالؒ
بحرِ مستقبلِ رنگیں کا کنارا اقبالؒ

مغربی ساز شکستہ ہوا جس کے دم سے — جس نے کھولا تھا فرنگی کی سیاست کا بھرم
جس کی آواز نے افرنگ کے بت توڑے تھے — گونج سے جس کی دہلتے تھے کلیساؤں کے حرم
وسطِ اسپین میں پہنچا وہ کچھ اس شان کے ساتھ — جیسے فاراں کی حدوں سے ہو کوئی بات رقم
اس نے نطشے کو بتایا تھا خدائی کا وہ راز — جس کا ادنیٰ سا تصور بھی ہے بھاری بھرکم

کفر کی بزم کے سر پر تھا اک "آرا" اقبالؒ
بحرِ مستقبلِ رنگیں کا کنارا اقبالؒ

"کانٹ" کی نقدِ گراں بار لٹی جس کے سبب — "برگساں" پہنے ہوئے جس سے ہے طوق و زنجیر
اس نے "ہیگل" کو بڑی شان سے للکارا تھا — اس کی آواز میں پنہاں تھا جلالِ تکبیر
قلبِ "ڈے کارٹ" پہ ہے نقشِ حقیقت اس کی — "اسپنوزا" کیلئے وہ کہ تھا چلتی شمشیر
"ہابس اور لاک" تھے یوں لرزہ براندامِ عمل — جیسے توحید کے حلقوں میں ہوں اہلِ تکفیر

قائدؒ و قادرؒ و آرنلڈ کا پیارا اقبالؒ
بحرِ مستقبلِ رنگیں کا کنارا اقبالؒ

نطشے، کانٹ، برگساں، ہیگل، ڈے کارٹ، اسپنوزا، ہابس، لاک، مغربی مفکرین ہیں، جنہیں حضرت علامہ اقبالؒ نے سمجھا اور جواب دیا۔ — آرزو

سید ناصر علی تاسف خورجوی

# قیامت کر گیا اقبالؔ کا لیکن جدا ہونا

سراپا خون حسرت سے ہے آلودہ فغاں میری
تڑپ اٹھے گا سُنکر ہمنوا تو داستاں میری

کسی کے روکنے سے کیا رُکے آہ و فغاں میری
جگر میرا ہے دل میرا دہن میرا زباں میری

روش کو بے روش دیکھا چمن اُجڑا ہوا پایا
ہوئی بھی تو ہوئی کب ختم یہ قید گراں میری

تری محفل کا یہ آئین فطرت کے منافی ہے
نہ بدلی ہے نہ بدلے او بُت کافر زباں میری

اسی کے دم سے یہ رنگینیاں ہیں جیب و داماں کی
سلامت حشر تک یا رب یہ چشم خونفشاں میری

کبھی فریاد قمری میں کبھی اُنشاد بلبل میں
فغاں پرد از یاں میری نوا پیرائیاں میری

رہا کرتا ہوں میں شب بھر شریک صحبت انجم
انہی سے پوچھئے بنتا بیاں بیخوابیاں میری

ہم آغوش ایک جا ہوں درد بلبل سوز پروانہ
سمجھ لیجے مرتب ہو گئی پھر داستاں میری

چمن سے کون یہ جان بہاراں ہو گیا رخصت
کہ مرجھائی ہوئی ہے آج شاخ آشیاں میری

تپش آمادہ یوں تو عمر بھر رکھا مقدر نے
رگ دل کاٹ کر رکھ دی مگر اس غم کے نشتر نے

چمن سے بلبل رنگین ترنم کا جدا ہونا
چمن کا ہے مرے ہم داستاں ماتم سرا ہونا

خدا دل دے تو اُسکے ساتھ ہی درد محبت دے
کہ ہے انسان کا مقصود ہی درد آشنا ہونا

غضب کا سوز ہے اے شمع روشن تیری فطرت میں
بقائے گرمی محفل کی خاطر خود فنا ہونا

جلاتی ہیں ہزاروں بار دل کو بجلیاں پہلے　　نہیں آساں بہت دشوار ہے آتش نوا ہونا
نہ جب تک صدمۂ مضراب سے تاروں کو جنبش ہو　　محیط ساز سے ممکن نہیں پیدا صدا ہونا
لگی ہو جس کے دل میں آگ سی سوزِ محبت سے　　بجا ہے اس کا تفتیدہ نفس اے ہمنوا ہونا
سبق لینا ہو جس کو گرمیٔ سوزِ محبت کا　　وہ پروانوں کا دیکھے شمعِ محفل پہ فدا ہونا
ہزاروں داغ ہیں یوں تو ہمارے غمزدہ دل پہ　　قیامت کر گیا اقبال کا لیکن جدا ہونا
ہزاروں نغمہ پیرا آئیں گے یوں تو گلستاں میں　　مگر ممکن نہیں پیدا اب ایسا خوش نوا ہونا

رجز خواں اُٹھ گیا دُنیا سے اپنی قوم و ملت کا
رگوں میں خون اب دوڑے گا کیونکر جوشِ ہمت کا

ہمارا رازداں تو تھا ہمارا ترجماں تو تھا　　ہمارے دل کی لے دردآشنا گویا زباں تو تھا
سراپا دردِ ملت سوزِ ملت جوشِ ملت تھا　　ہمارے دور میں اسلاف کا الحق نشاں تو تھا
تجھے احساسِ ملت چین دم بھر کو نہ دیتا تھا　　جمودِ قوم پہ ہر وقت سرگرمِ فغاں تو تھا
نہ ثانی جس کا مشرق میں نہ ہمتا جس کا مغرب میں　　ہماری قوم میں وہ شاعرِ معجز بیاں تو تھا
ٹپکتی تھیں دُرِ شہوار موجیں جس کی ساحل پہ　　حقائق کا معارف کا وہ بحرِ بیکراں تو تھا
تری چپ سے لگی ہے سب کے مُنہ پہ مہرِ خاموشی　　کلیم و صائب و عرفی و طالب کی زباں تو تھا
ترے افکارِ عالی سے ہویدا صاف ہوتا ہے　　خودی اور بیخودی کا درحقیقت رازداں تو تھا
ہماری تیرہ بختی ہے ترا دنیا سے اُٹھ جانا　　کہ ملت کے ہزاروں مٹنے والوں کا نشاں تو تھا
کریگا اس محفل میں کون اب جوشِ عمل پیدا　　اکیلا امتِ مرحومہ کا اک خطبہ خواں تو تھا

بدینگونہ عزیز کاروان ما چساں رفتی
کہ مارا در فغاں بگذاشتی خود در جناں رفتی

خالد بزمی

# اقبال

جبینِ پُر متانت سے ہویدا اس کی عظمت تھی
اور اُس کے دم سے دُنیائے ادب کی زیب و زینت تھی
چمن زارِ ادب میں "اک گلِ رنگیں قبا" تھا وُہ

ادب کے باغ میں اس نے کئی غنچے کھلائے ہیں
اور اس کی مسکراہٹ سے کئی گُل مسکرائے ہیں
گلستانِ ادب کے واسطے "بادِ صبا" تھا وُہ

کہاں وُہ طرزِ لاثانی، کہاں وُہ فکرِ لافانی
کہ اِس میدان میں آسان نہیں اُس کا کوئی ثانی
گلستانِ سخن کا "بلبلِ شیریں نوا" تھا وُہ

حقیقت میں وہ جانِ محفل و روحِ گلستاں تھا
جہاں تاریکیاں تھیں اُن میں وہ شمع فروزاں تھا
مسلماں قوم میں "اک رہبرِ درد آشنا" تھا وہ

نہ اب محفل میں وُہ رونق، نہ وُہ رنگینیاں باقی
نہ وُہ صہبا، نہ وُہ ساغر، نہ وہ مینا، نہ وہ ساقی
ادب کے میکدے میں "میکشِ رونق فزا" تھا وُہ

رہے گا اُس کی علمی خدمتوں کا تذکرہ اکثر
قیامت تک کرے گی ناز تاریخِ ادب اُس پر
کہ تاریخِ ادب میں "اک متاعِ بے بہا" تھا وُہ

کہاں اقبالؔ سا صاحب دل و صاحب نظر پیدا
"بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا"
مسلماں قوم کا "ہمدرد و مخلص رہنما" تھا وہ

صدیق افغانی

# پیامِ اقبال

کتنی صبحوں کا تصور ہے پیامِ اقبال　　جلوۂ حسن کا منظر ہے کلامِ اقبال
کیا خیال اس کی بلندی کا کریں اہلِ زمیں　　دُور ہے عرش نشینوں سے مقامِ اقبال
لوحِ دل پر ہی نہیں نقش یہ اسمِ اعظم　　صفحۂ دہر پہ بھی ثبت ہے نامِ اقبال
شعر میں جب ہوں معانی کے سمندر پنہاں　　کس طرح ماند پڑے رنگِ دوامِ اقبال
محفلِ شوق میں پیاسا رہے کیسے کوئی　　جب شب و روز ہی گردش میں ہو جامِ اقبال
کاکلِ شعر کے رنگیں ہیں بہت پیچ و خم　　خوبصورت ہے رخِ صبح سے شامِ اقبال
خوف سے سینۂ افلاک دہل جاتا تھا　　جب بھی پڑتا تھا زمیں پہ کبھی گامِ اقبال
رنگ و خوں، قوم و وطن، نسل و نسب، ذات و صفات　　توڑنا ہی تھا بُتِ کفر کو کامِ اقبال
قوم بیدار ہوئی، آہِ سحر گاہی سے　　کر گیا کام عجب، سوزِ تمامِ اقبال
صاحبِ فقر پہ اسرارِ جنوں فاش ہوئے　　پیرِ رومی تھا حقیقت میں امامِ اقبال
فکر و احساس کا چمکے گا یہ جب تک سورج　　جگمگاتے ہی رہیں گے در و بامِ اقبال

جب بھی صدیق میں پڑھتا ہوں شبِ فرصت میں
بالِ جبریل سے آتی ہے مشامِ اقبال!

اکبر حمیدی

# شاعرِ مشرق

تری نواؤں نے بخشا دلوں کو سوزِ یقیں
تڑپ اٹھے ہیں مرے تیرہ خاکداں کے مکیں
ترے جنوں نے خرد کو دیا ہے درسِ خودی
تری نگاہ نے کھولے رموزِ دنیا و دیں
ترے قلم نے لکھیں آپ اپنی تقدیریں
مثالِ مہرِ درخشاں تھی تیری لوحِ جبیں
ترے پیام نے اک تازہ ولولہ بخشا
ترا پیام ہے امید بخشِ قلبِ حزیں
ترے جلال سے اٹھے مری نظر کے حجاب
ترے جمال سے پائی نگاہ نے تسکین
ہزار گتھیاں تیری خرد نے سلجھائیں
ہزار پردے اٹھائے ترے جنوں نے کہیں
بہت اچھالا ہے نطشے کو اہلِ مغرب نے
مگر اے شاعرِ مشرق ترا جواب نہیں

سید فضا جالندھری

# دلیلِ رہِ سخن اقبالؒ

مرا سلام دلیلِ رہِ سخن اقبالؒ دلوں کو آج بھی گرما رہا ہے تیرا خیال
ترے جمال میں تیری بصیرتوں کا جلال تری نگاہِ حقیقت شناس ملّی جمال

ترے سخن میں ہے شادابیٔ چمن اب بھی
تری حیات ہے اک شمعِ انجمن اب بھی

حکایتِ دلِ بیتاب ہے ترا شکوہ نوائے قوم کی رُوداد ہے ترا شکوہ
فغانِ تشنہ نوا ہے ترا شکوہ حریفِ جرأتِ فریاد ہے ترا شکوہ

جب آہ عزم کو رہ مدعا نہ ملتی تھی
تری فغاں ہی سے زنجیرِ شورش ملتی تھی

ہے آج بھی وہی رعنائی اثر تیری ہے آج بھی دلِ آگاہ کو خبر تیری
شعاعِ مہرِ درخشاں ہے ہر نظر تیری مری نظر میں حقیقت ہے جلوہ گر تیری

ترا کلام ہے گویا کلامِ فطرت کا
ترا پیام ہے گویا پیامِ فطرت کا

ترے کلام نے عالم کو زندگی بخشی خودی کے نغمے سنا کے خود آگاہی بخشی
نظر نظر نے ہر اک دل کو روشنی بخشی نفس نفس نے زمانے کو زندگی بخشی

جبینِ شعر ہے اور آستانہ اقبال
جہاں میں گونج رہا ہے ترانہ اقبال

نگاہِ خلق میں مستور ہے جہاں ہے تو مکاں سے دور کہیں عرشِ لامکاں ہے تو
ہمیں ہے تری ضرورت مگر نہاں ہے تو خدا کے واسطے آ، بتا دے کہاں ہے تو

فدا بہار ترے جاں فزا تبسم پر
فضا نثار ترے دل نشیں تکلم پر

ڈائرکٹر صاحب تعلیمات لاہور ریجن نے بذریعہ سرکلر نمبر ۴۴ ۲۵۵ اور ڈائرکٹر تعلیمات آزاد حکومت جموں و کشمیر مظفر آباد نے بذریعہ
سرکلر نمبر E ۱۱/۷۱-۵۱۲۰ مورخہ ۹ مئی ۱۹۶۶ء اپنے اپنے حلقے کے مدارس عالیہ اور لائبریریوں کے لیے منظور فرمایا

پوسٹ بکس نمبر ۳۳۱ لاہور — رجسٹرڈ ایل نمبر ۲۴۸۲

غیر معمولی اشاعت

# ادبی دنیا

بیادگار رہنمائے اردو مولانا صلاح الدین احمد مرحوم

مرتبہ

محمد عبد اللہ قریشی

جولائی ۱۹۶۷ء

قیمت: فی پرچہ پچاس پیسہ

اتحاد پریس ریل روڈ لاہور میں باہتمام وحید الدین چھپا اور فصیح الدین احمد پرنٹر و پبلشر نے دفتر ادبی دنیا مال روڈ سے شائع کیا

# بزمِ ادب

حکیم محمد سعید صاحب دہلوی کا ۲۸ مئی ۶۶ء کا خط کراچی سے آیا۔ شاہد احمد دہلوی مدیر ساقی کے انتقال پُرملال کی خبر بجلی بن کر قلب پر گری اور محفلِ ادب کو ویران کر گئی۔ حکیم صاحب فرماتے ہیں :-

"شاہد احمد دہلوی بھی چل بسے، اللہ کو پیارے ہو گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

علم و ادب کی بساطِ شاہ جہانی خود انہوں نے بچھائی تھی، ان کے دم سے تھی، اب سمٹ گئی۔ فانوسِ علم و ادب میں جو چند ٹمٹاتی لرزتی شمعیں باقی رہ گئی ہیں، ان میں سے ایک اور آج خاموش ہو گئی۔

شاہد احمد دہلوی، خدا ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، ایک نورتن تھے دنیائے علم و ادب میں۔ یہی نہیں کہ وہ عالی مقام تھے، بے شمار عالم اور ادیب انھوں نے بنا دیئے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ وہ ایک ایسے ساقی تھے کہ جس نے کسی جام و مینا کو خالی رہنے نہ دیا۔ آخر دم تک ان کا فیض جاری رہا۔ ایسی شخصیتیں جیسی کہ شاہد احمد دہلوی تھے روز روز نہیں پیدا ہوا کرتیں۔ ان کا گزر جانا بڑا سخت ماتم ہے۔"

بے شک شاہد احمد دہلوی کے اٹھ جانے سے دنیائے ادب ہی میں خلا پیدا نہیں ہوا بلکہ تہذیب و ثقافت کو بھی شدید نقصان پہنچا ہے۔ مرحوم کو ادب کے ساتھ ساتھ موسیقی سے گہرا شغف تھا اور وہ کلاسیکی موسیقی میں استاد کی حیثیت رکھتے تھے۔ ساقی کے ذریعے انھوں نے سینتیس۳۷ سال ادب کے نئے رجحانات کی سرپرستی کی۔ وہ دہلی کی بڑی صحیح اور پیاری زبان لکھتے تھے، خلوص شرافت کے متحرک پیکر تھے۔ ہمارے ساتھ ان کے دیرینہ مراسم تھے۔ ہمیں اس صدمہ میں ان کے پسماندگان سے دلی ہمدردی ہے۔

محمد عبد اللہ قریشی

# اقبال شناس بزرگ کی یاد میں

یہ گوشہ شیخ عبدالقادر مرحوم کے لئے وقف کیا گیا ہے۔ اقبال کے ساتھ شیخ عبدالقادر کا ذکر کوئی انمل بے جوڑ بات نہیں۔ یہ شیخ موصوف ہی تھے جنھوں نے اقبال کی ابتدا سے انتہا کا اندازہ لگایا تھا۔ اقبال کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جب انھوں شعر گوئی ترک کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ شیخ عبدالقادر ہی کی کوشش اور ترغیب سے اقبال نے یہ ارادہ ترک کر کے بزم بیں از سر نو اپنی شعلہ نوائی سے اجالا کیا تھا۔ اس لحاظ سے وہ حقیقی معنوں میں اقبال شناس تھے۔

ادارہ سماجی بہبود رام گڑھ لاہور نے معروف ادبی تنظیموں کے تعاون سے اُردو کے اس عظیم محسن، مخزن کے نامور مدیر اور صاحب طرز انشا پرداز کی سترھویں برسی پر ۹ر فروری ۱۹۶۷ء کو بی این آر اڈیٹوریم میں ایک پر وقار تقریب شعر و مقالات منعقد کی تھی جس میں شیخ مرحوم کی حیات، فن اور قومی و ادبی خدمات پر مقالات پڑھے گئے اور شعرا نے خراج عقیدت ادا کیا۔ ایس۔ ایم انوار قمر جنرل سیکریٹری کے نام جن مشاہیر کرام اور دانشوروں نے پیغامات ارسال کئے وہ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:۔

## مسٹر جسٹس ایس اے رحمان (ہلال پاکستان)

آپ کے خط سے معلوم ہوا کہ ادارہ سماجی بہبود، شیخ سر عبدالقادر مرحوم کی برسی پر ایک تقریب کا اہتمام کر رہا ہے مجھے اس خبر سے بہت مسرت ہوئی۔ شیخ صاحب مرحوم اُردو زبان و ادب کے عظیم محسنوں میں سے تھے اور پنجاب میں اُردو کا فروغ ان کی مساعیٔ جلیلہ کا بہت حد تک مرہونِ منت ہے۔

ادیب اور ادیب نواز ہونے کے علاوہ وہ ایک بلند اخلاق اور وسیع المشرب انسان تھے۔ اور اپنی انہی خوبیوں کے طفیل ہر دلعزیز تھے۔ اُردو زبان و ادب کو انھوں نے ایک سلیس اور دلکش طرزِ تحریر سے آشنا کیا۔ ان کے جاری کردہ رسالہ "مخزن" نے اس برعظیم کے ادبی حلقوں میں ایک بلند مقام حاصل کیا تھا اور اس کامیابی میں ان کی عظیم شخصیت کا بھی

دخل تھا۔ کیونکہ ان کے ذاتی اثر و رسوخ سے سربرآوردہ عصری مصنفین ان کی قلمی اعانت پر آمادہ ہوئے۔ اُردو کے نام لیوا اُن کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالےٰ ان پر اپنی رحمتیں نازل کرے۔ آمین۔

## پروفیسر حمید احمد خاں وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی

شیخ عبدالقادر مرحوم و مغفور اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ اُن کی وفات کے ساتھ ہمارے بزرگوں کی وہ نسل ختم ہوگئی، جن کی صحبت میں بیٹھ کر اگر انسان گھنٹوں باتیں سنتا رہے تو بھی سیر نہ ہو۔ انھوں نے صدی کے موڑ پر برِعظیم کے خوابیدہ مسلمانوں کو کروٹ لیتے اور آنکھیں کھولتے ہوئے دیکھا تھا، اور اُن اُبھرتی ہوئی شخصیتوں کا بھی قریب سے مطالعہ کیا تھا جن کی کوشش سے پاکستان کا ظہور عمل میں آیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی عظیم الشان ہستی کی صحبت سے فیض یاب ہونا ایک نعمتِ عظمیٰ کا درجہ رکھتا ہے۔

شیخ عبدالقادر کی زندگی کا ایک اہم رُخ اُردو زبان و ادب سے اُن کا عشق تھا۔ وہ پہلے آدمی تھے جنھوں نے بڑے قرینے سے متحدہ ہندوستان کے نقشے کے طول و عرض پر ان مقامات کی نشان دہی کی جہاں اردو رائج تھی۔ پھر اس نقشے کو "مخزن" کے سرورق پر برسوں شائع کیا۔ وہ خود ایک صاحبِ طرز ادیب، نقاد اور انشا پرداز تھے۔ انھوں نے مخزن کے ذریعے سے ایسے ادیبوں اور شاعروں کو علمی حلقوں میں روشناس کرایا جو آگے چل کر اردو ادب کے اکابر قرار پائے۔ پنجاب یونیورسٹی کو یہ فخر حاصل ہے کہ جب یہاں ایم اے اُردو کی تدریس کا آغاز ہوا تو اساتذہ میں ان کا نام سرِفہرست تھا۔

میں اس تقریب پر ادارہ سماجی بہبود کے کارکنوں کو مبارک باد دیتا ہوں کہ انہیں قوم کے ایک محسن کی یاد تازہ کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔

## ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی شیخ الجامعہ کراچی یونیورسٹی

مجھے یہ معلوم ہو کر مسرت ہوئی کہ ادارہ سماجی بہبود سر عبدالقادر مرحوم کی سترھویں برسی منا رہا ہے۔ مجھے اپنے دوست ریاض قادر صاحب کے ساتھ مرحوم کی خدمت میں حاضری کا موقعہ ملا تھا۔ اس زمانہ میں وہ لندن میں تشریف فرما تھے۔ ان کے اخلاق اور گفتگو سے ان کی عظمت کا کچھ اندازہ ہوتا تھا۔ مرحوم کی وہ خدمات جو انھوں نے اس برِعظیم کے مسلمانوں کی ترقی کے سلسلے میں انجام دیں، فراموش نہیں ہوسکتیں اور اردو ادب اور زبان کے ملتفاریں ان کے حصّہ پر مہر دوام ثبت ہے۔ مجھے امید ہے کہ برسی کی تقریب مرحوم کی خدمات کے شایانِ شان ہوگی۔

## ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی وائس چانسلر اسلام آباد یونیورسٹی

مجھے یہ سن کر بڑی مسرت ہوئی ہے کہ ادارہ سماجی بہبود کی طرف سے اُردو کے مشہور ادیب جناب سر شیخ عبدالقادر

مرحوم کی سترھویں برسی منائی جا رہی ہے۔ اور اس سلسلہ میں ایک یادگاری مجلسِ مذاکرہ کا اہتمام بھی ہو رہا ہے۔

زندہ قومیں اپنے ان بزرگوں کو کبھی فراموش نہیں کرتیں جنھوں نے ملت کی حیاتِ اجتماعی کے کسی اہم شعبے میں بے لوث خدمات انجام دی ہوں۔ اس ادارہ نے شیخ صاحب مرحوم کی یاد تازہ کرکے اس راہ کے مسافروں کے لئے گرمیٔ قلب کا جو سامان مہیا کیا ہے۔ اور نئی پود میں ذوقِ سلیم، شوقِ جستجو اور خود اعتمادی پیدا کرنے کی جو کوشش کی ہے۔ وہ بذاتِ خود ایک نہایت مفید تعلیمی اور ملی خدمت ہے۔ جس کے لئے اراکینِ ادارہ تحسین و تبریک کے مستحق ہیں۔

جناب سر شیخ عبدالقادر مرحوم نے جس لگن انتھک محنت اور بے لوث جذبہ سے اردو زبان و ادب کی خدمت کی اور نئے علمی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے دامنِ اردو کشادہ کیا اس کی مثال خال خال ہی ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قوم نے ان کو اسلامی ہند کے نشاۃ ثانیہ کے اولین علمبرداروں میں جگہ دی اور ان کی خدمات کو ہمیشہ تشکر و امتنان کی نظر سے دیکھا۔ ان کے علمی کارنامے "مخزن" کے اوراق میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

شیخ صاحب کا ایک بہت بڑا کارنامہ جس کے لئے نہ صرف اس برصغیر کے مسلمان بلکہ ساری دنیائے اسلام ان کی مرہونِ منت ہے، علامہ اقبال کی عدیم المثال شاعرانہ صلاحیتوں سے دنیا کو روشناس کرانا ہے۔

میری دعا ہے کہ پاکستانی نوجوان نہ صرف ان کے علمی کارناموں سے ہی روشناس ہوں بلکہ اللہ تعالیٰ انہیں ان کا خلوص، جذبۂ خدمت اور ذوقِ تحقیق بھی عطا فرمائے۔ اور انہیں ملک و ملت کی خدمت کی اُن روایات کو تازہ رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

## مولانا عبدالماجد دریابادی مدیر "صدق جدید"

شیخ عبدالقادر مرحوم ہی کہنا چاہیئے کہ وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے "مخزن" کے ذریعے سے پنجاب میں صحیح و جدید اردو ادب کا مذاق پیدا کیا۔

اس سے بھی قبل "پنجاب آبزرور" انگریزی میں نکال کر ملی خدمات کا حق ادا کر چکے تھے —— ان دونوں پیش قدمیوں میں وہ اپنی نظیر آپ ہی تھے۔

پنجاب ہی نہیں، یو پی بلکہ سارا ہی ملک ان کا ممنونِ احسان ہے — اس وقت تک وہ "سر" نہیں ہوئے تھے۔ صرف شیخ صاحب تھے۔

سب سے بڑھ کر موہ لینے والا ان کا ذاتی کردار تھا، ان کی شرافت، ان کا انکسار، ان کی اعتدال پسندی، ان کی صحیح مذہبیت، ان کی دینداری، ان کی متوازن طبیعت ان کا علم و تحمل، ان کی عالی ظرفی، یہ سب اس خزانے کے چمکتے ہوئے جوہر تھے۔

اللہ انہیں بلند سے بلند رتبے عطا فرمائے۔ آمین۔

## چودھری نذیر احمد سابق اٹارنی جنرل سپریم کورٹ آف پاکستان

سابق پنجاب میں، اُردو ادب اور اردو کی ترویج میں شیخ عبدالقادر صاحب مرحوم و مغفور کا ایک خاص مقام ہے۔ جس کا اعتراف زندگی میں ہی ہو چکا تھا۔ اور جو ان کی وفات کے بعد اب پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے۔

وہ آسان مگر با محاورہ نثر کے استاد تھے۔ اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ بطور مدیر "مخزن" اُردو ادب کی جو خدمت انھوں نے کی ہے وہ ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہے۔

ادارہ سماجی بہبود رام گڑھ لاہور مرحوم کی سترھویں برسی کے موقعہ پر ان کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا اہتمام کر رہا ہے۔ یہ نہایت ہی مناسب اقدام ہے کیونکہ شیخ صاحب مرحوم اپنے وقت کے نامور ادیب تھے بلکہ ایک مشہور سماجی کارکن بھی تھے۔

مجھے اُمید ہے کہ ادارہ کی یہ کوشش کامیاب رہے گی۔ اور ہماری نئی پود کو اپنی قومی زبان کی آبیاری اور نشو ونما میں حصہ لینے کی ترغیب کا باعث ثابت ہوگی۔

مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہم اِس قومی فریضہ کی ادائیگی میں بڑی غفلت کا ثبوت دے رہے ہیں۔ شیخ صاحب مرحوم نے غلامی کے زمانے میں بھی زبان کی کما حقہٗ خدمت کی۔ کتنے افسوس کی بات ہوگی اگر ہم آزادی کے بعد بھی اپنی ذمہ داری سے غافل رہیں۔

## ڈاکٹر محمد باقر پرنسپل یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

یہ سن کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ اُردو کے عظیم محسن سر عبدالقادر مرحوم کی سترھویں برسی منا رہے ہیں۔ سر عبدالقادر مرحوم سے میرے ایک عرصے تک نیازمندانہ تعلقات رہے۔ وہ نہ صرف ایک ادیب اور ادیب پرور آدمی تھے، بلکہ بحیثیت انسان کے اپنے دور کی ایک بہت بڑی شخصیت تھے۔ انھوں نے پاک و ہند کے اس دور کی شخصیتوں کو قریب سے دیکھا تھا، جنھوں نے اس برِصغیر کے مسلمانوں کے احیاء کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ ان کے قریب بیٹھنا ایک ایسی نعمت تھی جس سے محروم ہونے کے بعد آج تک تلافی نہیں ہو سکی۔ آپ بہت نیک اور عمدہ کام کر رہے ہیں۔ میری دلی دعا آپ کے ساتھ ہے۔

## شاہد احمد دہلوی مدیر "ساقی" کراچی

سر شیخ عبدالقادر صاحب ان محسنوں میں سے تھے جنھیں اُردو زبان کبھی فراموش نہیں کرے گی۔ انہیں اُردو سے عشق تھا اور دلی کی زبان سے والہانہ شیفتگی۔ اس صدی کے آغاز میں انھوں نے "مخزن" جاری کیا تھا۔ جسے موجودہ ادبی رسائل کا مُورثِ اعلیٰ کہنا چاہیئے۔ سر عبدالقادر کی مقناطیسی شخصیت نے اس زمانے کے

سبھی اعلیٰ درجے کے ادیبوں اور شاعروں کو اپنے گرد جمع کر لیا تھا۔ ان میں سے بعض آسمانِ ادب پہ آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ مثلاً سر محمد اقبال، میر غلام بھیک نیرنگ، علامہ راشد الخیری، پروفیسر مرزا محمد سعید، علامہ نیاز فتحپوری، حکیم ناصر نذیر فراق دہلوی، خوشی محمد ناظر، مولانا ظفر علی خاں، یلدرم، شہزادہ مرزا ارشد گورگانی، اشرف حسین دہلوی (جن سے شیخ صاحب نے میر حسن کی مثنوی پہ ایک معرکۃ الآرا مقدمہ بھی لکھوایا تھا) خواجہ حسن نظامی اور بے شمار نام ہیں جو اس وقت یاد نہیں آ رہے۔ خود سر عبدالقادر بہت عمدہ مضامین لکھتے تھے۔ ان کے رفیقِ کار شیخ محمد اکرام بار ایٹ لا رہے تھے۔ یہ بزرگ بھی علم و ادب کے رسیا تھے۔ اس صدی کے کئی مشہور ادیبوں کو سر عبدالقادر نے قلم پکڑنا سکھایا۔ اور کئی کو لکھنے کا شوق دلایا۔ علامہ اقبال کا تعارف "مخزن" کے ذریعے شیخ صاحب ہی نے کرایا اور آگے چل کر شیخ صاحب ہی نے "بانگِ درا" کی ترتیب و اشاعت پہ علامہ اقبال کو آمادہ کیا اور ایک نفیس مقدمہ "بانگِ درا" کا لکھا۔ ابو الاثر حفیظ جالندھری کو صفِ اوّل میں لانے میں بھی شیخ صاحب کی شفقت کو بہت دخل رہا ہے۔

شیخ صاحب ان اہلِ کمال میں سے تھے جو ع

ستارہ می شکنند، آفتاب می سازند

شیخ صاحب نے اپنی اعلیٰ قابلیت سے انگریزی حکومت میں اعلیٰ مراتب حاصل کئے اور قوم میں معزز و مفتخر ہوئے۔ وہ ایک نہایت شریف النفس انسان تھے۔ ان کی کبھی کسی سے نہیں بگڑی اور ان کے بارے میں کبھی کوئی بری بات نہیں سُنی۔ آخر دم تک خدمتِ خلق کرتے رہے۔ ع

ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد

ادارہ سماجی بہبود، معروف ادبی تنظیموں کے تعاون سے سر شیخ عبدالقادر مرحوم کی سترھویں برسی منا رہا ہے۔ یقیناً یہ ایک عوامی سود و بہبود کا کام ہے۔ امید ہے کہ اس ادارے کی یہ سعی مشکور ہوگی۔

## مولانا ماہر القادری، مدیر "فاران" کراچی

سر عبدالقادر ساعلی اللہ مقامہٗ اُردو زبان و ادب کی شاہراہ میں "سنگِ میل" کی طرح نمایاں ہیں۔ ان کی یاد سے اُردو کی تاریخ وابستہ ہے۔

## ڈاکٹر کریم الدین احمد ایم اے پی ایچ ڈی پرنسپل سرست کالج حیدرآباد

سر شیخ عبدالقادر ایک نام ہی نہیں، ایک تحریک بھی تھے۔ افسوس کہ ہمارے بزرگ طاقِ نسیاں کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ کوئی بھی قوم اپنے ماضی اور اپنے بزرگوں کے کارناموں پہ فخر کئے بغیر نہ زندہ قوم کہلا سکتی ہے اور نہ اس کا کوئی مستقبل ہو سکتا ہے۔ ادارہ سماجی بہبود کے اراکین مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے شیخ صاحب

کی برسی منانے کا فیصلہ کیا۔

شیخ صاحب کی شخصیت پہلو دار تھی۔ وہ بیک وقت ایک کامیاب وکیل ایک سماجی کارکن اور نامور ادیب تھے۔ ان کے ادبی کاموں کا ذکر کبھی نہ کبھی طرح ذکر کیا جاتا ہے لیکن ان کی زندگی کے باقی پہلو تاریکی میں ہیں۔

سر شیخ عبدالقادر ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنی شعلہ نوائی سے ہماری بزم کو روشن کیا۔ ایسے بزرگوں کو صرف سال بسال یاد کر لینا ہی کافی نہیں۔ بلکہ ان کے کام کے ایک ایک پہلو کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ جائزے کا مطلب صرف توصیف نہیں بلکہ احتساب بھی ہے۔ ہمیں سمجھنا چاہیئے کہ ہمارے بزرگ فرشتے نہیں، انسان تھے اور انسانی لغزشوں سے بری نہ تھے۔ اقبال کے ہمنوا ہی نہیں ہمراز بھی تھے۔ اسی لحاظ سے ہماری ذہنی اور ثقافتی تاریخ میں ان کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

سماجی بہبود کا ادارہ بہت اچھے کام کر رہا ہے، کام صرف برسی منانے پر نہ رکے تو اچھا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس دور کا مجموعی حیثیت سے علمی سطح پر جائزہ لیا جائے جس میں شیخ عبدالقادر بڑھے اور پروان چڑھے یہ ہماری ذہنی اور ثقافتی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔

یہ بھی کچھ کم نہیں کہ ہم اپنے بزرگوں کو کسی نہ کسی طرح یاد تو کر لیتے ہیں۔ اس طرح امید بندھتی ہے کہ مستقبل میں زیادہ سنجیدہ کام بھی کیا جا سکے گا۔

## صہبا لکھنوی مدیر "افکار" کراچی

یہ جان کر دلی خوشی ہوئی کہ آپ اردو کے عظیم محسن اور "مخزن" ایسے تاریخ ساز مجلہ کے نامور مدیر سر شیخ عبدالقادر مرحوم و مغفور کی ۱۷ ویں برسی منا رہے ہیں۔ پاکستان کی نئی نسل ـــ زبان و ادب، تہذیب و ثقافت اور تاریخ و تمدن کا صرف اس طرح تحفظ کر سکتی ہے کہ وہ اکابرین قوم کو نہ صرف یاد رکھے بلکہ ان کی زندہ رہنے والی یادگاریں بھی قائم کرے۔ ان محسنوں کے نام پر لائبریریاں، دار المطالعے تحقیقی ادارے وغیرہ اگر قائم کیئے جائیں تو میں سمجھتا ہوں کہ ہم برسی منانے کا حق ادا کر سکیں گے۔ ورنہ سال کے سال ایک صرف دن منا لینا۔ تقاریر کا انتظام کر لینا اور اخبارات میں خبریں چھپوا لینا کسی طرح تسلی بخش نہیں جس طرح کے روا جا کیا جا رہا ہے۔ میری اس صاف گوئی کو اظہار صداقت سمجھیں اور بس ـــ اکابرین ملک و قوم کے ساتھ ساتھ زندہ و باکمال شخصیتوں کے دن منانے کی روایت کو بھی آگے بڑھائیے۔

## محمد نصیر ہمایوں

میرے نزدیک سر عبدالقادر تاریخ کی ان عظیم شخصیتوں میں سے تھے جو صدیوں بعد پیدا ہوتی ہیں۔ وہ درد دل رکھنے والے مصلح، عظیم محب وطن، بہت بڑے ادیب، اخبار نویس اور قانون دان تھے۔ اگر میں یہ کہوں تو اس میں کسی قسم کا

مبالغہ نہ ہوگا کہ برصغیر میں بسنے والے مسلمانوں کو پستی سے ابھارنے کی کوششوں میں سر عبدالقادر مرحوم و مغفور کا بہت بڑا حصہ ہے۔ انھوں نے نام و نمود کی خواہش کے بغیر ایک خاموش سپاہی کی طرح قوم کی اصلاح کا فریضہ انجام دیا اور اپنی ان کوششوں میں کامیاب رہے۔

علامہ اقبال رح، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، ابوالاثر حفیظ جالندھری اور دوسرے بہت سے نامور شاعر اور ادیب اُن کے مفید مشوروں سے فیض یاب ہوئے اور اکثر مشکل مواقع پر اُن کی توجہ اور اعانت کا سہارا پاتے رہے۔ انھوں نے مخزن جیسا بلند پایہ رسالہ جاری کرکے اُردو ادب اور صحافت کو ایک درخشاں مستقبل کی طرف بڑھایا اور اہلِ وطن کے لئے فکر و عمل کی نئی راہیں تعمیر کیں۔

اللہ پاک نے اپنے خاص فضل سے مرحوم کو عمل کی ایسی قوت دی تھی کہ اس کی مثال شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔ اپنی زندگی میں وہ بہت سی اصلاحی، سیاسی اور ادبی انجمنوں کے صدر اور سرپرست رہے۔ انھوں نے اپنے گوہر بار قلم سے بے شمار بلند پایہ مقالات تحریر کئے۔ اَن گنت تقریریں کیں اور ان تمام مشاغل کے ساتھ ساتھ اپنے فرائض منصبی بھی اس حسن خوبی سے انجام دیتے رہے کہ نہ صرف اپنے بلکہ غیر بھی ان کے مداح ہیں۔ میرا خیال ہے یہ بات آپ حضرات کے علم میں ہوگی کہ انھوں نے مختلف سیاسی وفود کے ممبر کی حیثیت سے بیرونی ممالک کے کئی سفر کئے۔ لیگ آف نیشنز کے جلسوں میں شرکت کی۔ وزیر ہند مقیم لندن کی کونسل کے ممبر رہے، وائسرائے ہند کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر بنائے گئے، جج ہائی کورٹ کے عہدے پر فائز رہے اور اس زمانے کے بہت سے اونچے عہدوں پر کام کیا اور ہر بلندی اور ہر عروج پر اپنی غریب قوم کو یاد رکھا اور اس کی بہتری کے لئے کوشاں رہے، بلکہ یہ کہنا بھی درست ہوگا کہ اُن کی یہ مساعی مسلمانوں کے علاوہ دیگر اقوام کے لئے بھی تھیں۔

میں اس بات پر پورا پورا یقین رکھتا ہوں کہ سر عبدالقادر مرحوم کی زندگی ہمارے نوجوانوں کے لئے ایک اعلیٰ نمونہ ہے، یقیناً وہ نوجوان خوش قسمت ہوں گے جو اُن کے نقشِ قدم پر چلیں گے۔ اسلام سے محبت، مسلمانوں کی بہتری کے لئے انتھک محنت، اپنے فرائض کو پوری توجہ سے انجام دینے کی لگن اور بنی نوع انسان کی سچی خیر خواہی اُن کی سیرت کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ وہ اخلاق عالیہ کے پیکر تھے۔

9 فروری 1950ء کو اپنی مثالی زندگی کا سفر پورا کرکے علم و عمل کا یہ آفتاب غروب ہوگیا۔ پورے ملک بلکہ پوری دنیا میں اس کا سوگ منایا گیا۔ مشاہیر نے شاندار الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ آج بھی ان کے لئے دلوں میں سچی عقیدت اور محبت موجود ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس احترام اور محبت میں کبھی کمی واقع نہ ہوگی۔

اس موقع پر مجھے دو نہایت عمدہ اشعار کا ذکر کرنا ہے۔ 1924ء میں جب وہ لندن سے واپس ہو رہے تھے تو اہلِ وطن نے انہیں ایک پارٹی دی جس میں ڈاکٹر تاثیر نے یہ شعر پڑھا ؎

وطن کو سب وطن ماں باپ کی نسبت کہتے ہیں تو گویا تم وطن کو جا رہے ہو یہ وطن ہو کر

بعد وہ جب اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے تو ایک جانب سے آواز آئی ؎

جو شمع بجھ گئی جہاں　　　وہ خلد میں ہے ضو فشاں

## چراغ محفل ادب

چراغ محفل ادب

اپنی ان گذارشات کو مرحوم کے ایک خطبۂ صدارت کے مختصر اقتباس پر ختم کرتا ہوں۔ یہ خطبہ انھوں نے جامعہ ملیہ دہلی کی جوبلی ۱۹۴۶ء میں دیا تھا آپ نے ارشاد فرمایا:

"میں خود اپنی عمر کے ستر سے زیادہ برس بسر کرنے کے باوجود ابھی محتاج نصیحت ہوں۔ تو میں نوجوانوں کو کیا نصیحت دوں! جوانی کا گویا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ ہر چیز کو آزمانے اور غلطیاں کرنے کے بعد تجربہ کے راستہ سے صحیح نظریے قائم کرنا چاہتی ہے اور دوسروں کے تجربوں پر انحصار کرنا نہیں چاہتی۔ میں چند ایسے اصولی امور کی طرف توجہ دلاتا ہوں جن کو آپ دلیل راہ کے طور پر استعمال کرسکتے ہیں۔

(۱) پہلا اصول جو زندگی میں داخل ہوتے ہی اختیار کرنا چاہیے وہ روا داری ہے۔ یعنی کسی دوسرے شخص یا کسی دوسری جماعت کی رائے یا عقیدے کو صرف اس بنا پر غلط یا ناقابل قبول نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ آپ کی رائے یا عقیدے سے مختلف ہے۔ بلکہ ہر رائے کے سننے اور اس پر غور کرنے کے بعد اس کے موافق اور مخالف دلائل سن کر فیصلہ کرنا چاہیے۔ اس عادت کی کمی اور عدم رواداری ہمارے ملک میں طرح طرح کی تکالیف کا باعث ہے۔ اور بہت سے جھگڑے اور فساد رواداری نہ ہونے سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان پڑھ لوگ اور کم پڑھے ہوئے زیادہ تر تنگ خیال ہوتے ہیں اور اختلاف رائے کو برداشت نہیں کرسکتے اور لڑنے مرنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ اس لئے جو اصحاب اعلیٰ تعلیم سے مستفید ہوچکے ہیں انہیں روشن خیالی سیکھنی چاہیے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی اپنی رائے نہ ہو، یا ہوا کا ہر جھونکا ان کی رائے کو بدلتا رہے۔ اگر دوسروں کی رائے سننے کے بعد وہ اپنی یا اپنی جماعت کی رائے کو قابل ترجیح سمجھیں تو اس پر ضرور قائم رہیں۔ اور دوسروں کو دلائل کے ذریعے قائل کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن یہ نامناسب ہے کہ اختلاف رائے کی وجہ سے دوسروں کو بدظنی کی نگاہ سے دیکھیں۔ یا ان کی نیتوں پر حملے کریں۔ یا ان سے میل جول منقطع کردیں۔

دوسروں پر بدظنی بڑھتے بڑھتے باہمی نفرت کی صورت اختیار کرلیتی ہے اور کسی ملک کے باشندوں کے لئے باہمی مخاصمت یا نفرت سے زیادہ کوئی بیماری نہیں ہوسکتی۔

(۲) انگریزوں نے ڈیڑھ دو سو برس ہمارے ملک میں اتنی دور سے آکر حکومت کی ہے، ان کی کامیابی کا ایک راز یہی تھا کہ وہ محنت وصنعت اور تجارت کو باعزت کام سمجھتے تھے۔ جس شخص نے دخانی انجن ایجاد کرکے قوموں کی قسمت اور نظام کا دفعتاً پانسا پلٹا دیا وہ صناع ہی تھا۔ ان کے ملک میں بہت سے گھرانوں کے نام ان کے پیشوں سے متعلق ہیں۔ سمتھ بہت مشہور نام ہے۔ اس کے معنی لوہار کے ہیں۔ مختلف پیشوں کے لوگوں نے انگلستان میں اور دیگر حصص یورپ میں اپنے گلڈ یعنی انجمنیں قائم کیں۔ ان انجمنوں نے اپنی برادری کی مجالس شوریٰ کے

کے لئے بڑے بڑے عالیشان ایوان قائم کئے ہیں جو ہیں سے بہت سے اب تک موجود ہیں۔ اور ان کے جلسوں میں جب اس ہنر کے پیشہ ور شامل ہوتے ہیں تو ایک دوسرے کا اعزاز اسی طرح کرتے ہیں جیسے سیاسی پارلیمنٹ کے رکن کرتے ہیں۔ ہر رکن دوسرے کو آنریبل کہہ کر خطاب کرتا ہے اور قابل عزت سمجھتا ہے۔ ان میں سے بعض انجمنیں زمانہ بھر کی دولت جمع کر کے ایسی مالا مال ہو گئی ہیں کہ ان کے ہاں دعوتوں کے موقع پر چاندی سونے کے برتنوں کا مجموعہ دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہوتی ہیں۔ ہر مزدور اور معمار اور ترکھان کا یہ حال ہے کہ وہ جب کسی کے ہاں مزدوری کرنے آتا ہے تو گھر والوں سے تن کر بات کرتا ہے اور ذراسی اونچی آواز یا جھڑکی برداشت نہیں کرتا۔ گویا وہ مساوات کی بنیاد پر کام کرتا ہے اور اپنے آپ کو کسی سے کم نہیں سمجھتا۔ صرف اس لئے کہ دوسرے کا کام اچھے کپڑے پہن کر کرنے کا ہے اور اس کے کپڑے اس وقت میلے ہیں۔ یہی میلان میں نے اپنے سفر استانبول کے زمانے میں ترکوں میں پایا۔ ان کے ہاں لفظ آفندی معزز لوگوں کے لئے مخصوص ہے۔ میں نے دیکھا کہ دکاندار کو اس کی دکان کا گاہک آفندم کہہ کر مخاطب کرتا ہے اور وہ گاہک کو آفندم کہہ کر جواب دیتا ہے۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ دوکانداروں اور اہل صنعت میں سے بیشتر لوگ اس لئے بھی آفندم کہہ کر بلائے جاتے ہیں کہ وہ کچھ عرصہ فوجی تربیت پاچکے ہوتے ہیں۔ اور وہ ایسے سپاہی ہوتے ہیں کہ جب ضرورت ہو وہ فوجی خدمت میں حصہ لے سکیں۔ استانبول میں مسلمانوں کی بہت سی دوکانوں پر چوکھٹوں میں لگے ہوئے قطعات آویزاں تھے جن پر الکسب حبیب اللہ لکھا ہوتا تھا۔ یعنی کسب حلال کرنے والا خدا کا دوست ہے۔ اس وقت دنیا کی بڑی سے بڑی دول کی بڑائی ان کی مصنوعات کی بڑائی پر موقوف ہے۔ اور ان کی دولت کا راز ان کی تجارت ہے۔ اپنی مصنوعات باہر بھیجتے ہیں اور دوسرے ممالک سے کھانے پینے کی چیزیں اور کچا مال اپنے ہاں منگواتے ہیں۔"

(۴) ایک وقت میں مسلمان علوم فلسفہ اور سائنس کی مشعل لے کر گھر سے نکلے تھے اور انھوں نے اس وقت یورپ کی جہالت اور تاریکی کو علم کی روشنی سے منور کر دیا تھا۔ پھر زمانہ بدلا اور شاگرد عالم فاضل بن گئے اور استادوں کی اولاد جاہل بن گئی۔ اب زمانے نے پھر کروٹ لی ہے اور آپ لوگوں میں جو طلبہ سائنس پڑھ رہے ہیں انہیں اس کی قدر و قیمت کا کافی احساس ہو گیا ہے۔ اب ان کا کام ہے جستجو اور تلاش کی لالٹین لے کر اس مضمون کی گہرائیوں تک پہنچیں اور اس میں نئی نئی دریافتیں اور ایجادیں کریں۔ بعض لوگ ان تباہیوں کے نظارے دیکھ کر جو سائنس کی بعض ایجادات کی بدولت گزشتہ ہولناک جنگ کے دوران میں دیکھے گئے ہیں کہتے ہیں کہ اس سے تو بہتر تھا کہ سائنس اتنی ترقی نہ کرتی اور دنیا اس ہولناک خونریزی سے بچی رہتی جس سے لاکھوں جوان ہلاک ہوئے اور ان سے زیادہ زخمی۔ اور بوڑھے اور بچے اور بیمار بھی آسمان سے برسنے والے گولوں کی زد سے نہ بچ سکے۔

یہ سچ ہے کہ ایسے برے نتائج پہلی نظر میں انسان کو سائنس سے بیزار کر دیتے ہیں۔ مگر اس سے نفس علم میں کوئی برائی پیدا نہیں ہوتی۔ علم کے صحیح اور غلط استعمال میں بہت فرق ہے۔ یہ برے نتائج اس کے غلط استعمال کے ہیں ورنہ وہی علم بہتر نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ ہوائی جہاز اڑنے لگے تو آپ مہینوں کی مسافت دنوں میں اور دنوں کی مسافت

گھڑیوں میں طے کر لیتے ہیں۔ زمین کی طنابیں کھینچ لی گئی ہیں اور نئی دنیا اور پرانی زمانے کی پاتال اب آپ کے لئے دوسرے ملک نہیں دوسرے محلے بن گئے ہیں۔ اسی طرح یہ "ایٹم بم" جس سے آج کل ساری مہذب دنیا گھبرائی ہوئی ہے اور یہ خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ جیسے جاپان کے دو شہروں کو، دو بموں نے خاک کا ڈھیر بنا دیا اور "کا تنت الجبال کالعھن المنفوش" کا عینی مشاہدہ کرادیا، اگر اسی طرح کے دو چار اور بم کسی دوسری جنگ میں پھینکے گئے تو دنیا اور اس کے تمدن اور تہذیب کا خاتمہ ہو جائے گا۔ مگر یہ یاد رکھیے کہ ایٹم بم کو محض نگاہ خوف سے نہیں دیکھنا چاہیے۔ بالکل ممکن ہے کہ کوئی قوم اپنا رعب دوسروں پر جمانے کے لئے یا اپنا عقدہ جلد حل کرنے کے لئے اس قوت کا بے جا استعمال کرے۔ لیکن اس کے ساتھ اس کے دل میں یہ ڈر بھی رہے گا کہ اگر کسی دوسری قوم نے بھی اس کا راز پا لیا ہے اور اس کے بنانے کی ترکیب سمجھ لی ہے اور وہ جواب میں بم پھینکے گی تو کیا حشر ہوگا! اور اس ڈر کی وجہ سے وہ بم پھینکنے سے رکی رہے گی۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت رد و کد کے بعد اقوام عالم اس شرط کو قبول کرنے پر مجبور ہوں گی کہ "ایٹم بم" سے جنگ میں ایک قوم دوسری قوم کو ہلاک کرنے کا کام نہ لے بلکہ اس میں جو امکانات انسان کے نفع کے لئے استعمال ہونے کے ہیں ان سے کام لے کر تہذیب کے لئے آسانیاں پیدا کرے۔ اس لحاظ سے شاید وہ دن دور نہیں جب "ایٹم بم" کا مہیب دیو انسان ضعیف کی عقلمندی اور سائنس دانی کی بدولت اس کے سامنے جکڑا ہوا لایا جائے اور ہاتھ باندھ کر اس کی خدمت کا وعدہ کرے اور جس طرح بجلی سی زبردست قوت انسان کی زر خرید لونڈی بنی ہوئی ہے اور اس کے لئے چکی پیستی ہے اور اسے گرمی میں پنکھا کرتی ہے اور شب تار میں روشنی دیتی ہے اسی طرح میاں "ایٹم بم" انسان کا خادم بن جائے۔ عزیزو! آپ خوش قسمتی سے ایک ایسے عہد میں پیدا ہوئے ہیں جس میں انسان کی قوت کے امکانات بہت وسیع ہو گئے ہیں، بہت سے پوشیدہ حقائق آپ کے گرد و پیش میں موجود ہیں اور ان کے خزانوں کی کلید سائنس کے ہاتھ میں ہے اور سائنس کی کتابیں اور تجربے آپ کے سامنے ہیں۔ قفل کھولیے اور خزانوں سے دنیا کو مالا مال کر دیجیے۔"

اس اقتباس سے پوری طرح اندازہ ہو جاتا ہے کہ مرحوم کس قدر روشن دماغ، بالغ نظر اور علم دوست تھے۔

## سید ظفر حسین (تمغہ امتیاز، تمغہ قائد اعظم) ریجنل ڈائرکٹر ریڈیو پاکستان کراچی

اگر مجھ سے اردو زبان کے محسنین کی ایک فہرست مرتب کرنے کو کہا جائے تو میں سر عبد القادر کا نام اس فہرست میں بڑی نمایاں جگہ پر شامل کر دوں گا۔

سر شیخ عبد القادر اس صدی کی ان عظیم شخصیتوں میں سے ہیں جو صحیح معنوں میں اردو ادب اور صحافت کے جدید دور کے بانی کہے جا سکتے ہیں۔ انہوں نے اردو ادب اور صحافت کے کارواں کی رہبری بھی کی اور اپنی ساری زندگی اس کی خدمت کے لیے وقف کر دی۔

جہاں تک میرے مطالعے کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ سر عبد القادر نے اپنی عملی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا۔ ۱۹۰۱ء میں انہوں نے ایک اردو ماہنامہ "مخزن" شائع کیا۔ اس رسالے کے لئے آپ نے اس وقت کے چوٹی کے لکھنے والوں کی خدمات

[illegible]سا۔ مخزن میں شائع ہونے والا مضمون، افسانہ یا شعری ادب معیار قرار پاتا تھا۔ اور بہت جلد ہی سارے ملک میں اس رسالے نے غیر معمولی شہرت حاصل کر لی۔ اس رسالے کے اکثر مضامین درسی کتابوں میں شامل ہونے لگے۔ مخزن نے جہاں اردو صحافت کو ایک بلند معیار دیا وہیں اس کے ادبی اور تنقیدی مضامین نے اردو زبان اور ادب کے رجحان اور مزاج کی ترتیب میں بھی بڑا حصہ لیا۔

شیخ صاحب کا دوسرا کارنامہ علامہ اقبال کے پہلے اردو مجموعہ کلام بانگ درا کا مقدمہ ہے جسے اردو زبان میں جدید طرز تنقید کا بہترین نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ انگلستان میں علامہ اقبال اور سر شیخ عبدالقادر ساتھ ساتھ بیرسٹری کی تکمیل کر رہے تھے۔ علامہ اقبال نے اس زمانے میں طے کر لیا تھا کہ وہ شاعری ترک کر دیں گے مگر شیخ صاحب نے بڑے بڑے جتن کئے اور علامہ کو اس ارادے سے باز رکھا۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ فکر اقبال سے ملت اسلامیہ کو جو فیض پہنچا اس کے لئے شیخ عبدالقادر بھی بالواسطہ ساری قوم کے شکریے کے حق دار ہیں۔

شیخ صاحب نے بڑی مصروف اور کامیاب زندگی گزاری۔ بڑی بڑی قومی اور سرکاری خدمات انجام دیں۔ پنجاب ہائی کورٹ کے جج۔ پنجاب اسمبلی کے ممبر اور پنجاب کے وزیر تعلیم رہے۔ حکومت ہند کی طرف سے بھی مجلس اقوام کے اجلاس میں شرکت کی۔ مگر ان تمام مصروفیات کے باوجود ادبی کاموں سے کبھی غافل نہ ہوئے۔ قومی اور سرکاری مصروفیات کی وجہ سے جب آپ مخزن کی ادارت کے لئے وقت نہ نکال سکے تو اس کی ایڈیٹری ترک کر دی مگر اس سے اپنا واسطہ اور ربط برابر قائم رکھا۔

شیخ صاحب کی تحریر بڑی ہی سادہ اور دلنشین ہوتی ہے۔ پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کے بیان میں بھی کہیں گنجلک نہیں پیدا ہوتی۔ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں لکھنے کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین پڑھیئے یا سفرنامہ یا خالص علمی مضامین ہر جگہ ان کی انفرادیت اور زبان و بیان پہ قدرت نمایاں نظر آتی ہے۔

نصف صدی تک علم و ادب کی خدمت انجام دے کر ہماری زبان و ادب اور صحافت پر شیخ عبدالقادر نے ایسے گہرے نقوش چھوڑے ہیں جو کبھی نہ مٹ سکیں گے۔

محمد سبطین شاہجہانی

# مردِ بے مثال

کمُلا گئے تھے پھول خزاؤں کی دھوپ میں
صبحِ وطن تھی شامِ غریباں کے روپ میں
گل خانۂ خیال میں خاروں کا تھا وقار
مُرجھا چکے تھے نخلِ تمنا کے برگ و بار
آزادیٔ نگارِ وطن بے جمال تھی
گلہائے آرزو کی ہنسی پائمال تھی
اُٹھا سیالکوٹ سے اک مردِ بے مثال
ہم کو دیئے ہیں اس نے وہ افکارِ لازوال
جن سے خزاں بہار کے سانچے میں ڈھل گئی
تلخابۂ حیات کی ہیئت بدل گئی
دل کی فضا میں چاند ستارے چمک اُٹھے
تابانیٔ جمال سے ذرّے دمک اُٹھے
آسودۂ مراد ہوا مقصدِ حیات
سازِ طرب سے جھوم اُٹھی ساری کائنات
تعبیر ہے یہ ارضِ وطن اس کے خواب کی
مہکا ہوا ہے اس سے گلستانِ آگہی